معاصرین

اقبال کی نظر میں

محمد عبداللہ قریشی

نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات ولادت علامہ محمد اقبال

مجلس ترقی ادب لاہور

معاصرین
اقبال کی نظر میں

از

محمد عبداللہ قریشی

نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات ولادت علامہ محمد اقبال

مجلسِ ترقیِ ادب ۔ لاہور

طبع اول : نومبر ۱۹۷۷ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
ناظمِ مجلسِ ترقیِ ادب ، لاہور

طابع : محمد زرین خاں

مطبع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ ریلوے روڈ ، لاہور

قیمت : ۳۵ روپے



علامہ اقبالؒ

(۱۸۷۷ء — ۱۹۳۸ء)

پروفیسر محمد علم الدین سالک

کے نام

جن کی رفاقت سے محروم ہو کر رہِ منزل

میں تنہا رہ گیا ہوں

ترتیب

☆ ☆ ☆

مقدمہ

اقبال ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ عالمِ انسانی کے مہرِ جہاں تاب، موجودہ دنیا کے عظیم مفکّر اور الہام نوا شاعر تھے۔ وہ آن مسیحا نفسوں میں تھے جن کے دم سے زندگی کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں۔ ان کے حیات افروز پیغام نے دلوں کو گرمایا، روحوں کو تڑپایا، احساسِ کمتری کو مٹایا، حوصلوں میں ابھار پیدا کیا، خودی اور خودداری کے جذبے کو استحکام بخشا اور دماغوں میں رفعت و بلندی پیدا کی، یہاں تک کہ قوم کی سوئی ہوئی قسمت جاگ اٹھی اور وہ جوشِ عمل سے سرشار ہو کر باوقار زندگی کی سرحد پر جا کھڑی ہوئی۔ اقبال فرماتے ہیں:

"شاعری میں لٹریچر بہ حیثیتِ لٹریچر کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدِ نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں، ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آیندہ نسلیں مجھے شاعر تصور ہی نہ کریں، اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجے

کی جاں کاہی چاہتا ہے ۔"[1]

ٹالسٹائی کا نظریۂ فن صحیح طور پر سمجھنے اور مدون کرنے والے بیلنسکی نے ایسے فن کاروں کو بھی بڑا فن کار قرار دیا ہے جو زیادہ سے زیادہ افراد کو متاثر کریں ۔ اس معیار کو سامنے رکھا جائے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ علامہ اقبال کو دنیا کے عظیم شعرا میں بلند مقام پر فائز نہ کیا جائے ۔ انھوں نے نہ صرف اپنے عہد اور اپنے فوراً بعد آنے والے عہد کو متاثر کیا بلکہ ہماری گزشتہ تین نسلیں اقبال کے نقشِ قدم پر چلتی نظر آتی ہیں ۔ حق یہ ہے کہ جنوبی ایشیا اور شرقِ اوسط کے فن کار عہدِ اقبال ہی میں سانس لے رہے ہیں ۔

"مرقعِ چغتائی" کے دیباچے میں اقبال نے اپنے آرٹ کے تصور کو ذرا تفصیل کے ساتھ یوں بیان کیا ہے :

"کسی قوم کی روحانی صحت کا دارومدار اس کے شعرا اور آرٹسٹوں کی الہامی صلاحیت پر ہوتا ہے ۔ لیکن یہ ایسی چیز نہیں جس پر کسی کو قابو حاصل ہو ۔ یہ ایک عطیہ ہے جس کی خاصیت اور تاثیر کے متعلق اس کا پانے والا اس وقت تک تنقیدی نظر نہیں ڈال سکتا جب تک وہ اسے حاصل نہ کر چکا ہو ، اس لیے وہ شخص جو اس عطیے سے فیض یاب ہوا ہو اور خود اس عطیے کی حیات بخش تاثیر انسانیت کے لیے اہمیت رکھتے ہیں ۔ کسی زوال پذیر آرٹسٹ کی تخلیقی تحریک ، اگر اس میں یہ صلاحیت ہے کہ

۱۔ اقبال نامہ ، جلد اول ، ص ۱۰۹ ۔

وہ اپنے نغمے یا تصویر سے لوگوں کے دل لبھا سکے، قوم کے لیے بہ نسبت اٹیلا یا چنگیز خاں کے لشکروں کے زیادہ تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اِمراء القیس کے متعلق، جو قبلِ اسلام کا سب سے بڑا عرب شاعر گزرا ہے، فرمایا تھا 'اشعرالشعراء و قائدھم الی النار' (یعنی وہ شاعروں کا سردار ہے لیکن جہنم کی راہ میں وہی ان کا رہبر ہوگا)۔

مرئی کو اس کا موقع دینا کہ غیرمرئی کی تشکیل کرے اور فطرت کے ساتھ ایسا تعلق قائم کرنا جسے سائنس کی زبان میں مطابقت یا توافق کہتے ہیں، درحقیقت یہ تسلیم کرنے کے مترادف ہے کہ فطرت نے انسانی روح پر غلبہ پالیا۔ انسانی قوت کا راز یہ ہے کہ فطرت کے مہیّجات کے خلاف مقاومت اختیار کی جائے، نہ کہ ان کے عمل کے سامنے اپنے تئیں رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ جو کچھ موجود ہے اس کی مقاومت اس واسطے کرنی چاہیے کہ جو موجود نہیں اس کی تخلیق ہو۔ ایسا کرنا صحت و زندگی سے عبارت ہے۔ اس کے ماسوا جو کچھ ہو وہ زوال اور موت کی طرف لے جانے والا ہے۔ خدا اور انسان دونوں دوامی تخلیق سے قائم و زندہ ہیں:

حسن را از خود بروں جستن خطاست
آں چہ می بایست پیشِ ما کجاست

جو آرٹسٹ زندگی کا مقابلہ کرتا ہے وہ انسانیت کے لیے باعثِ برکت ہے ۔ وہ تخلیق میں خدا کا ہمسر ہے اور اس کی روح میں زمانے اور ابدیت کا پرتو منعکس ہوتا ہے . . . عہدِ جدید کا آرٹسٹ فطرت سے اکتسابِ فیض کرتا ہے حالانکہ فطرت تو بس ''ہے'' اور اس کا کام یہ ہے کہ ہماری اس جستجو میں روڑے اٹکائے جو ہم اس کے لیے کرتے ہیں جو ''ہونا چاہیے'' اور جسے آرٹسٹ اپنے وجود کی گہرائیوں میں پا سکتا ہے ۔''

۱۹۶۷ء کی بات ہے کہ اقبال کونسل کراچی کے زیرِ اہتمام ''یومِ اقبال'' بڑے وسیع پیمانے پر منایا گیا ، جس میں پاکستان اور بیرونی ممالک کے اربابِ دانش نے اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا ۔ اس کونسل کے سیکرٹری میاں یعقوب توفیق تھے جو اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں ۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ بہشت نصیب کرے اور ان کی روح کو اعلیٰ علیّین میں جگہ دے ۔

اس کونسل نے مجھے بھی تقریبات میں شرکت کی دعوت دی ۔ میں ''تصویرِ جاناں در بغل'' حاضر ہوا ۔ میرا مقالہ ، جس کا عنوان ''معاصر شعرا اقبال کی نظر میں'' تھا ، اس سال کی مطبوعہ روئداد میں موجود ہے ۔ اس مضمون میں ایک ایسا پہلو پیش کیا گیا تھا جس پر اس سے پیشتر کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا ۔ یہ اگرچہ بے حد مختصر تھا لیکن اپنے موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے اتنا پسند کیا گیا کہ ہر طرف سے مجھے اس کو پھیلا کر لکھنے کی فرمائش کی گئی ۔

میں نے اسی دن سے ان شعرا کا کھوج لگانا شروع کر دیا جن کے متعلق اقبال نے کہیں نہ کہیں ایک آدھ سطر لکھ دی تھی ۔

اقبال کی نظم و نثر میں اپنے عہد کی اہم شخصیتوں ـــــ امیر مینائی ، میرزا داغ دہلوی ، مولوی محمد حسین آزاد ، مولانا شبلی نعمانی ، خواجہ الطاف حسین حالی ، عزیزلکھنوی ، نسیم بھرت پوری ، تشنہ بلند شہری ، اکبر الہ آبادی ، شاد عظیم آبادی ، مہاراجہ کشن پرشاد شاد ، مولانا گرامی ، نادر کاکوروی ، میر غلام بھیک نیرنگ ، ہمایوں اور منشی محمد الدین فوق ـــــ کا ذکر جس خلوص اور محبت سے ترشے ہوئے اشعار ، مصرعوں اور فقروں میں ملتا ہے ، وہ اردو شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ ہے ۔ بقول رشید احمد صدیقی مرحوم :

''یہ آواز ، انداز اور امتیاز اردو شاعروں کے کلام میں کم نظر آئے گا ، جن کے یہاں بھرتی کے اشعار ہی نہیں ، بھرتی کی غزلیں تک مل جاتی ہیں ۔''[1]

اقبال کے نزدیک امیر مینائی : ''صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ان کا درجہ شاعری سے بہت بڑھا ہوا تھا ۔ ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد اور ایک خاص قسم کی لے پائی جاتی ہے جو صاحب دلوں کو بے چین کر دیتی ہے اور وہ کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے ہیں ۔''

میرزا داغ سے تو شاعری میں انھیں تلمّذ حاصل تھا ۔ ابتدائی مشق کے زمانے میں اقبال انھی کے رنگ میں شعر کہتے تھے ۔ بعد میں یہ رنگ بدل گیا لیکن داغ کی شاگردی پر اقبال ہمیشہ فخر کرتے رہے ۔

اکبر الہ آبادی کے اقبال بے حد مداح تھے ۔ ان کو وہ اپنا پیر و مرشد تسلیم کرتے تھے ۔ ان کے تتّبع میں اقبال نے طبع آزمائی کر کے کئی طنزیہ اور مذاحیہ اشعار کہے جو ''اکبری اقبال'' کے نام

۱۔ مقدمۂ نقوش اقبال ، مصنفہ سید ابوالحسن علی ندوی ۔

سے مشہور ہیں۔

مولانا گرامی کو وہ اپنا آدمی بھیج کر اکثر بلا لیتے تھے اور کئی کئی دن اپنے ہاں مہمان رکھتے تھے۔ ان سے شب و روز علمی گفتگو ہوتی اور اشعار کی باریکیوں پر بحث کی جاتی ۔ انھی پُرلطف صحبتوں کو یاد کر کے اقبال کہتے تھے :[1]

یاد ایّامی کہ با او گفتگو ھا داشتم
اے خوشا حرفی کہ گوید آشنا باآشنای

یہی حال منشی محمد الدین فوق کا تھا ، جن کی خدماتِ کشمیر سے خوش ہو کر اقبال انھیں ''مجدّدِ کشامرہ'' کہا کرتے تھے اور اس محبت سے بلاتے تھے :

بصحنِ گلشنِ ما صورتِ بہار بیا
کشادہ دیدۂ گل بہرِ انتظار بیا

سرسید ، داغ ، حالی ، شبلی ، اکبر ، ہمایوں ، جوہر ، گرامی ، سید راس مسعود اور دیگر دوستوں کے سانحہ ہائے ارتحال پر اقبال نے نہایت دل گداز مرثیے لکھے ۔ بعضوں کے مرنے پر قطعاتِ تاریخ کہہ کر ان کا نام زندہ کیا ۔ کئی مہربانوں کے نام ان کے خطوط موجود ہیں جن سے خوشگوار تعلقات کا پتا چلتا ہے ۔ اس طرح جھولیاں ٹٹول ٹٹول کر تھوڑا بہت مواد جمع ہوا اور کتاب کا ڈول ڈالا گیا :

یوں لائے واں سے ہم دلِ صد پارہ ڈھونڈ کر
دیکھا جہاں بڑا کوئی ٹکڑا ، اٹھا لیا

میں نے اقبال کی آرا کو بنیاد بنا کر ایک ایک شاعر پر الگ

۱- باقیاتِ اقبال ، ص ۲۵۶ -

الگ مضمون لکھا ۔ پھر ان تمام مضامین کو ایک ساتھ پڑھنے پر مجھے احساسِ مسرت ہوا کہ میں نے تو اقبال کا نظریۂ فن مرتّب کر ڈالا ہے جو بہت واضح نظریات کا ابلاغ کرتا ہے اور تنقیدی شعور اور مذاقِ سلیم کا حامل نظر آتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ یہ کتاب جہاں تاریخی اور تحقیقی مواد پر مبنی ہوگی وہیں یہ ایک عظیم فن کار کے نظریۂ فن پر بھی پہلی مرتّب دستاویز کا درجہ حاصل کرے گی اور مستقبل کے نقاد اس کتاب کے حوالے کے بغیر اقبال کے نظریۂ فن پر بحث نہ کر پائیں گے ۔

ـــــ لیکن جب اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری اقبال کے یومِ ولادت کی صد سالہ تقریبات منانے والی مرکزی نیشنل کمیٹی نے قبول کی تو اس نے میرے محدود موضوع کو وسعت دے کر کتاب کا نام : ''معاصرین اقبال کی نظر میں'' تجویز کر دیا ۔ اراکین کی سوچ کا محور یہ تھا کہ جب اقبال کے بارے میں ان کے معاصرین کی آرا جمع کی جا سکتی ہیں تو پھر معاصرین کے بارے میں خود اقبال کی آرا کیوں نہ مرتّب کی جائیں ۔ خیال بہت اچھا تھا اور اس طرح کئی غیر شاعر شخصیتیں بھی قعرِ گمنامی سے نکل کر روشنی کا منہ دیکھ سکتی تھیں ۔ مگر بظاہر یہ کام جتنا سادہ اور آسان نظر آتا ہے ، عملاً میرے لیے قدم قدم پر مشکلات کے سوا کچھ نہ لایا ، کیونکہ ایسا مواد بڑی مشکل سے ہاتھ آتا ہے ۔ مگر میں نے ہمت نہیں ہاری ۔ چند نام اس میں اور شامل کر دیے ، یہاں تک کہ مجھے کوتاہیِ داماں کا شکوہ ہونے لگا ۔

اب صورت یہ ہے کہ اس کتاب کا معتدبہ حصہ تو ان ہم عصر شعرا ہی پر مشتمل ہے جن کے بارے میں اقبال نے اپنی رائے کا

اظہار کیا ہے ۔ چند وہ بزرگ بھی شامل ہیں جن کا اقبال احترام کرتے تھے اور جن سے انھوں نے کچھ نہ کچھ حاصل کیا ۔ اقبال کے ہم سن بھی ہیں جنھیں وہ اپنا "ہم صفیر" کہتے ہیں اور وہ بھی ہیں جن کی اقبال حوصلہ افزائی کرتے تھے اور جو اقبال کی شاعری سے متاثر ہو کر ان سے شرفِ تلمّذ حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ اقبال کسی کو شاگرد بنانے کے روادار نہ تھے ۔ وہ شاعری میں استادی شاگردی کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے ۔ صحیح مشورہ دینے میں تو وہ کبھی بخل سے کام نہ لیتے تھے البتہ دوسروں کے کلام کی نوک پلک سنوارنے کو وہ تضییعِ اوقات سمجھتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ :

"ہر شخص کو طبیعت آسمان سے ملتی ہے اور زبان زمین سے ۔ شاعری ایک بے پیرا فن ہے ۔ اگر طبیعت شعر گوئی کے لیے موزوں ہو تو وہ خود بخود شعر کہنے پر مجبور ہو جائے گی ۔"[۱]

"لکھنے والا (شاعر) الفاظ کے انتخاب میں اپنی حسِ موسیقیت سے کام لیتا ہے اور مضامین کے انتخاب میں اپنے فطری جذبات کی پیروی پر مجبور ہوتا ہے ۔ اس امر میں کسی دوسرے کے مشورے پر ، خواہ وہ کیسا ہی نیک مشورہ کیوں نہ ہو ، عمل نہیں کیا جا سکتا ۔"[۲]

"شاعری خداداد چیز ہے ۔ اگر شعر گوئی کا جذبہ سچا ہے تو مشقِ سخن کیے جائیے اور اساتذہ کا کلام بغور

۱۔ اقبال نامہ ، مرتبہ چراغ حسن حسرت ، ص ۳۳ ۔
۲۔ اوراقِ گم گشتہ ، مرتبہ رحیم بخش شاہین ، ص ۱۱۹ ۔

پڑھیے تاکہ کان بحروں سے مانوس ہو جائیں اور زبان میں کوئی سقم باقی نہ رہے۔''[1]

''شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں۔ جذبات انسانی اور کیفیات قلبی اللہ کی دین ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ طبع موزوں اس کے ادا کرنے کے لیے پُر اثر الفاظ تلاش کرے۔''[2]

''شعر کا منبع و ماخذ شاعر کا دماغ نہیں، اس کی روح ہے، اگرچہ تخیّل کی بے پایاں وسعتوں سے شاعر کو محفوظ رکھنے کے لیے دماغ کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔''[3]

''زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے۔ ہاں تراکیب وضع کرنے میں مذاق سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔''[4]

''اس جگرکاوی کا اندازہ عام لوگ نہیں لگا سکتے۔ ان کے سامنے شعر بنا بنایا آتا ہے۔ وہ اس روحانی اور لطیف کرب سے آشنا نہیں ہو سکتے جس نے الفاظ کی ترتیب پیدا کی ہے۔ جہاں اچھا شعر دیکھو، سمجھ لو کہ کوئی نہ

۱۔ مقدمہ گلبانگ حیات، امین حزیں سیالکوٹی۔
۲۔ اقبال نامہ، جلد اوّل، ص ۲۸۰۔
۳۔ ایضاً، جلد ۲، ص ۱۵۵۔
۴۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۵۶۔

کوئی مسیح مصلوب ہوا ہے - اچھے شعر کا پیدا کرنا
اوروں کے لیے کفّارہ ہونا ہے -[1]''

''شاعری محض محاورات اور اظہارِ بیان کی صحت سے بڑھ
کر کچھ اور بھی ہے - میرے معیار تنقید نگاروں کے ادبی
معیاروں سے مختلف ہیں - میرے نزدیک شاعری محض ایک
ثانوی حیثیت رکھتی ہے -[2]''

شاعری کیسی ہونی چاہیے اور کیسی نہیں ہونی چاہیے ؟ اس سوال کو اقبال نے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دو واقعے بیان کر کے اس طرح حل کیا ہے کہ ایک موقع پر حضورؐ نے امراء القیس کے شعر سن کر فرمایا کہ وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے لیکن جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے - دوسرے موقع پر عنترہ کا ایک شعر سن کر اس سے ملنے کا شوق ظاہر فرمایا - امراء القیس کی شاعری میں شرابِ ارغوانی کے دَور ، حسن و عشق کی ہوش ربا داستانوں اور جاں گداز جذبوں ، آندھیوں سے اڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں ، سنسان ریتلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں ، جو قوت ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیّل پر جادو کے ڈورے ڈال کر ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کرتی ہیں - بخلاف اس کے عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی ، بولتی چالتی تصویر تھا ، جس کا مطلب یہ تھا

۱- مکاتیبِ اقبال بنامِ گرامی ، ص ۱۵۵ -
۲- خطوط اقبال ، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ، ص ۱۳۲ -

کہ میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کیں تا کہ اکلِ حلال کے قابل ہو سکوں ۔ اس سے اقبال نے یہ نتیجہ نکالا کہ :

”ہر وہ استعداد جو مبدءِ فیاض نے فطرتِ انسانی میں ودیعت کی ہے اور ہر وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ میں بخشی گئی ہے ، ایک مقصدِ وحید اور غایت الغایات کے لیے وقف ہے ؛ یعنی قومی زندگی ، جو آفتاب بن کر چمکے ، قوت سے لبریز ہو ، جوش سے سرشار ہو ۔ ہر انسانی صنعت اس غایتِ آخریں کے تابع اور مطیع ہونی چاہیے اور ہر شے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے ۔ تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش ہیں (کہ انھی پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں ، انحطاط اور موت کا پیغام ہے . . . غرض یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وجدانِ حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا ، اس نے اس اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح شانِ ارتقا کیا ہونی چاہیے ۔“[1]

شعر کے سلسلے میں اقبال کی پسند یا ناپسند کا معیار یہی تھا ۔ اقبال نے قدیم اساتذہ کے جن اشعار کو پسند کیا ، انھیں تضمین کے ذریعے اپنے کلام میں نگینوں کی طرح جڑ لیا ۔ اپنے ہم عصروں میں

---

۱ ۔ مقالاتِ اقبال ۔

سے بھی جس کو داد کے قابل سمجھا ، اس کے رنگ میں شعر کہہ یا بالفاظِ دیگر اس کا تتبع کر کے اس کی فوقیت کا اعتراف کیا ۔ اقبال کے اسی تنقیدی رویے کی روشنی میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ انھوں نے اپنے معاصرین میں سے کس کس کے متعلق کیا کچھ کہا ، کن اوصاف کی بنا پر کیا رائے قائم کی اور ان کی خوبیوں کے اعتراف میں کتنی عالی ظرفی کا ثبوت دیا ۔ اقبال نے جس میں بھی کوئی جوہرِ قابل دیکھا اس کو دل کھول کر سراہا ۔

جہاں تک اس کتاب کی ترتیب کا تعلق ہے ، یہ تاریخِ بائے وفات کے لحاظ سے مرتب کی گئی ہے ۔ جو شخص پہلے فوت ہوا ، وہ پہلے اور جو بعد میں فوت ہوا ، وہ بعد میں رکھا گیا ہے ۔

جو شخصیتیں اس کتاب میں جگہ نہیں پا سکیں ، ان کا تذکرہ مجھ پر قرض ہے ۔ بشرطِ زندگی یہ قرض دوسری جلد میں ادا کر دیا جائے گا :

زبان ز نکتہ فروماند و راز من باقیست
بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست

تحقیق کے مردانِ میدان موجود ہیں ۔ وہ چاہیں تو اس کام کو اور آگے بڑھا سکتے ہیں ۔ میں تو آیندہ نسل کو صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ :

وحشت ہماری بعدِ فنا پھیل جائے گی
اب تم پھرو گے چاک گریباں کیے ہوئے

محمد عبداللہ قریشی

لاہور ۱۴ ۔ اگست ۱۹۷۷ع

۱

امیر مینائی

(۱۹۰۰ع)

شاعری میں داغ دہلوی سے شاگردانہ وابستگی کے باوجود اقبال، منشی امیر احمد امیر مینائی کی شخصیت اور کمالِ شاعری کے بے حد مدّاح تھے۔ امیر لکھنؤ کے رہنے والے اور مخدوم حضرت شاہ میناؒ (متوفی ۸۸۴ھ) کی اولاد سے تھے۔ ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ (۲۱ فروری ۱۸۲۹ع) بروز شنبہ نصیرالدین حیدر بادشاہِ اودھ کے عہد میں پیدا ہوئے۔[1] قرآن مجید اور ابتدائی درسی کتابیں مولوی مظفّر علی سے پڑھیں، کتبِ درسیہ متداولہ کی تحصیل اپنے منجھلے بھائی حافظ ہدایت حسین سے کی۔ منشی سعداللہ مراد آبادی سے منطق و فلسفہ اور مولوی میر تراب علی لکھنوی سے فارسی و عربی علمِ ادب پڑھا۔ مفتی محمد یوسف اور مولوی عبدالحکیم فرنگی محلی سے فقہ اور اصولِ فقہ پڑھ کر دستارِ فضیلت حاصل کی۔[2] طب اور علمِ جفر میں دستگاہ بہم پہنچائی۔

۱۔ دبدبۂ امیری، از عبدالحکیم حکمت، ص ۱۰۔
۲۔ سیرتِ امیر، از ممتاز علی آہ، ص ۴۔

اور ''رموزِ غیبیہ'' نام کی ایک کتاب بھی تصنیف کی۔ تاریخ، سوانح، جغرافیہ، علمِ ہندسہ اور ادب و شعر کا بھی مطالعہ کیا۔ پھر خاندانِ چشتیہ صابریہ میں قطب الارشاد حضرت امیر شاہ صاحب قدس سرّہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور خرقۂ خلافت سے مشرّف ہوئے۔ بارہ برس کے سِن میں شعر کہنا شروع کیے۔ فارسی، عربی اور اُردو تینوں زبانوں میں شعرگوئی کی قدرت حاصل تھی۔ منشی مظفر علی اسیر سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ غالب، آتش، ناسخ اور انیس و دبیر کی صحبتیں اُٹھائیں۔ رند، صبا، نسیم، بحر، رشک اور وزیر کی زمزمہ سنجیاں سن کر اپنے کلام کو چمکایا۔ ہر صنفِ سخن کو آزمایا اور ہندوستان گیر شہرت حاصل کی۔

پچیس برس کے تھے کہ حضرت اسیر کی وساطت سے جانِ عالم واجد علی شاہ اختر کی بارگاہ میں باریاب ہوئے اور انتزاعِ اودھ (۷ فروری ۱۸۵۶ء) تک شاہی دربار سے وابستہ رہے۔ لکھنؤ کے مشاعروں کی طرحی غزلوں اور نواب واجد علی شاہ کی شان میں قصائد کا ایک مجموعہ ''غیرتِ بہارستان'' مرتّب کیا تھا، لیکن وہ ہنگامۂ غدر میں لکھنؤ کے اُجڑنے اور محلہ شاہ مینا کے بعض گھروں کو گوروں کی گولہ باری سے آگ لگنے کے باعث کتب خانے کے ساتھ ہی تلف ہوگیا۔ جب اہلِ کمال ایک ایک کر کے شہر چھوڑ گئے تو امیر مینائی نے بھی کلیجے پر پتھر رکھ کر کاکوری کا رخ کیا۔ ایک برس تک یہاں کے قرب و جوار میں رہ کر چھ واسوخت لکھے، جو ''مینائے سخن'' کے نام سے ۱۹۲۱ء میں طبع ہوئے۔ ساتواں واسوخت جو غیرمطبوعہ تھا مجلہ ''اُردو'' (کراچی، جنوری ۱۹۵۸ء) میں شائع ہوا۔

ہنگامہ فرو ہونے کے بعد ١٢٧٥ھ (١٨٥٩ء) میں انہیں نواب یوسف علی خاں ناظم والیِ ریاست رام پور نے کمال آرزو اور عزت کے ساتھ رام پور طلب فرمایا اور عدالتِ دیوانی کا حاکم مقرر کیا ۔ پھر ان سے مشورۂ سخن بھی کیا ۔ جب نواب ناظم نے ٢١ اپریل ١٨٦٥ء کو رحلت کی اور نواب کلب علی خاں مسند نشیں ہوئے تو ان کو فنِ شعر میں باپ سے بھی زیادہ انہماک اور شغف تھا ۔ ان کی ناز برداری اور قدردانی نے امیر کو رام پور کا گرویدہ کیے رکھا ۔ اس طرح ٣٤ برس تک رام پور ان کا مسکن رہا ۔ ١٨٨٧ء میں نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد بزمِ سخن درہم برہم ہو گئی ۔ داغ دکن چلے گئے تو امیر کا دل بھی اُچاٹ ہو گیا ۔ پرانی صحبتوں کی یاد میں فرماتے ہیں :

کہاں ہم اے امیر اب اور کہاں داغ
یہ جلسے ہو چکے خُلد آشیاں تک

نئے حکمراں سے طبیعت نہ مل سکی تو امیر بھی رام پور چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے ۔

انھی دنوں نظامِ دکن کی طرف سے طلبی کی تحریک شروع ہوئی مگر ادھر سے لیت و لعل ہوتا رہا ۔ آخر ١٣١٧ھ (١٨٩٩ء) میں جب میر محبوب علی خاں لارڈ کرزن وائسرائے ہند سے ملنے کلکتے آئے ، تو انھوں نے بہ اصرار لکھا کہ ہم سے بنارس میں آ کر ملو ۔ امیر بنارس میں شرفِ حضوری سے بہرہ یاب ہوئے[1] اور ایک قصیدے کے ساتھ اپنی زندگی کا سرمایہ ''امیر اللغات'' بھی پیش کیا ۔ نظام

---

١ ۔ اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ ، جلد ٣ ، ص ٢٧٧ ۔

نے پسند فرمایا اور ساتھ چلنے کی دعوت دی ۔ امیر نے سفر کا تہیہ کیا اور اپنے فرزند لطیف احمد اختر مینائی اور تلمیذِ رشید حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری کو ہمراہ چلنے پر آمادہ کر کے فرمایا :

اب کے سفر وہ ہے کہ نہ دیکھوں گا پھر وطن
یوں تو میں لاکھ بار غریب الوطن ہوا

چلتے وقت ایک نعت کہی جس کا یہ شعر ، بلکہ اس کا مصرع ثانی ، تاریخِ وفات ثابت ہوا :

اب نہ ٹھہروں جو خوشامد بھی کرے میری وطن
کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے مجھ کو

۱۰ جمادی الاول ۱۳۱۸ھ (۵ ستمبر ۱۹۰۰ء) کو حیدر آباد پہنچے ۔ ریلوے اسٹیشن پر اراکین و عمائدِ شہر نے شان دار استقبال کیا ۔ ہر طرف سے مہمان داری کا اصرار ہوا مگر آپ نے اپنے دیرینہ رفیق داغ دہلوی کی مہمانی قبول کی اور انھی کے ہاں فروکش ہوئے ۔ لیکن ہنوز صعوبتِ سفر سے ہوش بجا نہ ہوئے تھے کہ بیماری نے آ لیا ۔ بہت علاج کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا ۔ چنانچہ ایک مہینہ نو روز مبتلائے آلام رہ کر اتوار کو ۱۸ اور ۱۹ جمادی الثانی ۱۳۱۸ھ (۱۳ اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۰۰ء) کی درمیانی شب کو ۷۳ برس دس مہینے کی عمر پا کر اللہ کو پیارے ہوگئے ۔ داغ نے پریشانی اور اضطراب کے عالم میں یہ حسرت بھرا مطلع بے ساختہ کہا :

خاک آس سے عشق نے چھنوائی تھی
دشت میں مجنوں کی مٹی لائی تھی

اور تین تاریخیں نظم فرمائیں جن میں سے ایک یہ ہے :

مل گئی تاریخ دل سے داغ کے
آہ ! لطفِ شاعری جاتا رہا

۱۳۱۸ھ

امیر مینائی نے بہت سی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں ، جن میں ''مرآۃ الغیب'' ، ''محامدِ خاتم النبیین'' ، ''صنم خانۂ عشق'' اور ''مینائے سخن'' تو چھپ چکی ہیں ۔ ''گوہرِ انتخاب'' (۹۱۲ شعر) ، ''جوہرِ انتخاب'' (۲۸۴ شعر) ، ''دیوان امیر'' ، ''مثنوی عاشقانہ'' ، ''مثنوی کارنامۂ عشرت'' ، ''رباعیات'' اور ''مسدسات'' وغیرہ کئی شعری تخلیقات ابھی غیر مطبوعہ ہیں ۔ نثر میں ایک تذکرہ شعرائے رام پور کا ہے جس کا نام ''انتخابِ یادگار'' ہے ۔ ''خیابانِ آفرینش'' ، ''زاد الامیر'' ، ''سرمۂ بصیرت'' ، ''بہار ہند'' اور ''نماز کے اسرار'' کے علاوہ انھوں نے نہایت نفیس اور جامع اُردو لغت ''امیر اللغات'' کے نام سے مرتّب کرنا شروع کیا تھا مگر وہ الفِ ممدودہ اور مقصورہ کے الفاظ کی بحث سے آگے نہ بڑھ سکا ۔

اقبال ، حضرت امیر کا اپنے استاد داغ کی طرح احترام کرتے تھے ۔ ان کے غریب الوطنی میں انتقال کر جانے پر اقبال کو بہت دکھ ہوا ۔ یہ شعر ان کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے :

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر
چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر

اقبال نے قرآن مجید کی ''سورۃ شعراء'' سے مرحوم کی تاریخِ وفات نکال کر بھی ان کی عظمت کا اعتراف کیا ۔ یہ مادۂ تاریخ ہر لحاظ سے

بے نظیر الہامی یادگار سمجھا جا سکتا ہے :

لسان صدق فی الآخرین

۱۳۱۸ھ

ستمبر ۱۹۰۴ع کے 'مخزن' میں اقبال کی نظم ''سرگزشتِ آدم'' شائع ہوئی تو اس میں مندرجہ ذیل شعر بھی تھا جو ''بانگِ درا'' کی ترتیب کے وقت بہت سے دوسرے شعروں کے ساتھ حذف کر دیا گیا۔[1] اس سے امیر مینائی کے دیوان ''صنم خانۂ عشق'' کے بارے میں اقبال کی رائے معلوم ہو سکتی ہے :

عجیب شے ہے ''صنم خانۂ امیر'' اقبال !

میں بت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے

اقبال کا ارادہ امیر مرحوم کی زندگی اور شاعری پر ایک مضمون انگریزی میں لکھنے کا بھی تھا ۔ اسے وہ ولایت کے کسی پرچے میں چھپوا کر مشرق کے اس شاعر کی شاعرانہ عظمتوں کا اعتراف مغرب والوں سے کرانا چاہتے تھے - اپنی اس خواہش کا اظہار انھوں نے خطوں کے ذریعے امیر مرحوم کے ارشد تلامذہ سے بھی کیا اور اخبارات کے ذریعے بھی اعلان کیا ۔ چنانچہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ع کے ہفتہ وار اخبار ''پنجۂ فولاد'' لاہور میں ، جو منشی محمد الدین فوق[2]

۱- باقیاتِ اقبال ، ص ۳۳۶ -

۲- منشی محمد الدین فوق اقبال کے دوست تھے ۔ اقبال کی اکثر چیزیں ان کے اخبار میں چھپا کرتی تھیں ۔ وہ بھی داغ کے شاگرد تھے - اکتوبر ۱۹۰۱ع میں جب انھوں نے اخبار ''پنجۂ فولاد'' جاری کیا تو حضرت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

مرحوم کی ادارت میں لاہور سے نکلتا تھا ، اقبال کا ایک طویل مراسلہ شائع ہوا تھا جس کا متن حسبِ ذیل ہے :

"ماہِ رواں کے کسی اخبار میں مَیں نے پڑھا تھا کہ فنِ سخن کے استاد اور ملکِ نظم کے بادشاہ حضرت امیر مینائی کی لائف ابھی تک نہیں لکھی گئی ۔ راقمِ مضمون نے جناب امیر مرحوم کے اکثر تلامذہ اور بالخصوص حضرت جلیل ، ریاض ، مضطر ، کوثر ، عابد اور ان کے خلفِ ارشد حضرت اختر وغیرہ کو متوجہ کیا ہے کہ ایسا شاعرِ بے نظیر اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

داغ نے یہ قطعہ تاریخ لکھ کر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا :

ہوا ہے پنجۂ فولاد جاری
خریدارو! نیا اخبار دیکھو

جنابِ فوق کی گلکاریوں سے
ہوا اخبار یہ گلزار دیکھو

نئی خبریں بہت سچّی ملیں گی
جو ہو کر طالبِ دیدار دیکھو

نظر چڑھ جائے گر اہلِ نظر کی
پھر اس کی گرمیٔ بازار دیکھو

یہی پرچہ تو پرچاتا ہے دل کو
نہ ہوگا اس سے دل بیزار دیکھو

اٹھاؤ رکھ کے سو سو بار اس کو
اگر دیکھو تو سو سو بار دیکھو

سنا دو مصرعِ تاریخ اے داغ
یہ لو اخبار جوہر دار دیکھو

۱۳۱۹ھ

ان کی لائف اب تک نہ لکھی جائے۔ بے شک یہ حیرانی کی بات ہے کہ کیوں اب تک فن سخن کے قدردان بزرگوں نے امیر مرحوم کی شاعرانہ اور پبلک زندگی کو کاغذی جامہ نہیں پہنایا ، جس کے دیکھنے کے لیے سخن فہم طبیعتیں بے چینی سے منتظر ہیں ۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ایسے صاحبِ کمال کی سوانخ عمریاں ایک نہیں کئی لکھی جاتیں اور کئی کئی بار چھپتیں ، مگر : ع

اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

حضرت امیر کے کلام کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ان کا درجہ شاعری سے بہت بڑھا ہوا تھا ۔ ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد اور ایک خاص قسم کی لَے پائی جاتی ہے ، جو صاحب دلوں کو بے چین کر دیتی ہے اور وہ کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے ہیں ۔ آہ ! ایسے بے نظیر شخص کے حالات ، جو اصلی معنوں میں تلمیذالرحمٰن کہلانے کا مستحق ہو ، ابھی تک گمنامی میں پڑے رہیں ، اندھیر نہیں تو اور کیا ہے ؟ اگر یہی شخص یورپ یا امریکہ میں ہوتا تو اس کی زندگی میں ہی اس کی کئی سوانخ عمریاں نکل جاتیں ۔ مگر افسوس ہے ہندوستان میں ان کی زندگی میں تو درکنار ، ان کی وفات کے بعد بھی ان کی کوئی لائف نہ لکھی گئی ۔ میرا ایک عرصے سے خیال تھا کہ حضرت امیر کی زندگی کے جستہ جستہ واقعات قلم بند کروں ، مگر اب مرحوم

کی لائف کے متعلق ایک تازہ مضمون دیکھ کر پھر اُمنگ آئی ہے کہ جس طرح ہو میں اپنے کام کو پورا کروں اور بہت جلد۔

میرا مقصد اصل میں حضرت امیر کی شاعری اور شاعرانہ لائف پر بحث کرنے کا ہے، اس لیے چند باتیں حضرت امیر کے تلامذہ اور دیگر واقف کاروں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں:

(۱) حضرت امیر کی کوئی ایسی بات جس نے ان کی زندگی یا شاعری پر کوئی خاص اثر کیا ہو۔

(۲) ان کے زبانی مقولے۔

(۳) ان کے بچپن کی بعض بعض باتیں، جن سے ان کی آئندہ عظمت کا پتہ چلتا ہو۔

(۴) انھوں نے کس کس مقام کا سفر کیا اور کیوں؟

(۵) کس کس استاد سے کیا کیا حاصل کیا؟

(۶) ان کی عام عادات۔

(۷) چند ایک مشاعروں کی مفصّل کیفیت۔

یہ جتا دینا ضروری ہے کہ یہ مضمون انگریزی میں لکھا جائے گا اور ولایت کے کسی مشہور اخبار یا رسالے میں چھپوایا جائے گا۔ امید ہے کہ حضرت امیر کے نام لیوا اور ان کے تلامذہ مجھے امداد دے کر ممنون فرمائیں گے۔

راقم محمد اقبال ایم۔ اے

اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت مطلوبہ مواد فراہم نہ ہو سکنے کی وجہ سے اقبال اس موضوع پر کچھ نہ لکھ سکے ۔ اگر لکھ جاتے تو بہت اچھا اور قابلِ قدر ہوتا ۔ سوالنامے کے گلستان سے اقبال کے تنقیدی شعور کی بہار کا قیاس کیا جا سکتا ہے ۔ حضرت امیر کے شاگرد اور جانشین نواب فصاحت جنگ حافظ جلیل مانک پوری نے ''سوانح امیر'' بہت بعد میں قلم بند کی جو شائع ہوئی ۔ ان کے دوسرے شاگرد ممتاز علی آہ کی کتاب ''سیرت امیر'' بھی چھپی ۔ ''دبدبۂ امیری'' مصنفۂ عبدالحکیم حکمت ، ''ذکرِ حبیب'' از ادریس احمد مینائی ، ''صہبائے امیر'' از آفتاب احمد صدیقی اور ''طرّۂ امیر'' از امیر احمد علوی بھی امیر کے حالات پر لکھی گئیں ۔ احسن اللہ خان ثاقب نے ''مکاتیبِ امیر'' بھی مرتّب کر کے شائع کیے ۔ مگر یہ سب بعد کی باتیں ہیں ۔ اس وقت اقبال اپنے نصب العین کی تکمیل میں مصروف ہو چکے تھے اور انھیں اس کام کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہ تھی ۔

☆ ☆ ☆

۲

داغ دہلوی

(۱۹۰۵ء)

فصیح الملک میرزا داغ دہلوی اپنی مخصوص شوخی ، بانکپن ، معاملہ بندی ، الفاظ کی تراش خراش اور زبان و محاورہ کے صحیح استعمال کی بنا پر غزل گو شعرا کے امام مانے جاتے تھے - وہ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور قلعۂ معلّی میں پرورش پائی - فارسی ، ''غیاث اللغات'' کے مرتّب مولوی غیاث الدین سے پڑھی ، خوش نویسی اپنے وقت کے مشہور خطّاط میر پنجہ کش سے سیکھی ، شاعری میں شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد ہوئے اور اسلوب میں جرأت کی تقلید کی - سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں وہ دہلی سے نکل کر رام پور پہنچے - پہلے نواب یوسف علی خاں اور بعد میں نواب کلب علی خاں کے دربار میں رہے - نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد حیدرآباد دکن تشریف لے گئے ، جہاں ۱۸۸۸ء میں میر محبوب علی خاں نے انھیں اپنا استاد مقرر کر لیا - وہیں ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء (۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ) کو ۷۴ برس کی عمر پا کر بعارضۂ فالج انتقال کیا -

"گلزارِ داغ"، "آفتابِ داغ"، "مہتابِ داغ" اور "یادگارِ داغ"، چار دیوان اور ایک مثنوی "فریادِ داغ" ان کی یادگار ہیں۔

ان کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ بعضوں نے بڑا نام پایا۔ شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبال کو بھی ان کی شاگردی پر فخر و ناز تھا۔ اس کا اظہار انھوں نے اکثر جگہ کیا ہے۔ ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

یہ اقبال کے ابتدائی زمانے کا کلام ہے - ۱۸۹۶ع میں لاہور میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا تھا جس کے لیے یہ طرح تجویز کی گئی تھی:

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا

اقبال نے اسی مشاعرے میں یہ غزل پڑھی تھی۔ اس کا مطلع یہ تھا[۱]:

تصوّر بھی جو بندھتا ہے تو خالِ روئے جاناں کا
بلندی پر ستارا ہے شبِ تاریکِ ہجراں کا

مقطع میں نسیم سے مراد سید شبیر حسین جعفری بھرت پوری ہیں جو داغ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۰۹ع میں ہوا۔ "ریاضِ نسیم" ان کے دیوان کا نام ہے جو ۱۹۲۰ع میں

۱- شورِ محشر، لاہور، دسمبر ۱۸۹۶ع - باقیاتِ اقبال، صفحات ۳۸۳ - ۳۸۶ -

ابوالعلائی پریس آگرہ میں طبع ہوا تھا ۔ حافظ محمد یوسف خاں تشنہ بلند شہری بھی داغ کے باکمال شاگرد تھے ۔ آخری عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی ۔ ۱۹۰۰ء میں فوت ہوئے ۔ ان کے فرزند ضمیر الدین ضمیر ، سید ظہیر حسین ظہیر دہلوی کے شاگرد تھے ۔ ان کا دیوان بھی طبع ہو چکا ہے ۔ استاد داغ کی حینِ حیات ہی میں ان دونوں کی شہرت کا آوازہ لاہور تک پہنچ چکا تھا ۔ دونوں ہی داغ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور مکتبۂ داغ کے پختہ کار سخن ور مانے جاتے تھے ۔ اسی لیے اقبال نے ان کا ذکر کیا ۔

اقبال کی ایک اور غزل کا مقطع ہے ، جس میں داغ کے فیضان کا اعتراف اس طرح کیا ہے[۲] :

جنابِ داغ کی اقبال یہ ساری کرامت ہے
ترے جیسے کو کر ڈالا سخنداں بھی سخنور بھی

اس آثارِ قدیمہ غزل کے چند شعر اور بھی ملاحظہ فرمائیے :

برا ہوتا ہے عشقِ شعلہ رویانِ ستم گر بھی
یہ وہ آتش ہے جس میں خاک ہو جائے سمندر بھی

محبت میں دلِ مضطر جبھی کچھ لطف اٹھتا ہے
کہ ہو معشوق ظالم بھی ، جفا جو بھی ، ستم گر بھی

بجا ہے شیخ جی سب کچھ مگر میں کس طرح مانوں
اجی حضرت ! مرا دیکھا ہوا ہے آبِ کوثر بھی

۲۔ باقیاتِ اقبال ، صفحات ۳۹۵ - ۳۹۶ ۔

وہ ناکامِ تمنّا ہوں اگر میں ڈوبنے جاؤں
تو اک پانی کے قطرے کے لیے ترسے سمندر بھی

دو غزلوں میں یوں بھی تعریف کی ہے :

گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے جو وہ بت اقبال
حضرتِ داغ کے اشعار سنا دیتے ہیں[۱]

تجھ کو اقبال ان سے کیا نسبت
دلّی والے زبان والے ہیں[۲]

آخری شعر غالباً ان دنوں کا ہے جب داغ نے یہ دعویٰ کیا تھا :

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

استاد کے انتقال پر اقبال نے ''نواب میرزا داغ'' یعنی شاعر کے نام
۱۳۲۲ھ
ہی سے فی البدیہہ تاریخ وفات نکالی اور پھر وہ غیرفانی نظم کہی جو ''بانگِ درا'' میں موجود ہے ۔ اس نظم کا ایک ایک مصرع عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے ۔ یہ دو بند تو تاثیر اور حقیقت نگاری کا لاجواب نمونہ ہیں :

اب کہاں وہ بانکپن ، وہ شوخیٔ طرزِ بیاں
آگ تھی کافورِ پیری میں جوانی کی نہاں

۱- باقیاتِ اقبال ، ص ۳۸۰ -
۲- ایضاً ، ص ۳۹۶ -

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٔ معنی وہاں بے پردہ، یاں محمل میں ہے

اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں
اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں

تلخیٔ دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے
یا تخیّل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سینکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی

اٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے بت خانے سے
مے پلائیں گے نئے ساقی، نئے پیمانے سے

لکھّی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

ہوبہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن، مارے گا دل پر تیر کون

داغؔ کے کمالِ فن کا تجزیہ اس سے بہتر شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ یہ اقبال کے تنقیدی رویے کی ایک نادر مثال ہے۔

☆ ☆ ☆

۳

محمد حسین آزاد

(۱۹۱۰ء)

مولوی محمد حسین آزاد کا شمار اُردو کے چند گنے چنے صاحبِ طرز انشا پردازوں اور جدید اُردو نظم کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ وہ ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۳ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شیخ محمد ابراہیم ذوق کے سایۂ عاطفت میں اور باقی دہلی کالج میں حاصل کی۔ استاد ذوق کے پاس اُٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے ان کی ملاقات بڑے بڑے شعرا سے ہوئی جس سے ان کے ذوقِ ادب کو بہت فائدہ پہنچا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں ان کے والد مولوی محمد باقر مارے گئے اور یہ نہایت بے سر و سامانی کے عالم میں دہلی سے نکل کر جگہ جگہ مارے مارے پھرتے رہے، ہارے درجے لاہور پہنچے۔ پہلے ڈاکخانے میں ملازمت کی، پھر ماسٹر پیارے لال آشوب کی سفارش سے محکمۂ تعلیم میں لے لیے گئے۔ یہاں ''اتالیقِ پنجاب'' کی ادارت کے فرائض انجام دیے اور بچوں کے لیے ابتدائی درسی کتابیں لکھیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔

رفتہ رفتہ ترقی کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر ہوگئے ۔ دو مرتبہ علمی تحقیقات کے لیے ایران گئے ، پھر وسطِ ایشیا کی سیاحت کی اور وہاں سے نہایت قیمتی علمی نوادر ساتھ لائے ۔ ۱۸۸۷ع میں آپ کو حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا ۔ کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب کے ایما پر آپ نے انجمنِ پنجاب کی طرف سے ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی ، جس میں طرحی غزلوں کی بجائے کسی خاص موضوع پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں ۔ پہلا مشاعرہ ۸ مئی ۱۸۷۴ع کو ہوا جس میں آزاد نے اپنی مثنوی ''شب قدر'' پڑھ کر سنائی ۔ آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں آبِ حیات ، نیرنگِ خیال ، دربارِ اکبری ، سخندانِ فارس ، نگارستانِ پارس ، سپاک نماک اور نظم آزاد بہت مشہور ہیں ۔ آخر اپنی جوان اور لائق بیٹی کی بے وقت وفات کے صدمے سے ان کا دماغ مختل ہوگیا اور یہ روگ مرتے دم تک قائم رہا ۔ ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ع کو لاہور میں انتقال کیا اور تکیہ گامے شاہ میں دفن ہوئے ۔

مولانا آزاد کے انتقال کے تین ماہ بعد ۲۷ اپریل ۱۹۱۰ع سے اقبال نے اپنی زیرِ مطالعہ کتب کے متعلق تاثرات ، اپنے ماحول کے بارے میں خیالات و احساسات اور ایامِ طالب علمی کی یادوں پر مبنی متفرق تحریریں ایک بیاض میں قلم بند کرنی شروع کیں ۔ یہ سلسلہ چند ماہ تک جاری رہا ، پھر بند ہوگیا ۔ یہ بیاض انگریزی میں تھا اور اس کا نام اقبال نے Stray Reflections رکھا تھا ۔ یہ حضرت علامہ کے کاغذات میں پڑا تھا ۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اسے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے ۔ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور نے اس کا

اُردو ترجمہ ''شذراتِ فکرِ اقبال'' کے نام سے شائع کیا ہے - مترجم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ہیں - اس بیاض میں ایک جگہ مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کی یاد تازہ کرنے کے بہانے اقبال نے یہ شذرہ سپردِ قلم فرمایا ہے اور ان کے ایک شعر کی تعریف کی ہے : -

''ہوریس ، مانٹین اور آزاد :

ہم اس طرح کھنچے جاتے ہیں جیسے پانی کے ریلے میں شہتیر - کوئی طاقت ادھر اُدھر دھکیلے لیے جا رہی ہے -''

ہوریس[1] کے ان مصرعوں پر مانٹین[2] یوں تبصرہ کرتا ہے :

''ہم خود نہیں جاتے بلکہ لے جائے جاتے ہیں ، جیسے کوئی چیز پانی کے پُرسکون یا طوفانی بہاؤ کے مطابق کبھی آہستہ آہستہ ، کبھی بڑی تیزی سے بہے جا رہی ہو -''

مانٹین کی اس عبارت کو پڑھتے وقت مجھے آزاد مرحوم کا ایک شعر یاد آیا ، جس میں مرحوم نے ہوریس اور مانٹین

۱- ہوریس (۶۵ - ۸ ق م) : لاطینی شاعر نے اپنی مشہور نظموں ''سابائن فارم'' (Sabine Farm) اور ''بنڈوشین'' (Bandusian) میں فطرت کی نظر افروز عکاسی کی ہے - غالباً یہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی کتاب ''ارس پوئیٹیکا'' (Ars Poetica) میں فن کی مختلف اصناف کو ایک ہی سلسلے میں منسلک کر کے ان پر سیرحاصل بحث کی ہے -

۲- مانٹین (Montaigne) (۱۵۳۳ — ۱۵۹۲ء) : فرانسیسی ادیب ، مصنف اور مترجم (شذراتِ فکرِ اقبال ، صفحات ۱۶۳ - ۱۶۴) -

سے کہیں زیادہ حسین پیرایے میں اس خیال کو ادا کیا ہے:

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں، بے اختیار بیٹھے ہیں"

اسی خیال سے ملتا جلتا غالب کا ایک شعر بھی ہے جو آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے یہاں پیش کیا جاتا ہے، اس لیے اس کو برسبیلِ تذکرہ ہی سمجھنا چاہیے:

رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

☆ ☆ ☆

۴

ظہیر دہلوی

(۱۹۱۱ء)

علامہ اقبال اپنے یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء کے ایک خط میں مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد مدارالمہام حیدرآباد دکن کو لکھتے ہیں :

''راقم الدولہ ظہیر مرحوم کو آپ خوب جانتے ہیں۔ دہلی میں ان کا نواسہ مجھ سے ملا تھا اور کہتا تھا کہ مہاراجہ بہادر نے از رہِ مرحمتِ کریمانہ ظہیر مرحوم کے سوانح اور قصائد کے طبع و اشاعت کے لیے دو سو روپے کی رقم عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شرفا پروری کا اجرِ عظیم ارزانی فرمائے۔ ظہیر کے سوانح دلچسپ ہیں، خصوصاً غدر کے ایام کے واقعات، جو اُنھوں نے لکھے ہیں، تاریخی اہمیت رکھنے کے علاوہ عبرت ناک ہیں، علیٰ ہذاالقیاس ان کے قصائد کا دیوان بھی عمدہ ہے۔ میں نے ان کے نواسے کو ہدایت کی ہے کہ وہ سوانح عمری

ظہیر، خواجہ حسن نظامی کے سپرد کر دے تاکہ خواجہ صاحب موصوف اسے کاٹ چھانٹ کر اشاعت کے لیے تیار کریں ۔ ان کے نواسے کی خواہش ہے کہ رقمِ معہودہ مبلغ دو صد روپیہ آپ براہِ راست خواجہ صاحب کی خدمت میں ارسال کریں کیونکہ اس کتاب کی اشاعت کے وہی ذمہ دار ہیں ۔ مجھ سے اس نے کہا ہے کہ میں بھی جناب کی خدمت میں سفارش کروں کہ وہ رقم خواجہ صاحب کی خدمت میں ارسال کریں ۔ سو از راہِ کرم خواجہ نظامی کی خدمت میں وہ رقم ارسال فرمائیے ۔ غالباً ظہیر مرحوم کے نواسے اشتیاق حسین نے بھی آپ کی خدمت میں عریضۂ نیاز اس مطلب کا تحریر کیا ہوگا ۔''[۱]

راقم الدولہ سید ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی ، شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد اور ابوالمظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ثانی ظفر آخری تاج دارِ دہلی کے داروغۂ ماہی مراتب تھے ۔ انھوں نے اپنی زندگی کے حالات میں کتاب ''داستانِ غدر'' لکھی تھی جو چھپ چکی ہے اور جیسا کہ حضرت علامہ نے اپنے خط میں لکھا ہے ''دلچسپ بھی ہے اور تاریخی اہمیت رکھنے کے علاوہ عبرت ناک بھی ۔'' مگر ایک بات کی کمی ہے کہ مولانا ظہیر نے اس میں کہیں بھی تاریخ یا سنہ یا مہینہ نہیں دیا ، حتٰی کہ اپنی تاریخ پیدائش تک نہیں لکھی ۔ وہ فرماتے ہیں کہ غدر کے وقت میری عمر بائیس سال تھی ۔ اس سے

۱۔ سہ ماہی ''صحیفہ'' لاہور ، اقبال نمبر ، حصہ اول ، صفحات ۱۰۱ - ۱۰۲ ۔

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۸۳۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ قلعۂ معلیٰ کی ملازمت حاصل کرتے وقت ان کی عمر بارہ برس تھی۔ اس حساب سے وہ ۱۸۴۸ء میں بادشاہ کے ملازم ہوئے اور انھیں قوربیگی (داروغۂ ماہی مراتب) کا عہدہ ملا۔ ان کے فرائض یہ تھے کہ جب بادشاہ کہیں باہر جاتا تو وہ علم اور چتر لے کر اپنے نائبین کے ہمراہ بادشاہ کی رکاب میں چلتے ورنہ دربار میں حاضر رہتے۔

ظہیر کے والد سید جلال الدین حیدر المخاطب بہ صلاح الدولہ مرصّع رقم فنِ خوش نویسی میں بادشاہ کے استاد تھے۔ ظہیر اور ان کے چھوٹے بھائی انور بھی خوش نویس تھے۔ ظہیر چودہ برس کے سن میں ذوق کے شاگرد ہوئے اور شعر و سخن کی محفلوں میں شریک ہونے لگے۔ ان کے چھوٹے بھائی انور بھی ذوق کے شاگرد تھے، مگر ذوق کی وفات کے بعد مرزا غالب کو کلام دکھلانے لگے۔ حضرتِ ظہیر لکھتے ہیں:

”میں جس زمانے میں 'بہارِ دانش' و 'زلیخا' پڑھتا تھا، ایک روز والد بزرگوار کے ایک دوستِ قدیم میاں نبی بخش صاحب نبیسۂ شاہ نصیر مرحوم تشریف لائے۔ اور میرے مکتب ہی میں دونوں بزرگوار بیٹھے ہوئے تھے کہ میاں نبی بخش صاحب نے ایک شعر کسی استاد کا پڑھا۔ میرے والد نے فرمایا کہ کیا عمدہ و لاجواب مطلع کہا ہے۔ سبحان اللہ۔ وہ شعر یہ تھا:

ہم سے بھری چشمِ یار، دیکھیے کب تک رہے
گردشِ لیل و نہار، دیکھیے کب تک رہے

مطلع کا کلمہ سن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ ڈرتے ڈرتے اپنے والد بزرگوار سے دریافت کیا کہ مطلع کے کیا معنی ہیں اور مقطع کسے کہتے ہیں۔ والدِ ماجد نے مجھے مطلع و مقطع کے معنی سمجھائے اور پھر فرمایا کہ علمِ عروض میں اوّل جو شعر لکھا جاتا ہے، اس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے، اسے مطلع کہتے ہیں اور جس کے اخیر مصراع میں کافیہ ہو اسے شعر کہتے ہیں، اور شعر کی تعریف بیان کی۔ غرضکہ سب ارشاد جناب ممدوح میرے ذہن نشیں ہوگئے اور میں نے فی البدیہہ ایک مطلع اور ایک شعر اسی وزن پر موزوں کر کے پڑھا تو والد بزرگوار اور عموی صاحب میاں نبی بخش صاحب نہایت خوش ہوئے، اور میاں نبی بخش صاحب نے مجھے پیار کیا اور کہا کہ تو لاکلام شاعر ہوگا۔ وہ مطلع اور شعر یہ ہیں:

صحبتِ اغیار و یار، دیکھیے کب تک رہے
مجھ سے یہ دار و مدار، دیکھیے کب تک رہے
غیر سے دل تیرا یار، صاف ہے آئینہ وار
میری طرف سے غبار، دیکھیے کب تک رہے

بس وہ تعریف اور عنایات ان بزرگواروں کی میرے حق میں بارود میں شتابہ اور سونے پر سہاگہ کا کام کر گئیں اور مجھے شوق شعر و سخن کا پیدا ہوگیا اور روز بروز ادبسی جوانی کی طرح ترقی پذیر ہوتا چلا گیا۔ اب کیفیت یہ ہوئی کہ جس کی زبان سے شعر اچھا سنا، وہ دل میں

نقش ہو گیا ۔ گھر کے کتب خانے کو دیکھا تو اہل فارس کے دواوین بکثرت نظر آئے ۔ شعرائے فارس کے انتخاب بطور تذکرہ گھر میں موجود تھے ۔ ان کو دیکھنا شروع کیا ۔ اُردو کی غزل جس استاد کی سنی یاد کر لی ۔ دیوان ناسخ اور آتش اور واسوخت اور مثنویاں وغیرہ لکھنؤ سے چھپ کر تازہ تازہ دلی میں آئی تھیں ، شبانہ روز ان کے دیکھنے کا مشغلہ رہنے لگا ۔ ایک دو غزلیں بھی ٹوٹی پھوٹی لکھیں اور میاں نبی بخش صاحب کو دکھائیں ۔ لیکن والد صاحب منع فرماتے تھے کہ 'تو شعر نہ لکھا کر ۔ حالانکہ خود لاجواب شاعر تھے ، شاہ نصیر کے شاگرد تھے ۔ غرضکہ اُنھیں ایام میں حافظ قطب الدین صاحب مشیر شاگردِ شاہ نصیر صاحب مرحوم نے شاہ صاحب کے مکان میں مشاعرہ قرار دیا ۔ چونکہ مکان مشاعرہ میرے مکان سے بہت قریب تھا ، میں شاملِ بزم ہونے لگا ۔ اوّل غزل میں نے اسی مشاعرے میں پڑھی ہے اور جناب شیخ محمد ابراہیم ذوق خاقانیِ ہند کا جا کر شاگرد ہوا ۔ اور داغ صاحب بھی شریکِ مشاعرہ تھے اور بہت سے نام آور شعرا موجود تھے ۔ میرا سن کم و بیش اس زمانے میں چودہ سال کا ہو گا ۔"[1]

۱۔ داستانِ غدر ، شائع کردہ اکادمی پنجاب (جون ۱۹۵۵ع) ، صفحات ۲۱ - ۲۳ ۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ظہیر اور انور دونوں بھائیوں نے بہت سی تکلیفیں اٹھائیں ۔ یہ دلی سے نکل کر جھجر ، سونی پت ، نجیب آباد سے ہوتے ہوئے بریلی پہنچے ۔ چار برس رام پور میں رہنے کے بعد عام معافی کا اعلان ہونے پر ۱۸۶۴ء میں لارڈ لارنس کے زمانے میں دہلی واپس آئے جہاں سے اخبار ''جلوۂ طور'' کی ادارت کرنے بلندشہر چلے گئے ۔ اس اخبار کے مالک منشی گنیشی لال تھے ۔ کچھ عرصے بعد مہاراجہ الور کے بلانے پر الور پہنچے ۔ پھر ریاست جے پور میں پہلے تھانے دار ، پھر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوگئے ۔ وہاں کم و بیش انیس سال رہے ۔ والیِ ریاست مہاراجہ رام سنگھ کے انتقال پر وہاں سے نکلے اور پندرہ سولہ سال ریاست ٹونک میں بسر کیے ۔ آخری عمر میں حیدرآباد دکن گئے جہاں مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد صدر اعظم کی سرکار سے وابستہ ہوگئے ۔ وہیں پیغامِ اجل آ پہنچا اور ظہیر نے ۱۷ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ (۱۹ مارچ ۱۹۱۱ء) کو حیدر آباد دکن میں انتقال کیا ۔ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی دہلی کی قدیم شاعری کی شمع گل ہوگئی ۔

ظہیر کے غریب الوطنی میں سفرِ آخرت اختیار کرنے کی خبر لاہور میں ۲۹ مارچ ۱۹۱۱ء کو جناب بشیر نبیسۂ حضرت ظہیر کے خط سے پہنچی ۔ فصیح الملک بہادر نواب میرزا داغ دہلوی کے استاد بھائی ہونے کی بنا پر داغ کے تمام شاگرد انہیں اپنے استاد کی طرح واجب‌التعظیم جانتے تھے ، اس لیے جناب وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی مدیرِ رسالۂ ''اصلاحِ سخن'' ، مولوی ظفر علی خاں مدیر روزنامہ ''زمیندار'' و ''پنجاب ریویو'' ، میر بشارت علی جالب دہلوی

جائنٹ ایڈیٹر ''پیسہ اخبار''، منشی محمدالدین فوق مدیر ''کشمیری میگزین''، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لاء اور پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی (شاگردانِ داغ) نے باہم مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ لاہور میں ایک ماتمی جلسہ منعقد کیا جائے مگر اس وقت انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس کی وجہ سے، جس کے انعقاد کی تاریخیں ۱۴-۱۵-۱۶ اپریل مقرر تھیں، فوراً جلسے کا انتظام نہ ہو سکا، کیونکہ اکثر بزرگ اس جلسے کے لیے مضامین نظم و نثر تیار کرنے میں مصروف تھے۔ آخر ۲۳ اپریل تاریخ مقرر ہوئی اور بزمِ اردو (جو اس زمانے کی ایک ادبی انجمن تھی جس کے سیکرٹری غالباً خان بشیر حسین خاں تھے) کی جانب سے ایک عام پبلک جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر محمد اقبال نے فرمائی۔

سب سے اول صدرِ جلسہ نے مولانا ظہیر کی شاعرانہ خوبیوں کا اظہار فرما کر جلسے کے اغراض و مقاصد سے حاضرین کو آگاہ کیا۔ اس کے بعد مولوی ظفر علی خاں نے فلسفۂ حیات و موت پر ایک بلیغ اور عالمانہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''موت کا صدمہ عارضی ہوتا ہے۔ موت ہوا کی طرح آئی اور چلی گئی۔ ہر قوم کے بڑے آدمی تمدّن کے ہر شعبے میں اسلاف کی روایات کے خازن اور اپنی گذشتہ قومی تہذیب کا نچوڑ ہوا کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کی موت قومی صدمہ سمجھی جاتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں مولانا ظہیر بھی تھے۔ میر سے لے کر غالب و ذوق کی شاعری

کے اوصاف ان میں ودیعت تھے ۔ وہ اسلامی تمدّن اور اسلامی معاشرت کی تاریخ تھے ۔ اب نئی نسلیں ہیں جو گزشتہ روایات کو بھول گئی ہیں اور جو ہر معاملے میں ملٹن ، میکالے اور شیکسپیئر کی نظیر دیتی ہیں اور اپنے مشاہیر کو فراموش کر چکی ہیں ۔ ہم آج اس شخص کی وفات پر آنسو بہانے کے لیے جمع ہوئے ہیں جو فردِ فرید تھا اور ذوق و غالب کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھا ۔ اردو شاعری میں ظہیر ایک خاص پایہ رکھتے تھے اور وہ تخئیلی داستانِ الفِ ابجد سے لے کر تائے تمّت تک انہیں ازبر یاد تھی ، جس میں میر سے لے کر غالب و ذوق اور امیر و داغ کے عہد تک کے واقعات درج تھے ۔ پرانی شاعری کی سب رونق ان کے کلام میں موجود ہے ۔ قصیدہ اور غزل کے وہ استاد تھے ۔''

اس کے بعد فاضل مقرّر نے مولانا ظہیر کے مطبوعہ دیوان سے کئی غزلیں اور قصیدے پڑھ کر سنائے اور حاضرین نے مولانا کی روح پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے۔ مولانا ظفر علی خاں نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا :

''اگر مسلمان یہ سمجھیں کہ مولانا ظہیر کے مرنے سے ایک ایسی جگہ خالی ہوگئی ہے جس کا پُر ہونا مشکل نظر آتا ہے تو ان کا یہ سمجھنا بالکل واجب ہے ۔''

آخر میں آپ نے اس مضمون کی ایک قرارداد پیش کی :

''بزمِ اردو کا یہ جلسہ اس صدمے کو ، جو مولانا ظہیر کی

وفات سے اردو شاعری کو پہنچا ہے ، مجموعی طور سے محسوس کرتا ہے اور بالاتفاق قرار دیتا ہے کہ مرحوم کے پس ماندگان سے رنج و الم کا اظہار کیا جائے۔''

یہ قرارداد منظور کی گئی اور فاضل مقرر نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اُٹھا کر حاضرینِ جلسہ کو بھی اپنا شریک بنایا۔ مولوی ظفر علی خاں کی تقریر کا حاضرین پر جو اثر ہوا اس کا پورا نقشہ الفاظ میں نہیں کھینچا جاسکتا۔ جلسے میں سنّاٹے کا عالم تھا اور ہر شخص تصویر کی طرح خاموشی سے تقریر سن رہا تھا۔

مولوی ظفر علی خاں کے بعد میر جالب دہلوی نے تقریر کی۔ یہ گویا ایک بحرِ ذخّار تھا کہ موجیں مارتا چلا جاتا تھا۔ آپ کی تقریر کیا تھی؟ مولانا ظہیر کی تاریخِ زندگی کا خلاصہ تھا۔ آپ نے فرمایا:

''ہماری زبان ، ہماری قوم اور ہمارے ملک پر مولانا ظہیر کا بہت احسان ہے۔ وہ محاورہ بندی ، پُرگوئی اور سادگی میں ذوق تھے ، نازک خیالی میں مومن تھے اور مشکل گوئی میں غالب۔''

میر جالب نے مولانا ظہیر کی نئی اور پرانی شاعری کے چیدہ چیدہ نمونے پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ ''مرحوم کی بہترین یادگار یہ ہو سکتی ہے کہ ان کا آخری دیوان ، جو مسودے کی شکل میں موجود ہے ، چھپوا دیا جائے۔'' آپ نے یہ تحریک بھی پیش کی:

''مرحوم کے پس ماندوں سے التجا کی جائے کہ وہ اس دیوان کو شائع کردیں۔''

یہ تحریک مولانا ظفر علی خاں کی اس ترمیم کے ساتھ بالاتفاق منظور ہوئی کہ :

"چونکہ یمین‌السلطنت ہز اکسیلنسی مہاراجہ کشن پرشاد، ظہیر مرحوم کے سرپرستِ خاص تھے اور اردو زبان کے ایک بڑے محسن ہیں، لہٰذا استدعائے اشاعتِ دیوان ان کی خدمت میں بھی ہونی چاہیے۔"

اسی تحریک پر مہاراجہ نے دو سو روپے اس مد میں عنایت فرمانے کا وعدہ کیا تھا جس کا ذکر علامہ اقبال نے اپنے محولہ بالا خط میں کیا ہے۔ مگر افسوس! کہ دیوان پھر بھی شائع نہ ہو سکا۔ البتہ "داستانِ غدر" چھپ گئی۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے اکادمی پنجاب کی طرف سے بھی جون ۱۹۵۵ع میں شائع کیا تھا۔

میر جالب کے بعد منشی ہدایت‌اللہ شیدا امرتسری نے تیرہ بند کا ایک مرثیہ پڑھا جس کے دو بند یہ ہیں :

شور ہے کیسا، یہ کیوں ہر لب پہ ہے آہ و بُکا
جمع ہیں اربابِ تعزیّت، الٰہی کیا ہوا ؟
ذی ہنر وہ کون سا دارِ فنا سے چل بسا
کس کا غم ہے، کس کا صدمہ، ہے یہ آخر بات کیا ؟
کیا سبب ہے آج کیوں روتے ہیں سب چھوٹے بڑے ؟
جان اپنی رنج سے کھوتے ہیں سب چھوٹے بڑے ؟

شاعروں پر ان کے ہیں احسان بے حدّ و حساب
ملک میں باقی نہیں تھا کوئی اب ان کا جواب

بڑھ کے ہیروں سے بھی تھی ان کے سخن کی آب و تاب
جانتا ہے جس کی وقعت کو یہاں ہر شیخ و شاب
شاعری زندہ تھی اب دنیا میں جس کے نام سے
آہ وہ تربت میں جا کر سو گئے آرام سے

اس کے بعد منشی محمدالدین فوق مرحوم نے ایک درد انگیز نظم سنائی جس کے چند شعر حسبِ ذیل ہیں :

یہاں تو جیتے ہیں اے دوست موت ہی کے لیے
وہ کون ہیں کہ جو مرتے ہیں زندگی کے لیے
دکن میں وقف رہا تاج و تختِ ملکِ سخن
ظہیر دہلوی یا داغ دہلوی کے لیے
ہزار حیف کہ اب وہ بھی چھن گئی ہم سے
بچی کھچی جو تھی عزت سخن وری کے لیے
جنابِ داغ تو برسوں سے خلد میں ہیں مکیں
ظہیر بھی اسی خاتم کے ہو گئے ہیں نگیں

اس کے بعد منشی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی مرحوم نے تین بند کی نظم سنائی :

چھوڑی نہ جان موت نے جسمِ ظہیر میں
لے دے کے رہ گیا تھا یہ اک دم اخیر میں
دلّی کی شاعری کا ہوا آج خاتمہ
چرچا یہ ہے ہر ایک صغیر و کبیر میں

استادِ بے نظیر تھا فنِ سخن میں وہ
ہم اس کے شعر پیش کریں گے نظیر میں

سب لوگ جانتے تھے انہیں یادگارِ ذوق
عالم میں مغتنم تھا بہت دم ظہیر کا
چھوڑا ذرا نہ مشغلۂ شعر و شاعری
پیری میں بھی رہا وہی دم خم ظہیر کا

باقی رہی نہ باغِ سخن میں بہارِ ذوق
اب وہ بھی چل بسا جو تھا اک یادگارِ ذوق

اس کے بعد خواجہ دل محمد مرحوم نے مندرجہ ذیل اشعار میں رنج و ملال کا اظہار کیا :

مکانِ دہر ہے عبرت کی جا مکینوں کو
کہ پیش ہے یہاں پستی بلند بینوں کو
نفس کی آمد و شد سے عیاں ہے ، گویا ہم
مکانِ عمر کے طے کر رہے ہیں زینوں کو
سفر ہے دُور کا اور خُو میں ان کی ہے آرام
اٹھاؤ کندھے پہ ان پالکی نشینوں کو

نہ بیچ جانِ سخن کے بلند بینوں کو
یہ آسمان پہ لے جاتے ہیں زمینوں کو

کلام چست ، معانی وہ دل نشیں گویا
جڑا ہے مُہرِ سخن میں کئی نگینوں کو
یہاں نہ قدرِ سخن ہو تو کیوں ظہیر نہ پھر
کلام جائیں سنانے لحد گزینوں کو

مراد ماتمِ استاد ذوق ہے اے دل!
جو رو رہے ہیں یہاں ان کے جانشینوں کو

آخر میں علامہ اقبال نے اپنے صدارتی خطبے میں ارشاد فرمایا :

”میں گزشتہ سال (۱۹۱۰ع میں) حیدرآباد دکن گیا تو یہ ضروری بات تھی کہ میں وہاں کے اہلِ کمال سے ملوں ۔ چنانچہ حافظ جلیل حسن صاحب جلیل (مانک پوری) کے ہاں میری دعوت ہوئی ۔ وہیں مولانا ظہیر بھی تشریف رکھتے تھے ۔ مولانا نے مجھ سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی مگر سنانے سے زیادہ مجھے خود یہ شوق تھا کہ مولانا کی زبان سے کوئی شعر سنوں ۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! جب تک میں پہلے آپ کی زبان سے شعر نہ سن لوں گا ، اپنا شعر ہرگز نہ سناؤں گا ۔ مولانا نے اس درخواست کو منظور فرمایا اور یہ شعر سنایا :

وہ جھوٹا عشق ہے جس میں فغاں ہو
وہ کچّی آگ ہے جس میں دھؤاں ہو

ایک آدھ شعر اور بھی سنایا تھا مگر وہ یاد نہیں رہا ۔ مولانا ظہیر اس وقت بہت ضعیف اور ناتواں تھے اور

آونچا سنتے تھے - ان کی ہستی تبرّک تھی -"

حضرت علامہ نے جلسے میں بیٹھے بیٹھے "زبدۂ عالم ظہیر دہلوی" سے مولانا کی تاریخِ وفات (۱۳۲۹ھ) بھی نکالی مگر وہ اس مادے کو نظم نہ کر سکے -[1]

مولانا ظہیر کی نرینہ اولاد کوئی نہ تھی - غزلوں کے چار دیوان ان کی یادگار ہیں - پہلا دیوان "گلستانِ سخن" مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا - بعد میں دو دیوان قاضی عبدالکریم کے مطبع کریمی بمبئی نے شائع کیے - چوتھا دیوان ظہیر کے نواسے میر اشتیاق حسین یا بشیر علی بشیر کے پاس تھا جو باوجود کوشش کے طبع نہ ہو سکا - اب معلوم نہیں کہیں محفوظ ہے یا ضائع ہو گیا -

مولانا ظہیر اپنے استاد ذوق کی طرح پُرگو شاعر تھے - وہ جس طرح علومِ ظاہری و باطنی میں کمال رکھتے تھے ، اسی طرح فنِ شعر میں بھی انھیں وہ مرتبہ حاصل تھا جو باکمال اساتذہ کا حصہ ہے - ایک مرتبہ ٹونک میں بناس ندی کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے - امیر مینائی کے شاگردوں میں سے خیرآباد کے خوش گو شاعر حضرت مضطر کے برادرِ کلاں جناب بسمل ان کے ساتھ تھے - انھوں نے اپنے استاد کا یہ شعر پڑھ کر اس کی نسبت آپ کی رائے دریافت کی :

کبابِ سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

۱- رسالہ اصلاحِ سخن ، لاہور ، جون ۱۹۱۱ع ، جلد ۲ ، صفحات ۱۴ - ۱۵ -

مولانا ظہیر نے فوراً جواب دیا کہ شعر بہت اچھا ہے اور جس نے کہا ہے، خوب کہا ہے۔ البتہ جیم کا اتصال ذرا غیرمانوس سا ہے۔ لیکن وہ اس طرح تبدیل ہو سکتا ہے کہ :

''جل اٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

غزل گوئی میں مولانا کو پورا عبور حاصل تھا ۔ مضامین کی نفاست اورخیالات کی تازگی قابلِ ستائش ہے۔ استعارہ اورتشبیہ اگرچہ بہت کم ہے لیکن جس قدر ہے خوب ہے ۔ معاملاتِ عشق خوب صفائی سے بیان کرتے ہیں ۔ ترکیب کی صفائی اور بندش کی چُستی بہت دلکش ہوتی ہے۔ سلاست میں اشکال پیدا کرنا مومن خاں مومن مرحوم کا حصہ تھا ، لیکن داغ کے بعد اشکال کو آسان طریقے سے بیان کرنا ظہیر ہی کو آتا تھا ۔ اشعار میں لوٹ پھیر یا دقّتِ معانی نہیں پائی جاتی ۔ غالباً اس کی وجہ رنگِ زمانہ ہے۔ معانی کی دقّت اور عربی فارسی کے غیرمانوس الفاظ سے اجتناب کر کے اُردو کو فصاحت اور سلاست کا مخزن بنا کر چھوڑا ہے ۔ آپ کے مندرجہ ذیل اشعار زبان زد عام ہیں :

چاہت کا جب مزہ ہے کہ وہ بھی ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

خوں بہائے عاشقِ ناشاد کیا
دلبروں کی داد کیا، فریاد کیا

نامرادی جس کی ٹھہری ہو مراد
وہ دلِ ناشاد ہو پھر شاد کیا

یہ سب کہنے کی باتیں، ہم ان کو چھوڑ بیٹھے ہیں
جب آنکھیں چار ہوتی ہیں، محبت آ ہی جاتی ہے

اگر منظور ہے ناصح جنوں کی چارہ فرمائی
ہمارے پیرہن میں ٹانک دے دامن بیاباں کا

جاتی ہے سوئے در جو نظر بار بار آج
کیونکر کہوں عدو کا نہیں انتظار آج

دیکھ کر نقشے کو اس کے بدحواسی چھا گئی
ہم گلے ملنے کو دوڑے پیکرِ تصویر سے

حسبِ خواہش گر خدا دیتا تو انسانِ حریص
حشر تک ہر شے یونہی نوبت بہ نوبت مانگتا
جس قدر ثروت بڑھی اتنی بڑھی حرص و ہوا
خوب تھا انساں اگر صبر و قناعت مانگتا

کچھ تو ہوتے ہی ہیں الفت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

خدا ملتا ہے ڈھونڈے سے اگر انسان جویا ہو
مگر ہاں آدمی کو آدمی مشکل سے ملتا ہے

نالوں کے جنازے تو اٹھے دل سے ہزاروں
کمبخت نکلتے کوئی ارماں نہیں دیکھا

جب زمیں پر پاؤں دھرنے کا سہارا ہوگیا
آدمی سمجھا فلک کا میں ہی تارا ہوگیا
مٹ گئے دنیا کے جھگڑے اک نگاہِ ناز میں
تم ہمارے ہو گئے ، عالم ہمارا ہو گیا
ناگوارِ خاطرِ رشک آفریں کیا کچھ نہ تھا
مختصر یہ ہے کہ اب سب کچھ گوارا ہوگیا
کیوں ظہیرِ خستہ جاں ! دیکھا محبت کا مزہ ؟
دو ہی دن میں کیا سے کیا عالم تمہارا ہوگیا[1]

یہ تو غزلوں کی کیفیت ہے ۔ علامہ اقبال کا کہنا ہے کہ ''ان کے قصائد کا دیوان بھی عمدہ ہے ۔'' دو ایک شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں :

ہوائے موسمِ باراں سے کچھ بعید نہیں
بنے جو خانۂ گلشن نگار خانۂ چیں

۱۔ خمخانۂ جاوید ، جلد پنجم ، صفحات ۳۸۰ - ۳۹۱ ۔

نسیم آیہٗ سبحان ربی الاعلیٰ
گلوں کے کان میں کرتی ہے صبحدم تلقیں

نسیم مست نکلتی ہے جوشِ مستی میں
لپٹ لپٹ کے جوانانِ باغ سے ہر بار

☆ ☆ ☆

۵ - ۶

نادر و نیرنگ

(۱۹۱۲ء — ۱۹۵۲ء)

شیخ عبدالقادر مرحوم کے رسالہ 'مخزن' لاہور کے ابتدائی دور میں جن ادبی شخصیتوں نے شہرت اور ناموری حاصل کی ، ان میں اقبال ، ہمایوں ، ناظر ، اعجاز ، یلدرم ، سرور جہان آبادی اور نگم کے ساتھ نادر کاکوری اور میر غلام بھیک نیرنگ انبالوی بھی شامل ہیں - اقبال نے اپنی ایک غزل میں مؤخّرالذکر دونوں حضرات کا نام نہایت محبت سے لیا ہے - یہ غزل ''خدنگِ نظر'' اگست ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی - اس کے چند شعر حسبِ ذیل ہیں :

پاس والوں کو تو آخر دیکھنا ہی تھا مجھے
نادرِ کاکوروی نے دور سے دیکھا مجھے

اے حبابِ بحر ! اے پروردۂ دامانِ موج !
کچھ پتا ملتا ہے تجھ سے اپنی ہستی کا مجھے

کیا کروں اے دل چمن آرائے عالم کا گلہ
ضبط کی طاقت نہ دی ، بخشا لبِ گویا مجھے

دل میں جو آتا ہے کہہ دوں گا کہ میں مجبور ہوں
کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، کچھ نہیں پروا مجھے

حالِ دل کس سے کہوں اے لذتِ افشائے راز
ایک بھی اس دیس میں محرم نہیں ملتا مجھے

رہتے ہیں بے درد میری چشمِ تر پر خندہ زن
اے دلِ درد آشنا تُو نے کیا رسوا مجھے

تر چلی آتی ہے کچھ صبحِ ازل سے اپنی آنکھ
جب سے روتا ہوں کہ آتا بھی نہ تھا رونا مجھے

یاد دنیا کی کہاں باقی ہے اے اہلِ عدم!
ہاں یونہی سا یاد ہے کچھ اپنا مر جانا مجھے

ہر کسی کو بزمِ ہستی میں ہے رونا موت کا
اور اس محفل میں رونا زندگانی کا مجھے

موت یہ میری نہیں میری اجل کی موت ہے
کیوں ڈروں اس سے کہ مر کر پھر نہیں مرنا مجھے

نادر و نیرنگ ہیں اقبال میرے ہم صفیر
ہے اسی تثلیث فی التوحید کا سودا مجھے

اس غزل کے کئی شعر اَور بھی ہیں جو "باقیاتِ اقبال[۱]" میں دیکھے جا سکتے ہیں مگر مجھے یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ اقبال کے یہ ممدوح کون تھے؟ کیا تھے؟ اور اقبال ان کو اپنا ہمدم و دمساز اور ہم آواز کس بِنا پر کہتے تھے؟

۱۔ باقیاتِ اقبال، مرتّبہ سید عبدالواحد معینی و محمد عبداللہ قریشی، صفحات ۳۱۷-۳۱۹۔

نادر کاکوروی

نادر کا پورا نام شیخ نادر علی تھا ۔ وہ کاکوری کے مشہور عباسی خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔ ۱۸۶۷ع میں پیدا ہوئے ۔ اُن کے والد کا نام شیخ حامد علی اور دادا کا شیخ طالب علی تھا ۔ نادر کے ذاتی حالات بہت کم ملتے ہیں ۔ دنیا نے بھی اُنھیں فراموش کر دیا ہے ۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا انتقال ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۲ع کو عین جوانی کے عالم میں ہوا اور لوگوں نے ان کی ذات سے جو اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ یک دم خاک میں مل گئیں ۔ مگر نادر ساری عمر اس بات کے گلہ مند رہے کہ اُنھیں سازگار ماحول میسّر نہ آیا ، کوئی قدردانِ سخن نہ مل سکا :

نادر افسوس ! قدردانِ سخن
ایک ہندوستان میں نہ رہا

نہ وہ کسی سے کچھ کہہ سکے ، نہ کوئی ان کی بات سمجھ سکا :

پھیر لیتا ہے مکدّر ہو کے منہ ، جس سے کہیں
ہائے جو جی پر گزرتی ہے ، وہ ہم کس سے کہیں
نادر اس محفل میں ہیں وہ نام کے صدر انجمن
آپ کو کہنا ہو جو کچھ اہلِ مجلس سے کہیں

میں سمجھا تھا مرے حق میں دعائے خیر کرتے ہو
مجھے تم کوستے ہو ہمدمو ! اندھیر کرتے ہو

دراصل وہ زمانہ ایسا تھا کہ ہندوستان میں ہنر کا قدردان ہی کوئی

نہ تھا اور اگر تھا بھی تو اپنے فرائض سے غافل تھا ۔ اقبال بھی انھی حالات سے گزر رہے تھے ۔ وہ خود کہتے ہیں :

”میں تو بسا اوقات قحطِ خریدار سے تنگ آ جاتا ہوں :

ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

میں تو اپنا سامان یعنی قاش ہائے دلِ صد پارہ ایسے وقت بلزار میں لے کر آیا جب سوداگروں کا قافلہ رخصت ہو چکا تھا ۔“[۱]

اس لحاظ سے دونوں شاعر ایک ہی کشتی میں سوار تھے ۔ ان کی سوچ کے دھارے بھی یکساں ہی تھے ۔ چنانچہ نادر نے اپنی نظم ”شاعری[۲]“ میں ایک شعر یوں کہا ہے :

تُو مرے قابل نہیں ہے ، میں ترے قابل نہیں
مجھ کو جو سامان ہیں درکار ، وہ حاصل نہیں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پہلا مصرع یا تو اقبال کے ایک مصرع سے ٹکرا گیا ہے یا تضمین کیا گیا ہے ۔ اقبال نے اپنی نظم ”رخصت اے بزمِ جہاں[۳]“ میں یوں کہا ہے :

رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں
آہ ! اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں

۱۔ صحیفہ ، لاہور ، اقبال نمبر ، حصہ اول ، ص ۱۱۰ ۔
۲۔ جذباتِ نادر ، مطبوعہ کراچی ، ص ۱۳۶ ۔
۳۔ بانگِ درا ، ص ۵۶ ۔

بسکہ میں افسردہ دل ہوں ، درخورِ محفل نہیں
تو مرے قابل نہیں ہے ، میں ترے قابل نہیں

نادر کو البتہ اس بات کا افسوس ہے کہ وہ قوم کو کوئی پیغام نہ دے سکے - فرماتے ہیں :

شکایت کر کے غصہ اور ان کا تیز کرنا ہے
ابھی تو گفتگوئے مصلحت آمیز کرنا ہے
یہ دنیا جائے آسائش نہیں ہے ، آزمائش ہے
یہاں جو سختیاں تجھ پر بڑیں انگیز کرنا ہے
غزل خوانی کو تو اس بزم میں آیا نہیں نادر
تجھے یاں وعظ کہنا ، بندِ سود آمیز کرنا ہے

اگر موت انھیں مہلت دیتی تو شاید وہ دنیا کو کوئی سود مند پیغام دے جاتے ، مگر اب تو ان کے ذاتی جوہر ہی نہیں پہچانے جا سکے اور دنیا نے بھی انھیں وہ کچھ نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے - لے دے کے ایک اقبال تھے جن کو وہ اپنا رازِ دل بتا سکتے تھے - انھی کی طرف وہ نظریں اٹھا اٹھا کے دیکھتے تھے اور کبھی کبھی ان کی آواز میں آواز بھی ملاتے تھے - چنانچہ اقبال کی نظم ''شمع'' دسمبر ۱۹۰۲ع کے 'مخزن' میں شائع ہوئی جو اس طرح شروع ہوتی ہے :

بزمِ جہاں میں میں بھی ہوں اے شمع ! دردمند
فریاد درگرہ صفتِ دانۂ سپند
دی عشق نے حرارتِ سوزِ دروں تجھے
اور گل فروشِ اشکِ شفق گوں کیا مجھے

ہو شمعِ بزمِ عیش کہ شمعِ مزار تو
ہر حال اشکِ غم سے رہی ہم کنار تو

تو اس سے متاثر ہوکر نادر کاکوروی نے نظم ''شمع مزار[۱]'' لکھی جو ''خدنگِ نظر'' میں ماہِ جنوری ۱۹۰۳ع میں شائع ہوئی ۔ اس میں نادر نے بھی اپنے آپ کو اقبال کی طرح دردمند ظاہر کیا ہے :

بیٹھی ہے کس سکوت میں شمعِ مزار تو ؟
اے شمع کس شہید کی ہے تکیہ دار تو ؟
کیا تیرا دل بھی میری طرح دردمند ہے ؟
تجھ کو بھی کنجِ شامِ غریبی پسند ہے ؟
اس تیرہ روزگار و پُرآشوب دور میں
دو تیرے دردمند ہیں اقبال اور میں

اس میں کوئی شک نہیں کہ نادر کی شاعری کی عمر بہت کم رہی کیونکہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۲ع کو پینتالیس برس کے سن میں ان کا انتقال ہوگیا ، لیکن وہ اپنے زمانے کے اچھے پڑھے لکھے ، باوضع ، نیک نہاد ، شگفتہ مزاج ، ملنسار اور محبِ قوم و وطن انسان تھے ۔[۲] انگریزی زبان و ادب کے رموز و نکات سے خوب واقف تھے ۔ انھوں نے لارڈ بائرن اور سر ٹامس مور کی بعض انگریزی نظموں کے نہایت لاجواب منظوم ترجمے کیے ۔ طبعِ خداداد کے جوہر بھی دکھائے اور نیچر کی شاعری کے کئی قابلِ قدر نمونے بھی یادگار چھوڑے ۔

۱۔ جذباتِ نادر ، صفحات ۹۱ - ۹۴ ۔
۲۔ جذباتِ نادر ، مطبوعہ اُردو اکیڈمی سندھ ، کراچی ۔

ان کی شاعری میں بلا کی سادگی اور پُرکاری ہے۔ غرض :

اس خرابے سے کوئی گزرا ہے نادر نام بھی
جابجا دیوار پر اشعار ہیں لکھے ہوئے

نادر اپنی رفیقۂ حیات کے انتقال کے بعد اکثر رنجور و مغموم رہتے تھے۔ اس زمانے کے کلام میں حقائقِ حیات اور درد و سوز کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ان کے وارداتِ قلبی کا حقیقی عکس ہیں :

نوا سنجی کو کیا کچھ بلبلیں اس باغ میں کم تھیں
مجھے تکلیف ناحق دی چمن پیرائے عالم نے

اے چارہ گر ! دوا کر ، سودا تجھے ہوا ہے
مجھ کو سنبھالتا ہے ، اب مجھ میں کیا رہا ہے
دل ہے مگر کہاں اب اس میں ہجومِ ارماں
گھر رہ گیا ہے لیکن اُجڑا ہوا پڑا ہے

اب نہ حسرت ، نہ یاس ہے دل میں
کوئی بھی اس مکان میں نہ رہا
کیا شکایت جو کٹ گئے گاہک
مال ہی جب دکان میں نہ رہا
مر کے رہنا پڑا اب اس میں آہ !
جیتے جی جس مکان میں نہ رہا

وفات سے کچھ دن قبل مرضِ خناق میں مبتلا ہوگئے تھے۔ لکھنؤ کے مشہور ڈاکٹروں سے مشورہ کیا مگر کوئی علاج پوری طرح سودمند نہ ہوا۔ آخر حافظ عبدالکریم سب اسسٹنٹ سرجن ملیح آباد نے آپریشن کیا۔ گردن پر نشتر سے شگاف کیا جا چکا تھا مگر نادر کے حوصلے اور ضبط کی کیفیت یہ تھی کہ اس وقت بھی اپنے دکھ درد سے بے نیاز فکرِ سخن میں محو تھے۔ آپریشن کے بعد اپنے ہم وطن دوست مولانا صفیر بلگرامی کو اپنے حال کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا :

ہوتے ہیں بیمار سب ، پر تم نے سادھی ایسی چُپ
حال بھی کہتے نہیں نادر! تم اپنا صاف صاف
ہائے میں کم بخت حال اپنا کہوں تو کیا کہوں
ایک زخم اندر گلے کے ، اور اک باہر شگاف

نزع کی شب نادر کے چھوٹے بھائی مولوی شاکر علی نے، جو ان کی تیمارداری کر رہے تھے ، ایک مصرع پڑھا :

قفس میں مرغِ بسمل یوں تڑپنے کا مزا کیا ہے ؟

نادر نے سنتے ہی فی البدیہہ مصرعِ ثانی کہہ کے شعر مکمل کر دیا :

قفس میں مرغِ بسمل یوں تڑپنے کا مزا کیا ہے ؟
نکل جانِ حزیں ، اس جسمِ خاکی میں دھرا کیا ہے

نادر نے آزاد اور حالی کے لگائے ہوئے نظمِ جدید کے پودے کی خونِ دل سے آبیاری کی اور مغربی خیالات اور انگریزی زبان کی لطافتوں کو نہایت سلیقے اور ہنرمندی سے اردو میں سمونے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کی بعض نظمیں بہت مقبول ہوئیں ؛ مثلاً رات کے

بے چین لمحے ، اے ہمصفیر میرے سینے میں دل نہیں ہے ، اکثر شبِ تنہائی میں ، بوڑھے دنیا پرست کی موت ، حسن و عشق ، شمع و پروانہ ، شعاعِ آمید ، پیکرِ زبان ، فلسفۂ شاعری ، سیرِ دریا وغیرہ ۔

ان کے کلام کا مجموعہ ''جذباتِ نادر'' کے نام سے دو حصوں میں شائع ہو چکا ہے ۔ سر ٹامس مور کی مشہور کتاب ''لائٹ آف دی حرم'' کی طرز پر ایک مثنوی بھی لکھی تھی جس کا نام انھوں نے ''لالہ رخ'' رکھا تھا ۔ یہ بھی اب ''جذباتِ نادر'' میں شامل ہے ۔ اتنا کچھ کہنے کے باوجود ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی ۔ اس کو اگر کسی نے پہچانا تو وہ صرف اقبال کا دلِ دردمند اور ذوقِ آشنائی تھا ۔ اقبال نے انھیں اپنا ''ہم سخن'' اور ''ہم صفیر'' کہہ کر ''تثلیث فی التوحید'' میں شامل کیا ۔ گویا اقبال کے نزدیک نادر اور نیرنگ شاعری میں انھی کے خاندان کے فرد تھے :

نادر و نیرنگ ہیں اقبال میرے ہم صفیر
ہے اسی تثلیث فی التوحید کا سودا مجھے

ہو نہیں سکتا کہ یہ محبّت اور قدر افزائی یک طرفہ ہو اور ان ہم آوازوں میں دلوں کا تبادلہ نہ ہوتا ہو ۔ میر غلام بھیک نیرنگ کے نام تو اقبال کے چند خطوط مل بھی جاتے ہیں مگر افسوس ! کہ نادر کے نام اقبال کا کوئی خط ہم تک نہیں پہنچ سکا ۔ بہرحال یہ تو اقبال کے شعر ہی سے ظاہر ہے کہ نادر کاکوروی نہایت اخلاص اور عقیدت کے ساتھ اقبال کو دُور ہی سے دیکھتے رہے اور ملنے کی

حسرت اپنے ساتھ قبر ہی میں لے گئے:

پاس والوں کو تو آخر دیکھنا ہی تنہا مجھے
نادرِ کاکوروی نے دُور سے دیکھا مجھے

میر غلام بھیک نیرنگ

میر غلام بھیک نیرنگ دورانہ ضلع انبالہ کے ایک کھاتے پیتے سیّد گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور شاعری میں داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ اس رشتے سے اقبال کو بہت عزیز تھے۔ وہ ۱۸۷۵ع میں پیدا ہوئے۔ تعلیم گورنمنٹ کالج اور لاء کالج لاہور سے حاصل کی اور اپنی ہمہ گیر طبیعت کے ساتھ ہر ادبی اور قومی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ نہایت اچھے ادیب، شاعر اور نقّاد تھے۔ غزل، نظم اور تقریر ہر شے پر قادر تھے۔ لاہور کے قدیم مشاعروں میں، جو بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں حکیم امین الدین بیرسٹر اور حکیم شہبازالدین کے مکان پر منعقد ہوتے تھے، یہ اقبال کے ساتھ شریک ہو کر دادِ سخن دیتے تھے۔ حسنِ اتفاق سے جس سال نیرنگ انبالہ سے میٹرک کے امتحان میں اول آ کر گورنمنٹ کالج لاہور کی سالِ اول کی کلاس میں داخل ہوئے، اسی سال (۱۸۹۵ع میں) اقبال نے سیالکوٹ سے لاہور آ کر سالِ سوم میں داخلہ لیا۔ سیالکوٹ کے چودھری جلال الدین کے ذریعے، جو نیرنگ کے ہم جماعت تھے، اقبال اور نیرنگ ایک دوسرے کے نام سے واقف ہو کر ملنے کے آرزومند ہوئے۔ اوّل اوّل طبیعتوں کا اندازہ لگانے کے لیے نمونے کے اشعار کا تبادلہ ہوا۔ اقبال نے اٹھارہ انیس شعر کی ایک غزل

نیرنگ کو بھیجی ، جس کے چند شعر حسبِ ذیل ہیں :

برسرِ زینت جو شمعِ محفلِ جانانہ ہے
شانہ اس کی زلفِ پیچاں کا پرِ پروانہ ہے

شکوۂ جور و جفا سے باز آ جاتے ہیں ہم
کیوں صفِ محشر میں حالت تیری بے تابانہ ہے

اللہ اللہ ! دیدۂ واعظ میں آڑ کر جا پڑی
پردہ دارِ میکشاں خاکِ درِ میخانہ ہے

میری باری پر گرا ہے دیکھ تو جذبِ شکست
ساقیا ! توبہ سے پہلے ٹوٹتا پیمانہ ہے

پائے ساقی پر گرایا جب گرایا ہے مجھے
چال سے خالی کہاں یہ لغزشِ مستانہ ہے

دیکھ ! مغرب کی طرف سے جھومتا آتا ہے کیا
ساقیا ! بادل نہیں ، آڑتا ہوا میخانہ ہے

خانہ بربادی کے صدقے ، سوئے صحرا جائیں کیوں
خیر سے گھر ہی ہمارا رشکِ صد ویرانہ ہے

سخت جاں شرمندۂ شوقِ شہادت کیوں نہ ہو
تیغ میں بل پڑ گیا ، قاتل کو دردِ شانہ ہے

حضرتِ ناصح کو اس محفل میں لے جا کر کہا
ہاں بتا ، اب میں ہوں دیوانہ کہ تو دیوانہ ہے

تیری محفل میں کبھی چلتا ، کبھی رکتا ہے یہ
ذکر بھی میرا مگر میری طرح دیوانہ ہے

آڑ کے اے اقبال ! سوئے بزم یثرب جائے گا
روح کا طائر عرب کی شمع کا پروانہ ہے[1]

یہ غزل دیکھ کر میر نیرنگ کہتے ہیں :

''جب میں نے یہ غزل دیکھی ، تو میری آنکھیں کھل گئیں ۔ میں نے اس وقت تک اہلِ پنجاب کی اردو شاعری کے جو نمونے دیکھے تھے ، ان کو دیکھ کر میں اہلِ پنجاب کی اردو گوئی کا معتقد نہ تھا ۔ مگر اقبال کی اس غزل کو دیکھ کر میں نے اپنی رائے بدل لی اور مجھ کو معلوم ہوگیا کہ ذوقِ سخن کا اجارہ کسی خطۂ زمین کو نہیں دیا گیا ۔ جب بندشوں کی ایسی چستی ، کلام کی ایسی روانی اور مضامین کی یہ شوخی ایک طالب علم کے کلام میں ہے ، تو خدا جانے اسی پنجاب میں کتنے چھپے رستم پڑے ہوں گے ، جن کا حال ہم کو معلوم نہیں ۔ خیر اَوروں کو چھوڑیے ، اقبال کا تو میں قائل ہو ہی گیا ۔''[2]

اقبال نے نیرنگ کی طبیعت کا اندازہ لگانے کے لیے ان کا کلام دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ۔ اُنھوں نے اپنے اشعار کا جو نمونہ بھیجا ، اس میں سے صرف یہ شعر نیرنگ کو بعد میں یاد

۱۔ اقبال کے بعض حالات ، از میر غلام بھیک نیرنگ ، مطبوعہ مجلہ ''اقبال'' لاہور ، اکتوبر ۱۹۵۷ع ۔ روزگار فقیر ، صفحات ۲۵۰ - ۲۵۳ ۔
۲۔ مجلہ ''اقبال'' ، اکتوبر ۱۹۵۷ع ، ص ۳ ۔

رہ گیا :

حرم کو جانا جنابِ زاہد ! یہ ساری ظاہر پرستیاں ہیں
میں اس کی رندی کو مانتا ہوں جو کام لے دیر سے حرم کا

یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ نیرنگ کے اشعار دیکھ کر اقبال نے کیا رائے قائم کی ، مگر بعد کے خصوصی تعلقات کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ذوق و مشرب کی یگانگی کے باعث ایک دوسرے کی طبیعتیں مل گئیں اور ایک ایسی مستحکم اور پائدار دوستی قائم ہو گئی جسے لیل و نہار کی کوئی گردش بھی متزلزل نہ کر سکی ۔

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم مدیرِ "ادبی دنیا" کے بڑے بھائی مولوی ضیاء الدین احمد سے اقبال اور نیرنگ دونوں کے گھرے مراسم تھے - ۱۸۹۹ء میں جب میر نیرنگ لاء کالج میں داخل ہوئے تو کچھ عرصہ گمٹی بازار کے قریب کوچہ ہنوسان میں واقع انھی کے مکان میں مقیم رہے ۔ اس وسیع مکان کے ایک کونے میں اکھاڑہ تھا جہاں بقول سر عبدالقادر مرحوم اقبال اور میر نیرنگ لنگوٹ باندھ کر کبھی کبھی کُشتی لڑا کرتے تھے ۔[1]

ذہنی ورزش کے لیے اقبال اور نیرنگ ایک ہی زمین میں ایک ساتھ طبع آزمائی بھی کیا کرتے تھے تاکہ دیکھیں کہ کون کتنے پانی میں ہے - ۱۹۰۳ء کی ایک مشق کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں ۔

۱- چند یادیں چند تاثرات ، از عاشق حسین بٹالوی ، طبع ۱۹۶۹ء ، ص ۵۵ -

میر نیرنگ کہتے ہیں :

یہ شایاں ہے عاشق کا دستور رہنا
ترے جور سہہ کر بھی مسرور رہنا

غضب ہے رقیبوں سے لگ لگ کے چلنا
مگر ہم غریبوں سے یوں دور رہنا

بقا بعدِ مردن اگر ہے تو یہ ہے
ہمیشہ زمانے میں مشہور رہنا

وہ قسمیں کہ ان سے ملیں گے نہ ہرگز
مگر دل کے ہاتھوں سے مجبور رہنا

ستم ہے ہمارے ہی دل میں سمانا
ہماری ہی آنکھوں سے مستور رہنا

تری مست آنکھوں سے سیکھا ہے میں نے
شرابِ تخیّل سے مخمور رہنا

جلانے کو لایا ہوں میں رختِ ہستی
خبردار او شعلۂ طور! رہنا

بنا دے اسے غیرتِ قصرِ جنّت
مرے دل میں اے غیرتِ حور رہنا

جو ان سے ملو گے تو جھینکو گے نیرنگ
بتوں سے ذرا دور سے دور رہنا!

١- ہفتہ وار ''پنجۂ فولاد'' لاہور ، ٣ اکتوبر ١٩٠٣ء -

اقبال فرماتے ہیں :

عبادت میں زاہد کو مسرور رہنا
مجھے پی کے تھوڑی سی مخمور رہنا

دمِ آفرینش ہدایت تھی دل کو
کلیمِ تماشائے ہر طُور رہنا

مقدّر کی تقسیم ہوتی تھی جس دم
پسند آ گیا دل کو مجبور رہنا

سکھائی ہے کس نے تمھیں بے حجابی
حسینوں کا شیوہ ہے مستور رہنا

عجب شیوۂ عاشقی ہے جہاں میں
نہ معذور رکھنا ، نہ معذور رہنا

تمھیں کیا بتائیں محبت ہے کیا شے
یہ ہے دل کے ہاتھوں سے مجبور رہنا

دکھاوے کی بے اعتنائی کے صدقے
بڑے کام آیا مجھے دُور رہنا

نبھائیں گے کیا ایک سے وہ محبّت
جنھیں ہر نظر میں ہو منظور رہنا

نہیں عشق بازی یہ زاہد تو کیا ہے
اسیرِ خمِ گیسوئے حُور رہنا

کوئی چال اس خاکساری میں ہوگی
تمھاری تو عادت تھی مغرور رہنا

نہ میں تم کو دیکھوں ، نہ اغیار دیکھیں
مری آنکھ میں صورتِ نور رہنا

نہ ہو جن کی آنکھوں میں تابِ نظارا
بھلا ان غریبوں سے کیا دور رہنا

وہ سوز ساز اقبال پر کر رہے ہیں
زمانے میں ہے ان کو مشہور رہنا[1]

اقبال کی اس غزل پر اس زمانے کے بعض اخباروں میں کچھ اعتراضات شائع ہوئے جن کا جواب بھی چھپا ، مگر اقبال نے اس غزل کو اپنے کلام سے خارج کر دیا ۔ اقبال اور نیرنگ کی چند اور ہم طرح غزلیں بھی اس زمانے کے رسالوں میں دیکھی جا سکتی ہیں ۔

میر نیرنگ ادب و شعر کے بہت اچھے نقّاد تھے ۔ ان کی تنقیدوں سے 'مخزن' کو بہت فائدہ پہنچا ۔ اقبال کی شاعری کے اولین دور میں جب اہلِ زبان ان کو نئے رنگ میں ابھرتا دیکھ کر ان کے منہ آتے ، ان کے کلام میں مین میخ نکالتے ، زبان کی خامیوں پر نکتہ چینی کرتے اور محاورے کی غلطیوں کو اچھال اچھال کر خوش ہوتے تھے ، تو میر نیرنگ ہی "انبالوی" کے قلمی نام سے اقبال کی حمایت میں ان کا منہ توڑ جواب دیتے تھے ۔ اقبال کو ان تنقیدوں کی روشنی میں تحقیقِ زبان و محاورہ کا موقع ملتا تھا ۔ کبھی

۱۔ بہارِ گلشن ، جلد دوم ، مرتّبہ منشی محمد الدین فوق ۔ "مخزن" لاہور ، اگست ۱۹۰۳ع ۔ باقیاتِ اقبال ، طبع دوم ، ۱۹۶۹ع ، صفحات ۳۲۱ - ۳۲۲ ۔ روزگارِ فقیر ، مرتّبہ فقیر سید وحید الدین ، جلد دوم (۱۹۶۴ع) ، ص ۲۵۰ ۔

کبھی خود بھی اس بحث میں حصہ لیتے تھے ۔ اس قسم کے چند مضامین اس دور کے 'مخزن' اور دوسرے پرچوں میں موجود ہیں ۔ اقبال اپنے عیب چینوں کو مخاطب کر کے کہتے تھے :

بُرا سمجھوں انھیں ، مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

تمام مضمون مرے پرانے ، کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جُو کا

میر نیرنگ نے ۱۹۰۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے انبالے میں پریکٹس شروع کی اور بہت جلد چوٹی کے وکلا میں شمار ہونے لگے ۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک سرکاری وکیل بھی رہے ، مگر بعد میں ملازمت چھوڑ کر پھر پریکٹس کرنے لگے ۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی تعلیمی ، اصلاحی اور اسلامی انجمنوں کے صدر اور سیکریٹری کے فرائض بھی انجام دیے ۔ انھوں نے اپنے اندر ملت کے اتنے دکھ سمیٹ لیے تھے کہ ان کے وجود کو ملّی جد و جہد کے حوالے کے بغیر دیکھا ہی نہیں جا سکتا ۔

۱۹۰۵ء میں جب اقبال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگستان تشریف لے جا رہے تھے تو نیرنگ انھیں الوداع کہنے دہلی تک گئے تھے ۔ پھر ۱۹۰۸ء میں جب اقبال پی ایچ ۔ ڈی اور بیرسٹری کی سند لے کر کامیاب و کامران وطن لوٹے تو میر نیرنگ انبالے سے ان کے استقبال کو دہلی پہنچے ۔ ریل گاڑی میں بیٹھے بیٹھے چند شعر[1]

۱۔ مخزن ، لاہور ، اگست ۱۹۰۸ء ۔

ہوگئے جو انھوں نے ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء کو درگاہ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء قدس سرہ' میں احباب کی ایسی مجلس میں پڑھ کر سنائے جس میں خواجہ حسن نظامی، شیخ عبدالقادر مدیرِ 'مخزن'، شیخ محمد اکرام جائنٹ ایڈیٹر 'مخزن'، مولانا راشد الخیری اور سید جالب دہلوی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:

فصلِ بہار آئی پھر گلشنِ سخن میں
اک جشن ہو رہا ہے مرغانِ نغمہ زن میں

وہ مژدۂ مسرت لائی صبا چمن میں
پھولے نہیں سماتے پھول اپنے پیرہن میں

گلشن کے سبز پوشو! جھٹ پٹ سنگار کرلو
عطرِ عروس مل دو پھولوں کے پیرہن میں

ہاں ہو نئی ادا سے سنبل کی کنگھی چوٹی
نرگس لگائے سرمہ چشمانِ سحر فن میں

غنچوں کو حکم دے دو دیں دادِ کجکلاہی
تیکھی ادائیں نکلیں نسرین و نسترن میں

ہر غنچہ مسکرائے، ہر پھول کھلکھلائے
ہر برگ لہلہائے، رونق رہے چمن میں

ہو اہتمام ایسا آرائشِ چمن کا
باقی رہے دقیقہ کوئی نہ بانکپن میں

سروِ سہی سے کہہ دو ناچے ذرا لبِ جو
قمری ترانہ گائے، جلسہ اڑے چمن میں

یورپ کی سیر کر کے اقبال واپس آئے
خوشیاں منائیں مل کر اہلِ وطن وطن میں
ہے آمدِ مسرت ، اقبال ! تیری آمد
خوشیاں ہیں اہلِ دل میں ، عیدیں ہیں اہلِ فن میں
سر آنکھوں پر بٹھایا یورپ میں تجھ کو سب نے
غربت میں بھی رہا تُو گویا سدا وطن میں
پھر تیرے دم سے ہوں گے تازہ سخن کے چرچے
پھر رونقیں رہیں گی یاروں کی انجمن میں

یہ نظم جس زمین میں کہی گئی ہے ، وہ اقبال کی نہایت پسندیدہ زمینوں میں سے ایک ہے ۔ بالکل اسی آہنگ ، اسی بحر اور اسی قافیے میں اقبال کی دو نہایت پیاری نظمیں پہلے سے موجود تھیں ۔ ایک کا نام ''جگنو[1]'' ہے اور دوسری کا ''سلیمیٰ[2]'' ۔ ''جگنو'' کے پہلے بند کے کچھ شعر یوں ہیں :

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا ؟
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں ؟

۱۔ بانگِ درا ، ص ۸۳ ۔
۲۔ بانگِ درا ، ص ۱۲۷ ۔

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے ، آیا کبھی گہن میں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم کہہ چکنے کے بعد بھی شاعر کا جذبہ پوری طرح مطمئن نہ ہوا اس لیے دوسری نظم کہی۔ "سلیمٰی" کے یہ شعر بھی دیکھیے:

جس کی نمود دیکھی چشمِ ستارہ بیں میں
خورشید میں ، قمر میں ، تاروں کی انجمن میں
صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدے میں پایا
شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
جس کی چمک ہے پیدا ، جس کی مہک ہویدا
شبنم کے موتیوں میں ، پھولوں کے پیرہن میں
صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر
ہنگامہ جس کے دم سے کاشانۂ چمن میں

ممکن ہے نیرنگ کو بھی یہ آہنگ پسند ہو اور انھوں نے اپنی نظم کے لیے اسے چُن لیا ہو۔ اور اگر یہ بات نہ بھی ہو اور انھوں نے غیر ارادی طور پر اس زمین کو سیراب کیا ہو ، تب بھی یہ دونوں کے مزاج اور مذاق کی وحدت کی ایک اَور مثبت دلیل ہے۔

اقبال نے لاہور آ کر بیرسٹری کا کام شروع کیا تو میر صاحب ان سے ملنے یہاں تشریف لائے۔ اس پہلی ملاقات کی کیفیت خود میر صاحبؒ کی زبانی سنیے:

''یورپ سے ان کی واپسی کے بعد ان سے میری پہلی ملاقات لاہور میں ہوئی۔ محرّم کی تعطیل تھی۔ میں انھی سے

ملنے کی غرض سے لاہور گیا تھا۔ انھوں نے اپنے قیام کے لیے چنگڑ محلے میں مکان لیا تھا۔ میں دن کے وقت لاہور پہنچا اور سیدھا ان کے ہاں گیا۔ ملازموں نے میری پذیرائی کی مگر معلوم ہوا کہ اقبال کہیں گھومنے گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ خدا کا شکر ہے اقبال نے بھی گھر سے نکلنا سیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آئے تو میں نے دیکھا کہ نہایت نستعلیق سوٹ پہنے ہوئے ہیں۔ میں نے دوسرا شکر ادا کیا کہ اقبال نے لباس پہننا سیکھا۔ (اس سے پیشتر وہ لباس کے بارے میں صرف سادہ ہی نہیں بلکہ لاپروا تھے)۔ خیر گلے ملے، مزاج پُرسی ہوئی۔ اس کے بعد وہ سوٹ اتر گیا۔ وہی ہمیشہ کا تہبند بندھ گیا، وہی بنیان بدن پر رہ گیا، وہی کمبل شانوں پر سوار ہو گیا۔ ہم نفس (حقّہ) حاضر ہو گیا۔ میں اور اقبال پہلے کی طرح فرش پر بیٹھ گئے۔ دنیا بھر کی باتیں چھڑ گئیں اور ہوتی رہیں۔ میرے قیام کے تین دن اسی ہیئتِ کذائی سے گزر گئے۔ کہاں اقبال اور کہاں گھر سے نکلنا اور کس کا سوٹ۔ یورپ ہو آئے، دماغ کو گوناگوں فضائلِ علمی سے آراستہ کر لائے، سینے کو طرح طرح کی اُمنگوں اور عزائم سے بھر لائے مگر رندی اور قلندری میں فرق نہ آیا۔ تین دن کی شبانہ روز صحبت کے بعد میں رخصت ہو کر انبالہ چلا آیا"۔[۱]

۱۔ مجلّہ اقبال، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۸ء، ص ۱۳۔ چند تاثرات چند یادیں از عاشق حسین بٹالوی، طبع لاہور ۱۹۶۹ء، صفحات ۱۵۳ - ۱۵۴ -

اس کے بعد بھی اقبال اور نیرنگ ایک دوسرے سے وقتاً فوقتاً ملتے رہے ۔ کبھی کبھی خط و کتابت بھی ہو جاتی تھی ۔ میر نیرنگ کے نام اقبال کے چند خط ''اقبالنامہ'' مرتبہٴ شیخ عطاء اللہ میں موجود ہیں ۔ یہ اس زمانے کے ہیں جب ہندوؤں نے ملکانہ راجپوتوں میں شدھی اور سنگھٹن کی تحریک چلائی اور ریاست الور نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کیا ۔ میر نیرنگ نے انبالے میں مرکزی جمعیّتِ تبلیغ الاسلام قائم کی اور مبلّغوں کی ایک بڑی جماعت تیار کر کے آگرہ ، متھرا ، بھرت پور اور ایٹا وغیرہ شدھی زدہ علاقوں میں بھیجی اور خود بھی تمام ہندوستان کا تبلیغی دورہ کیا ۔ اس زمانے میں دیکھنے والوں نے انھیں نورانی صورت اور بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ ہر وقت تسبیح و تہلیل میں مصروف دیکھا ۔ یہ زمانہ ان کی طبیعت کے انتہائی گداز کا زمانہ تھا اور آنسوؤں کا تو شمار نہیں ہو سکتا جو رقّت و جوش کے اس زمانے میں ان کی آنکھوں نے بہائے ۔ وہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کی فکر میں غلطاں رہتے تھے اور جو کچھ ان کے امکان میں تھا ، کر گزرتے تھے ۔[1] اقبال بھی اس سلسلے میں نہایت مفید مشورے دیتے تھے ۔ اقبال کے یہ تاثرات اسی دورِ پرفتن کی یادگار ہیں :

گر فلک در الور اندازد ترا
اے کہ می داری تمیزِ خوب و زشت
گوئمت در مصرعہٴ برجستہٴ
آنکہ برقرطاسِ دل باید نوشت

۱- روزنامہ ''آفاق'' لاہور ، ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۳ع -
روزگارِ فقیر ، جلد دوم ، صفحات ۲۳۲ - ۲۳۳ -

آدمیتّ در زمین او مجو!
آسماں ایں دانہ در الور نہ کشت
کشت اگر زآب و ھوا خر رستہ است
زانکہ خاکش را خرے آمد سرشت

۲۰ جنوری ۱۹۲۷ء کو اقبال نے میر نیرنگ کو لکھا کہ چند احباب کی تجویز ہے کہ آیندہ سال لاہور میں یورپین مسلمانوں کی ایک کانفرنس کی جائے جس کا خرچ قریباً تیس ہزار روپے ہو گا۔ آپ کی جمعیّت اس میں کیا مدد کر سکے گی؟ میر صاحب نے جواب دیا کہ ارادہ بہت اچھا ہے لیکن روپے کا انتظام ضروری ہے۔ مناسب ہو کہ کسی بڑے آدمی کو صدر بنایا جائے اور اس سے رقم وصول کی جائے۔ پروپیگنڈہ آپ کے نام سے میں کر لوں گا۔ اس خط کے جواب میں ۲۴ جنوری ۱۹۲۷ء کو اقبال نے لکھا:

"چندہ اس کانفرس کے لیے انشاء اللہ ہو جائے گا۔ بڑے آدمیوں کی منّت نہ کرنی پڑے گی۔ فی الحال تین آدمیوں نے آٹھ ہزار روپیہ جمع کر دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ باقی روپیہ بھی اس غرض کے لیے عام مسلمان دینے کو تیار ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ رقم مطلوبہ کا بہت بڑا حصہ غالباً لاہور ہی سے جمع کر لوں گا۔ بلکہ میرا ارادہ یہ ہے کہ جب تک رقم مطلوبہ کے وعدے پرائیویٹ طور پر نہ ہو جائیں اس کانفرنس کے متعلق کوئی اعلان نہ کیا جائے۔ یورپ اور امریکہ سے کم از کم آٹھ دس آدمیوں کو دعوت دی جائے گی۔ باقی جو مسلمان یورپین ہندوستان میں موجود

ہیں ، ان کی فہرست تیار کی جائے گی ۔ آپ فی الحال اس فہرست کی تیاری میں مدد دیں اور اپنے احباب کو خطوط لکھ کر ان کے مفصّل پتے دریافت کریں ۔ کم از کم سو یورپین مسلمان اس کانفرنس میں جمع ہو جائیں تو خوب ہو . . . مسٹر پکٹ ہال کو میں نے حیدر آباد خط لکھا تھا ۔ ان کو اس خیال سے نہ معلوم کیوں ہمدردی نہیں ۔ میں انگلستان سے خط و کتابت کر رہا ہوں ۔''[۱]

لیکن بعض وجوہ سے اس کانفرنس کی تجویز عمل میں نہ آ سکی ۔ البتہ اسی سال کے آخری مہینے میں مرکزیہ جمعیّت تبلیغ اسلام کی تجویز کے مطابق آل انڈیا تبلیغ کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی ، جس میں الحاج لارڈ ہیڈلے الفاروق خاص طور پر انگلستان سے مدعو کیے گئے اور اس طرح اقبال کی مجوزہ کانفرنس کا مقصد ایک حد تک پورا ہو گیا ۔ ۵ دسمبر ۱۹۲۸ء کے ایک خط میں اقبال نے میر نیرنگ کی مساعی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا :

''میرے نزدیک تبلیغِ اسلام کا کام اس وقت تمام کاموں پر مقدّم ہے ۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبودی ہے اور حفاظتِ اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے ، جیسا کہ آج کل کے قوم پرستوں کے رویے سے معلوم ہوتا ہے ، تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے ۔ یہ بات

۱۔ اقبالنامہ ، مرتّبہٗ شیخ عطاءاللہ ، حصہ اول : صفحات ۲۰۷ - ۲۰۸ -

میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں اور سیاسیاتِ حاضرہ کے
تھوڑے سے تجربے کے بعد۔ ہندوستان کی سیاسیات کی
روش، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، خود مذہبِ
اسلام کے لیے ایک خطرۂ عظیم ہے۔ میرے خیال میں
شدھی کا خطرہ اس خطرے کے مقابلے میں کچھ وقعت
نہیں رکھتا یا کم از کم یہ بھی شدھی ہی کی ایک
غیرمحسوس صورت ہے۔ بہرحال جس جاں فشانی سے آپ
نے تبلیغ کا کام کیا ہے، اس کا اجر حضور سرور کائناتؐ
ہی دے سکتے ہیں۔ میں انشاءاللہ جہاں جہاں موقع
ہوگا آپ کے ایجنٹ کے طور پر کہنے سننے کو حاضر ہوں۔
مگر آپ اور مولوی عبدالماجد بدایونی جنوبی ہند کے
دورے کے لیے تیار رہیں۔''[۱]

میر غلام بھیک نیرنگ نے حضرت سید شاہ ابو احمد محمد علی حسین اشرفی جیلانی کچھوچھوی[۲] کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے روحانیت میں بھی خاصی ترقی کی۔ اپنے مرشد کا فارسی، اردو اور ہندی کلام جمع کر کے ''تحائف اشرفی'' کے نام سے چھپوانے کی سعادت بھی انھی کے حصے میں آئی۔ دیوان کی ترتیب کا سلسلہ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں شروع ہوا اور ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء میں طبع ہوا۔ شروع میں حضرت ممدوح اور ان کے خاندان کے مختصر حالات

۱۔ اقبالنامہ، حصہ اول، صفحات ۲۰۹-۲۱۰۔
۲۔ ولادت: ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء بروز دو شنبہ بوقتِ صبح صادق۔ وصال: ۱۱ رجب ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء۔

درج کیے اور کلام کی نسبت لکھا:

''آپ کا کلام ذوق و شوق کی عکسی تصویر ہوتا ہے۔ سوئے اتفاق سے بہت سا کلام ضائع ہوگیا ہے۔ جس قدر اس وقت دستیاب ہوا اور جمع کیا گیا، سبحان اللہ کیا کلام عرفان نظام ہے۔ ایک ایک لفظ اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ زبان شیریں ہے، بیان رنگین ہے مگر بایں ہمہ تصنّع سے مبّرا، تکلّف سے معّرا ہے۔ عندلیبانِ گلشنِ قال کے زمزمے کچھ اَور ہوتے ہیں، بلبلانِ گلستانِ حال کے چہچہے کچھ اَور۔ وہاں زیادہ تر قوائے عقلیہ سے خطاب ہوتا ہے، یہاں سراسر قلب و روح کی جانب روئے سخن ہے۔ وہاں اصولِ بلاغت کی پابندی میں کوہ کندن و کاہ برآوردن ہوتا ہے، یہاں باتبّاعِ سنّت و ما ینطق عن الھویٰ کوئی کہلاتا ہے تو کہتے ہیں اور بے ساختہ کہتے ہیں ورنہ خاموش رہتے ہیں۔''[۱]

قطعۂ تاریخ

اشرفی اشرفِ اربابِ شرف
پیکرِ معنی و تمثال جمال

در گلستانِ نبیؐ طرفہ گلے
در چمن زارِ علیؓ تازہ نہال

۱۔ تحائف اشرفی، مطبوعہ کراچی۔

سروِ خوش قامت باغ حسنین رض
لالۂ گلشن سلطانِ جیال

صورتش صورتِ غوث اعظم ح
سیرتش سیرتِ احمد تمثال

غازۂ عارض زیبائے سلوک
سرمۂ نرگسِ شہلائے کمال

شعرِ او رشحہ نیسانِ قدم
فی المثل از اثرِ سحر حلال

تازہ سازد بدل سنگدلاں
قصّۂ نغمۂ داؤد و جبال

پیش آب گہرِ گفتارش
گہر و لعل نماید چو سفال

بارک اللہ چہ روشن دیوان
بدر از تاب ضیائش چو ہلال

گفت نیرنگ چہ سال طبعش
گفتمش مطلع خورشید جلال

۱۳۳۳ھ

میر صاحب نے سیاسی میدان میں بھی قوم کی بہت خدمت کی ۔ آنھوں نے تحریکِ خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ وہ متحدہ ہندوستان کی مرکزی لیجس لیٹو اسمبلی کے رکن تھے ۔ آنھوں نے ایک مسودۂ قانون بیش کیا جسے شریعت بل کہتے ہیں ۔

۱۹۳۴ع میں جب اقبال نے حضرت شیخ احمد سرہندی مجدّد

الف ثانی کے مزار کی زیارت کا ارادہ کیا تو میر نیرنگ کو بھی لکھا کہ ان کا ساتھ دیں۔ میر صاحب انبالے سے سرہند پہنچے اور اقبال کے ہمراہ مزار پر حاضر ہوئے۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد اقبال دیر تک وہاں مراقبہ کرتے رہے۔ مراقبے کی حالت میں اقبال نے کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا؟ یہ ایک روحانی سرگزشت ہے جو یہاں بیان نہیں کی جا سکتی۔ ''بالِ جبریل'' کے یہ چند شعر غالباً انھی تاثرات کا نتیجہ ہیں:

حاضر ہوا میں شیخ مجدّد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلع انوار
اس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمئی احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو میر نیرنگ نے علامہ اقبال کی رحلت کی خبر سنی تو اپنے نواسے کو لکھا:

''باسمہ سبحانہ'

انبالہ شہر

۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء

عزیز از جانِ من! سلمہ اللہ تعالٰی

سلامِ مسنون و دعائے سعادتِ دارین ہو۔

''کل علامہ سر محمد اقبال کی وفات کی خبر پہنچی - پہلے برسبیلِ افواہ سنی ، بعد میں دریافت سے معلوم ہوا کہ ریڈیو کے ذریعے پہنچی - پھر ٹیلی فون پر معلوم کرایا تو پتا لگا کہ یہ وحشت ناک خبر درست ہے - آج اخباروں سے بھی پتا لگ گیا - افسوس! ایک وحید العصر فریدالدہر ہستی چل بسی - ایسے لوگ صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور خدا جانے کتنی صدیوں کے بعد پھر کوئی اقبال پیدا ہو - انا للہ و انا الیہ راجعون - اللہ تعالٰی ان کو اپنی رحمت سے مالامال فرمائے - آمین ثم آمین -

سیّد غلام بھیک نیرنگ''

تقسیمِ ملک کے بعد جب فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے اور انبالے میں رہنا ناممکن ہوگیا تو میر صاحب اپنے متعلقین کو لے کر پاکستان آگئے - یہاں بھی پاک دستوریہ کے رکن کی حیثیت سے تعمیرِ ملّت کے ہر منصوبے میں عملاً حصہ لیا - ۱۶ - اکتوبر ۱۹۵۲ء کی رات کو لاہور میں انتقال کیا اور یہیں آسودۂ خاک ہوئے -[1]

نیرنگ کا شمار دبستانِ پنجاب کے اُس گروہ میں ہوتا تھا ، جو مولانا حالی اور سر سیّد سے براہِ راست متاثر ہوا اور جس نے شاعری میں زندگی کے مسائل داخل کیے - نیرنگ نے زیادہ تر اصلاحی نظمیں ہی کہی ہیں جن میں حقائقِ حیات دلآویز پیرایے

۱- نقوش ، لاہور ، غزل نمبر ، ص ۵۸۷ - مکاتیب اقبال بنامِ گرامی ، ص ۲۲۶ - جدید شعرائے اُردو ، مرتّبہ ڈاکٹر عبدالوحید ، ص ۳۷۷ -

میں بیان کیے گئے ہیں ۔ خاص طور پر مناظرِ فطرت کی عکسی ایسے والہانہ انداز میں کی ہے کہ پڑھنے والا وجد کرنے لگتا ہے ۔ ان کے اسلوب میں بڑی روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے ۔ زبان سادہ اور شستہ ہے ۔ انھیں اپنے خیالات کے اظہار پر عالمانہ قدرت حاصل تھی ۔ وہ معمولی چیزوں کو بھی اپنی خوش بیانی سے دلکش بنا دیتے تھے ۔ غزلوں میں بھی ان کے یہاں عاشقانہ خیالات کم اور سیاسی اور قومی مضامین زیادہ ہوتے ہیں ، کیونکہ ان کا سینہ مذہب و ملت کے درد سے معمور تھا ۔ دیکھیے اپنے وارداتِ قلب کو کس صحت اور صفائی سے بیان کرتے ہیں :

اب ہجومِ غم و کلفت ہے ، خدا خیر کرے
جان پر نت نئی آفت ہے ، خدا خیر کرے

جائے ماندن ہمیں حاصل ہے ، نہ پائے رفتن
کچھ مصیبت سی مصیبت ہے ، خدا خیر کرے

آ چلا اس بتِ عیّار کی باتوں کا یقیں
سادگی اپنی قیامت ہے ، خدا خیر کرے

دل گیا ، جانے دو ، کافر کی ہے ایماں پہ نظر
آنکھ میں اپنی مروّت ہے ، خدا خیر کرے

ابھی تشخیصِ مرض میں ہے طبیبوں کو کلام
جاں ادھر درپئے رخصت ہے ، خدا خیر کرے

رہناؤں کو نہیں خود بھی پتا رستے کا
راہبر پیکرِ حیرت ہے ، خدا خیر کرے

یادِ ماضی بقولِ نادر کاکوروی رات کو سونے سے پہلے اپنے آپ کو

دہراتی ہے :

اکثر شبِ تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر

نیرنگ کے ہاں بھی انسانی جذبات و احساسات کی ایسی عمدہ اور نادر تصویریں ملتی ہیں :

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انھی کی یاد میری زندگی ہے

طلب نے کھائی ہیں وہ ٹھوکریں راہِ تمنّا میں
کہ آخر مجھ سے شرمانے لگی ہے آرزو میری

ان کی نظم "عالمِ پیری اور یاد ایّام" میں بچپن، جوانی، گھر کے ماحول، ماں باپ کے پیار، عشق اور اس کے مزے ملاحظہ ہوں :

کیا لطف کے تھے وہ دن، کیا خوب زمانہ تھا
طفلی کی وہ سب باتیں، کیا پیارا فسانہ تھا
دنیا میں بہت گھر ہیں اور ایک سے ایک اچھا
پر گھر تھا وہ کیا پیارا، ہم جس میں ہوئے پیدا
رحمت کا فرشتہ تھی ماں کی نگہِ اُلفت
اب یاد جسے کر کے روتے ہیں بصد حسرت

اُردو شاعری کو جدید رجحانات سے روشناس کرانے میں نیرنگ کا بہت بڑا حصہ ہے ۔ ان کا کلام قدما کے رنگِ تغزّل میں بھی اپنے

دور کے کئی نئے آفق لیے ہوئے ہے ۔ روایت کے احترام کے باوجود انداز بیان جدا ہے :

ہے تو نیرنگ وہی عشق کا رونا دھونا
انھی باتوں میں نیا رنگ دکھا جاتے ہو

آخری عمر میں شاعری کی طرف سے توجہ ہٹا کر بالکل قومی کاموں کے لیے وقف ہوگئے تھے ۔ اگر وہ اقبال کے شانہ بہ شانہ چل کر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لاتے تو دوسرے اقبال ہوتے ۔ ''کلامِ نیرنگ'' (طبع ۱۹۰۷ع) اور ''غبارِ آفق'' دو جھوٹے چھوٹے مجموعے ان کی شاعری کی یادگار ہیں ، جو اپنے دور کی جدید شاعری کی تمام خوبیوں کے حامل ہیں ۔ ان کی نظمیں 'انسان کی فریاد' ، 'کوہستان کا نظارہ' ، 'مرجھایا ہوا پھول' ، 'تلاشِ محبت' اور 'خار' وغیرہ دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ اقبال نے انھیں اپنا ہم نوا بے وجہ نہیں کہا تھا :

نادر و نیرنگ ہیں اقبال میرے ہم صفیر
ہے اسی تثلیث فی التوحید کا سودا مجھے

☆ ☆ ☆

۷ - ۸

شبلی و حالی

(۱۹۱۴ع)

مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ع - ۱۹۱۴ع) اور خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی (۱۸۳۷ع - ۱۹۱۴ع) کے علمی ، تاریخی اور شعری کارناموں سے کون پڑھا لکھا واقف نہیں ۔ مولانا شبلی اگر اور کچھ بھی نہ لکھتے تو تنہا ''سیرۃ النبی'' ان کا نام ابدالاباد تک زندہ رکھ سکتی تھی ۔ ''مسدسِ مد و جزرِ اسلام'' بھی اکیلی مولانا حالی کو حیاتِ جاوید بخشنے کے لیے کافی تھی ۔ دونوں بزرگوں نے اقبال کی اقبال مندی اور کمال کا اعتراف اس وقت کیا جب نوجوان شاعر نے نیا نیا نشان بلند کیا تھا اور اس کی شاعری کی مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں ۔

۱۹۰۴ع کا واقعہ ہے کہ انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کا انیسواں سالانہ اجلاس یکم اپریل سے ۳ اپریل تک اسلامیہ کالج کے وسیع صحن میں منعقد ہوا ۔ اس میں مولانا حالی ، ڈپٹی نذیر احمد ، مرزا ارشد گورگانی ، میاں محمد شفیع ، شیخ عبدالقادر ، میاں فضل حسین ،

مولانا ابوالکلام آزاد اور خواجہ حسن نظامی دہلوی جیسے اکابر شریک تھے ۔ اقبال نے اپنی نظم ''تصویرِ درد'' پڑھ کر سنائی تو مولانا حالی نے ایک شعر پسند کر کے انجمن کو دس روپے کا نوٹ عطا فرمایا ۔ نوجوان شاعر کی اس سے زیادہ حوصلہ افزائی کیا ہو سکتی تھی کہ خدائے سخن اس کے کلام کی داد دے ۔ اس دس روپے کے نوٹ کو تبّرک سمجھ کر حاصل کرنے کی خاطر لوگوں نے بڑھ بڑھ کے بولیاں دیں ۔ اس طرح انجمن کو سینکڑوں روپے وصول ہوگئے ۔

جب مولانا حالی کے نظم پڑھنے کی باری آئی تو ضعفِ پیری کے سبب ان کی نحیف و نزار آواز سامعین تک نہ پہنچ سکی اور لوگ سننے کے شوق میں بے قرار ہو کر آگے بڑھنے لگے ۔ شیخ عبدالقادر نے موقع کی نزاکت دیکھ کر مجمع کو یہ کہہ کر خاموش کیا کہ آپ فی الحال مولانا کی زیارت کریں اور ان کی زبانِ مبارک سے تبّرکاً جو کچھ سنا جا سکے سن لیں ، بعد میں یہی نظم اقبال پڑھ کر آپ کو سنا دیں گے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اقبال نے بلند آواز سے نظم دوبارہ پڑھ کر مولانا کی بزرگی کی لاج رکھ لی ۔ جب وہ مولانا کی نظم سنانے کھڑے ہوئے تو اوّل یہ رباعی فی البدیہہ کہی ، پھر مولانا کی نظم سنائی :

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی
معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالی

۱۹۱۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا وہ اجلاس بھی یادگار ہے جو مولانا شاہ سلیمان پھلواری کی صدارت میں دہلی میں منعقد ہوا اور جس میں اقبال کی گلپوشی کی رسم مولانا شبلی نے ادا کی۔ اس خوش گوار فریضے کو ادا کرتے ہوئے مولانا شبلی نے فرمایا :

"یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں اور اس کو محض تفریح نہ تصوّر کرنا چاہیے - ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطاب کی قدر کرتے رہے ہیں، اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کے ساتھ نہیں ہوئی - محقّق طوسی وغیرہ کو ان کے زمانے کے سلاطین نے بڑے بڑے خطابات دیے لیکن آج سوائے کتابوں کے اوراق کے کسی کی زبان پر نہ چڑھ سکے، لیکن قوم کی طرف سے "محقّق" کا جو خطاب دیا گیا، وہ آج تک زباں زدِ خاص و عام ہے - جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے، وہ ان کے لیے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس کے مستحق ہیں -"[1]

مولانا شبلی ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اقبال نے مرحوم کی لوحِ مزار کے لیے یہ تاریخی جملہ تجویز کیا :

"امام الہند والا نژاد شبلیؒ طاب ثراہ"

اس سے ۱۳۳۲ ہجری ان کا سالِ وفات نکلتا ہے -

۱- رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، سال ۱۹۱۱ء -

ابھی مولانا شبلی کی رحلت کا صدمہ تازہ ہی تھا کہ ایک مہینہ اور بارہ دن کے وقفے کے بعد ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حالی بھی قوم کو روتا پیٹتا چھوڑ کر انتقال فرما گئے۔ اقبال نے قوم کے اس نقصانِ عظیم پر ایک دل گداز قطعہ لکھا، جو ''شبلی و حالی'' کے عنوان سے ''بانگِ درا'' میں موجود ہے۔[1] اس میں اقبال نے قوم کو مخاطب کرکے کہا کہ تو باغ کے پرانے راز داروں سے مل کر پوچھ کہ تیرے باغ میں خزاں نے کیوں چھاؤنی چھا لی ہے:

مُسلم سے ایک روز یہ اقبال نے کہا
دیوان جزو و کل میں ہے تیرا وجود فرد

تیرے سرودِ رفتہ کے نغمے علومِ نو
تہذیب تیرے قافلہ ہائے کہن کی گرد

پتھر ہے اس کے واسطے موجِ نسیم بھی
نازک بہت ہے آئنۂ آبروئے مرد

مردانِ کار ڈھونڈ کے اسبابِ حادثات
کرتے ہیں چارۂ ستمِ چرخِ لاجورد

پوچھ ان سے جو چمن کے ہیں دیرینہ رازدار
کیونکر ہوئی خزاں ترے گلشن سے ہم نبرد

مسلمان اقبال کی بات سن کر بے تاب ہو گیا اور غمگین ہو کر

۱- بانگِ درا، ص ۲۴۸-

بولا کہ جب رازدار ہی نہ رہے تو بوچھا کس سے جائے؟

مُسلم مرے کلام سے بے تاب ہو گیا
غمّاز ہو گئی غمِ پنہاں کی آہ سرد

کہنے لگا کہ دیکھ تو کیفیّتِ خزاں
اوراق ہو گئے ہے شجرِ زندگی کے زرد

خاموش ہو گئے چمنستان کے رازدار
سرمایۂ گداز تھی جن کی نوائے درد

شبلی کو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

"اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت وگل چہ شنید و صبا چہ کرد"

مولانا حالی سے اقبال کچھ زیادہ ہی متاثر تھے ۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا کے کلام میں جو خلوص ، درد اور سوز وگداز پایا جاتا ہے وہ اقبال کے مزاج کے عین مطابق تھا ۔ چنانچہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو پانی پت میں مولانا کی صد سالہ برسی کی تقریبات میں شریک ہو کر اقبال نے نواب حمید اللہ خاں والیِ بھوپال کو مخاطب کر کے مولانا کی روحِ پُرفتوح کو اس طرح خراجِ عقیدت ادا کیا :

مزاجِ ناقہ را مانندِ عرفی نیک می بینم
چو محمل را گراں بینم حُدی را تیز تر خوانم

حمیداللہ خاں اے ملک و ملّت را فروغ ازتو
ز الطافِ تو موجِ لالہ خیزد از خیابانم

طوافِ مرقدِ حالی سزد اربابِ معنی را
نوای او بجانہا افگند شوری کہ می دانم
بیا تا فقر و شاہی در حضورِ او بہم سازم
تو بر خاکش گُہر افشاں و من برگِ گل افشانم

اسی سلسلے میں کسی دوسرے موقع پر یہ قطعہ بھی ارشاد فرمایا :

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد
سیّد دگر او را نمی از اشکِ سحر داد
حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود
تا لالۂ شبنم زدہ را داغِ جگر داد

☆ ☆ ☆

۹ - ۱۰

عزیز لکھنوی

(۱۹۱۵ء - ۱۹۳۵ء)

شعر کی دنیا میں عزیز لکھنوی کے نام سے دو شاعر بہت مشہور ہیں ۔ اتفاق سے دونوں کے آبا و اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے لکھنؤ میں آباد ہوئے تھے ۔ دونوں ہم عصر بھی تھے اور ایک ہی شہر میں رہتے تھے ۔ گویا ایک نیام میں دو تلواریں تھیں یا ایک اقلیم میں دو تاجدار سمائے ہوئے تھے ۔ ہاں اتنی بات ضرور تھی کہ ایک خواجہ کے خطاب سے پہچانا جاتا تھا اور دوسرا میرزا کے لقب سے ۔ ایک فارسی کا استاد تھا تو دوسرا اُردو کا ، مگر تھے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ باکمال اور یگانۂ روزگار ۔ مجھے ان دونوں بزرگوں کے تعارف کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتانا ہے کہ اپنے ان ہم عصر شاعروں کی نسبت علامہ اقبال کی کیا رائے تھی اور وہ انھیں کس احترام کی نظر سے دیکھتے تھے ؟

خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی

خواجہ عزیز لکھنوی ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں نہایت ممتاز حیثیت کے مالک تھے - جس طرح حضرت علامہ اقبال طرزِ جدید میں ایشیا کے مایۂ ناز فارسی شاعر مانے جاتے ہیں ، اسی طرح خواجہ عزیز طرزِ قدیم میں ہندوستان کے یگانۂ عصر اور مستند استاد تسلیم کیے جاتے تھے - ان کے والد خواجہ امیر الدین درابو شال اور پشمینے کی تجارت کے سلسلے میں کشمیر سے نکل کر لکھنؤ آئے اور یہیں کے ہو رہے - یہ نواب واجد علی شاہ کا زمانہ تھا - خواجہ عزیز یہیں ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۸ع) میں پیدا ہوئے - ابھی انھوں نے شباب کی دہلیز پر قدم ہی رکھا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا - دولت بے اندازہ تھی مگر وہ سب ناتجربہ کاری کی بھینٹ چڑھ گئی - باپ نے عربی فارسی کی بہت اچھی تعلیم نہایت فاضل اساتذہ سے دلائی تھی ، بالآخر وہی کام آئی - کیننگ کالج لکھنؤ میں فارسی کے پروفیسر ہو کر اپنے علم و فضل اور بے نظیر فارسی شاعری کے جھنڈے گاڑے - ایک دفعہ کشمیر جاتے ہوئے دہلی میں میرزا غالب سے ملاقات کی اور غالب نے آپ کے کلام کی تعریف کی -[1] آپ کی تصنیف کردہ کتابوں میں مثنوی یدِ بیضا ، قیصر نامہ ، اورنگ حضوری اور ہفت بند عزیزی بہت مشہور ہیں - مثنوی ''ارمغانِ احباب'' بھی لکھی تھی مگر وہ چھپ نہ سکی - آپ کا انتقال ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ع) میں ہوا - اسّی برس کی عمر پائی -

---

۱- تاریخ اقوام کشمیر ، مصنّفہ منشی محمد الدین فوق ، جلد اوّل ، ص ۵۵۲ ، در باب ''دہلی اور یو - پی کے اہلِ خطہ -''

منشی محمد الدین فوق مدیر ''اخبارِ کشمیری'' لاہور جب اپنی کتاب ''مشاہیرِ کشمیر'' لکھ رہے تھے تو علامہ اقبال کے کہنے پر انھوں نے خواجہ عزیز کو بھی لکھا کہ اپنے حالات اور کلام بھیجیں۔ خواجہ عزیز نے حسبِ ذیل جواب دیا:

''مکرمی! دام مجدکم!

تسلیم۔ پہلے شکریہ جناب ڈاکٹر محمد اقبال صاحب بالقابہ کا ادا کرتا ہوں کہ آپ کو محرّک تحریر نامۂ محبت شمامہ ہوئے۔ مِن بعد آپ کا سپاس گزار ہوں کہ آپ کی ذات ہوا خواہِ قوم ہے اور بالفاظِ دیگر خادم القوم، جس کی شان ہے ''خادم القوم مخدوم''۔ اللہ تعالیٰ آپ کی تائید اور مدد کرے۔

عزیزِ ناچیز مطالعے سے دونوں رسالوں (کشمیری میگزین) کے نہایت مسرور ہے اور بہ دل و جان ترقی خواہ و قوم کا بہی خواہ ہے۔

یہ جو تحریر ہوا کہ اپنا حال لکھو، تو اس استخوان فروشی سے خموشی بہتر ہے۔ جس کی صورت سیرت ننگِ بنی نوع انسان ہو، اس کے اظہار کی کیا ضرورت۔ البتہ عزیزِ ناچیز کو شوقِ شعر و سخن روزِ ازل سے ہے اور باوجود قحط سالیِ سخن کبھی کبھی طبع آزمائی کرتا رہا۔ لیکن چار پانچ برس سے ایسے امراض میں مبتلا ہے کہ مصداق اس شعر کا ہے:

چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

بایں ہمہ بموجب 'الامر فوق الادب' ایک مخمس کی نقل مرسل ہے ۔ میرے گمان میں دلچسپی ناظرین سے خالی نہ ہوگا ۔ اگرچہ بشمول مثنوی 'ید بیضا' طبع ہوا ہے لیکن کسی اخبار یا رسالے میں طبع نہیں ہوا ۔ مکرر آنکہ تالیف و تصنیف درکنار ، اب بوجہ بیماریوں کے کتب بینی بھی دشوار ہے ۔ زیادہ کیا لکھوں ۔ جناب ڈاکٹر صاحب کو تسلیم

عزیز الدین عزیز ، از لکھنؤ ، سبزی منڈی
۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ع

بموجب امر سامی گرامی یہ برزہ درائی درج نیازنامہ ہوئی کہ تعمیل امر ہو جائے ۔ اگر مناسب جانیے تو رسالے میں شائع کیجیے ۔ چونکہ نظم ہے ، تصحیح کا خیال رہے ۔ فقط ۔"[۱]

بارہ بند کا یہ مخمس پہلے عزیز مرحوم کی مثنوی "ید بیضا" کے ساتھ شائع ہوا ، پھر نظرثانی کے بعد "کلیات عزیز" میں شامل کیا گیا ۔ مسودے اور مطبوعہ کلیات کے بعض مصرعوں میں خاصا فرق ہے ۔ ابتدا اس بند سے ہوتی ہے :

وزد بمرغزارها هوائے نوبهار ها
نه سروها چنارها ز صوفیاں قطار ها

۱- نقوش ، مکاتیب نمبر ، نومبر ۱۹۵۷ع ، صفحات ۵۲۳ - ۵۲۵ -

چکارها و سارها چو راقصان بکارها
بوجد شاخسارها ز نغمۂ ہزار ها
بہ از صدائے تار ها نوائے زیر و زار[1] ها

چونکہ یہ مخمس ایران کے مشہور شاعر حبیب اللہ قآنی شیرازی کے تتبع میں لکھا گیا تھا ، اس لیے آخری بند میں اس کا ذکر بھی ہے :

عزیز تا ادیب شد عزیز ہر اریب شد
انیس ہر حبیب شد حبیب ہر لبیب شد
بہر کجا خطیب شد ز سامعاں شکیب شد
مقابلِ حبیب[2] شد ، رقیبِ عندلیب شد
حریف دلفریب شد بہ نغمہ از ہزار ها

'کلیاتِ عزیز' ۱۹۳۱ء میں خواجہ صاحب کے سب سے چھوٹے فرزند حافظ خواجہ وصی الدین ڈپٹی کلکٹر ریٹائرڈ نے طبع کرایا ۔ یہ پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے ۔ تشریحات اور مختصر تاریخ کشمیر اس کے علاوہ ہے ۔ چار فوٹو بلاک بھی کتاب کی زینت ہیں ۔

کلیات عزیز کا ایک نسخہ خواجہ وصی الدین نے علامہ اقبال کی خدمت میں بھی ارسال کیا ۔ حضرت علامہ نے رسید اور شکریے کا جو خط خواجہ صاحب کو لکھا ، اس میں اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ۔ یہ اگرچہ کوئی باقاعدہ تبصرہ نہیں ہے جو اشاعت کی غرض سے تحریر کیا گیا ہو ، محض نجی خط کی حیثیت رکھتا ہے ۔ پھر بھی

۱- آواز پست و بلند ۔
۲- حبیب اللہ قآنی شیرازی ۔

اس سے اقبال کی ژرف نگاہی کا ثبوت ملتا ہے اور ساتھ ہی خواجہ عزیز کے کلام کی خوبیوں پر بھی بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"لاہور

۹ جون ۱۹۳۱ء

جناب مکرّم! السّلام علیکم

'کلیاتِ عزیز' کا ایک نسخہ، جو آپ نے بکمال عنایت ارسال فرمایا ہے، مجھے مل گیا ہے جس کے لیے میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں۔ نوازش نامے میں جو کچھ آپ نے میرے متعلق ارشاد فرمایا ہے، وہ آپ کے حسنِ اخلاق کا نتیجہ ہے۔

خواجہ عزیز مرحوم فارسی ادبیات کے اس دَور سے تعلق رکھتے ہیں جس کی ابتدا شہنشاہ اکبر کے عہد سے ہوئی۔ افسوس کہ وہ دَور ہندوستان میں ان کی ذات پر ختم ہوا۔ ایرانی تخیّل نظم کی شاہراہوں کو چھوڑ کر اب زیادہ تر نثر میں اپنے کمالات دکھا رہا ہے۔ شعرائے متاخرین میں قاآنی کا آوازہ بہت بلند ہوا اور اب تک بلند ہے، لیکن خواجہ عزیز مرحوم کے قصائد اور مخمسات، جو انھوں نے قاآنی کی زمینوں میں لکھے ہیں، وہ فارسی زبان کی موسیقیت اور خواجہ مرحوم کی اس زبان پر قدرت کا بیّن ثبوت ہیں۔ مثلاً:

سحرگہاں بیادِ حق ز طائران فرق فرق
غزل سرا بداں نسق کہ کودکان ہم سبق

شفیق لعلگوں وشق چنانکہ در آفق شفق
شگفتہ گل ورق ورق بسعی ابر در عرق
بہر ورق طبق طبق گہر کنند نثار ہا

غزل میں ان کی نظر بیشتر روحانی حقائق پر رہتی ہے اور ان حقائق کو وہ نہایت آسانی اور لطافت کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں۔ مثلاً :

دو غنچہ ہست دو عالم ز گلشنِ صنعش
یکی شگفتہ ، یکی ناشگفتہ است ہنوز

ز کوثر آں طرف است آبجوی مقصد تو
عناں بجانبِ ناب از رہِ سراب انداز

بر آ ز پردہ و احوالِ جیب و داماں بیں
تو مہوشی و تماشائیاں کتاں پوشند

رسولِ ملتِ منصورم احوالم چہ می پرسی
رسدستمم بمعراجی کہ نام دیگرش دار است

خواجہ عزیز کے اس شعر سے ایک اور ہندی شاعر کا شعر یاد آ گیا ، جس کے لطف سے میں آپ کو محروم نہیں

رکھنا چاہتا:

انا الحق گفتنِ منصور تاویلے نمی خواهد
گداگم می کند خود را چو دولت می کند پیدا[1]

اسی طرح خواجہ صاحب کے یہ شعر بھی حقائق سے لبریز ہیں :

هنوز لوح و قلم بود در سوادِ عدم
کہ نقشِ مُہرِ تو بر لوحِ دل نشست مرا

۱۔ یہ شعر "ملا" باقر شہید کا ہے ، جن کے بزرگ طہران سے تعلق رکھتے تھے اور وہ قومِ اتراک سے تھے ۔ شہید کا مولد احمد آباد گجرات ہے ۔ بعد میں یہ اورنگ آباد میں مقیم ہو گئے تھے ۔ حرمین الشریفین کا سفر اختیار کرنے سے کچھ پہلے یہ شیخ محمد علی حزیں کی صحبت میں رہے اور ان کی شاگردی کا فخر حاصل کیا ۔ نوکری ترک کر کے خانہ نشیں ہوگئے تھے اور باہر بہت کم نکلتے تھے ۔ عبدالحکیم حاکم لاہوری نے اُنھیں ایک بار دیکھا تھا ۔ ان کا خیال ہے کہ شہید اگرچہ شیخ محمد علی حزیں کی وضع اختیار کر کے اپنے آپ کو بدل چکے تھے لیکن اُنھیں شیخ سے کوئی نسبت نہ تھی ۔ بالکل بہروپیے نظر آتے تھے ۔ اپنے ''عندیات'' میں مستغرق رہتے تھے ۔ خود پسند بہت تھے ۔ اپنے اشعار اکثر سناتے اور گنگناتے رہتے تھے ۔ عبدالحکیم حاکم چند ساعت ان کے پاس بیٹھے اور مکدّر ہو کر اُٹھ آئے ۔ ان کا دیوان بہت ضخیم ہے ۔ یہ شعر ان کے حسبِ حال ہے :

انا الحق گفتنِ منصور تاویلے نمی خواهد
گدائے چوں بدولت میرسد گم می کند خود را

(مردمِ دیدہ ، از عبدالحکیم حاکم ، ص ۱٦٧)

نشاطِ وصلِ تو محروم داردم از وصل
کہ در کنار چو آئی ز خود کنارہ کنم

یہ فیض ظہوری اور نظیری کا نہیں بلکہ یہ کلامِ الٰہی کا فیض ہے اور خواجہ مرحوم کو خود اس کا احساس تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

کے از ظہوری و ز نظیری رسد عزیز
فیضے کہ از کلامِ الٰہی بما رسید

لاہور - ۹ جون ۳۱ء　　　　مخلص محمد اقبال''[۱]

خواجہ عزیز کی اقبال کے دل میں کتنی وقعت تھی؟ اس کا اندازہ اس خط کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی ہو سکتا ہے جو انھوں نے ۵ مئی ۱۹۱۵ء کو مولانا غلام قادر گرامی کے نام لکھا تھا:

''مثنوی (اسرارِ خودی) ختم ہو گئی - اب اس کی اشاعت کا اہتمام درپیش ہے - چھپ جانے پر انشاء اللہ ارسالِ خدمت کروں گا - کاش! آپ یہاں ہوتے یا میں حیدر آباد میں ہوتا تو پریس میں جانے سے پہلے آپ کے ملاحظے سے گزر جاتی - میں نے ارادہ کیا تھا کہ حیدر آباد تو دور ہے، لکھنؤ جا کر خواجہ عزیز کو سنا آؤں، لیکن لاہور کے علائق نہیں چھوڑتے -''[۲]

۱- روزنامہ ''انقلاب'' لاہور، یوم یکشنبہ ۳۰ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۶ اگست ۱۹۳۱ء - انوارِ اقبال، مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحات ۵-۸ -

۲- مکاتیبِ اقبال بنامِ گرامی، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحات ۱۰۵ - ۱۰۶ -

گویا اس وقت ہندوستان بھر میں فارسی شاعری کی صرف دو ہی ایسی بالغ نظر شخصیتیں موجود تھیں جن کو اقبال زبان اور اسلوبِ بیان کے معاملے میں قابلِ مشورہ سمجھتے تھے مگر خواجہ عزیز بہت بوڑھے ہو چکے تھے اور انھی دنوں ان کا انتقال بھی ہو گیا :

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

میرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

لسان الہند میرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کا شمار اردو کے چند بلند پایہ شعرا اور اہلِ فضل و کمال میں ہوتا ہے ۔ وہ میرزا محمد علی مؤلفِ ''نجوم السماء'' ابن میرزا صادق علی کے فرزند تھے ۔ ان کے بزرگ شیراز سے آ کر پانچ پشت تک کشمیر میں سکونت پذیر رہے ، پھر لکھنؤ میں آ بسے ۔ ہر عہد میں اس خاندان کے لوگ علمی مذاق سے بہرہ ور رہے ۔ میرزا عزیز کے بڑے بھائی حکیم محمد مہدی لکھنؤ کے بہترین اطبا میں شمار ہوتے تھے ۔ عزیز نے بھی خاندانی سنّت کی پیروی کی اور علم و فضل کے ساتھ شاعری میں بھی کمال حاصل کیا اور اس روایت کو آگے بڑھایا ۔ آپ کی ایک غزل کا مقطع ہے :

قوتِ ابداع ہے ہر شعر میں میرے عزیز
فیض پہنچا ہے مجھے شیراز اور کشمیر سے

عزیز ۵ ربیع الاول ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ع) کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ۲ اگست ۱۹۳۵ع (۱۳۵۴ھ) کو وہیں انتقال فرمایا ۔ بچپن ہی میں وہ یتیم ہو گئے تھے ۔ والدہ کی تربیت و پرداخت نے عزیز کی ذہانت و فطانت کو چمکا کر انھیں فردِ فرید بنا دیا ۔ شاعری کا جوہر

قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ مولانا صفی لکھنوی کی توجہ سے مجلاّ ہوکر اوجِ کمال پر پہنچ گیا۔ ابتدا میں لکھنؤ کے ممتاز و مخیر رئیس میرزا بہادر محمد عباس علی خاں مرحوم نے ان کو اپنا استاد اور مصاحب بنایا اور دنیا کی فکروں سے بے نیاز کر دیا۔ عزیز نے بھی اپنے ذوق کی خوب تکمیل کی۔ اس زمانے کو عزیز کی شاعری کے شباب کا عہد کہنا چاہیے۔

میرزا بہادر کے بعد عزیز کو تیرہ چودہ برس امین آباد ہائی سکول میں فارسی کی مدرسی کرنی پڑی۔ صحت نے جواب دے دیا تو ملازمت چھوڑ دی۔ مہاراجہ محمود آباد (سر علی محمد خاں) نے جوہر شناسی سے کام لے کر عزیز کو اپنے ولی عہد (خان بہادر راجہ) امیر احمد خاں کا نگران مقرر کیا لیکن کچھ عرصے کے بعد ان کو کتب خانے کی خدمت سپرد ہوگئی جس پر وہ اخیر دم تک مامور رہے۔

عزیز نے نہایت سلجھی ہوئی اور خاموش طبیعت پائی تھی۔ خود داری ان میں کمال درجے کی تھی۔ حکیم آشفتہ صاحب ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''چونکہ شاعر قدرۃً ذکی الحس اور نازک مزاج ہوتے ہیں اس لیے ایک حد تک ان میں نازک مزاجی ضرور تھی جو خودداری کے ساتھ مل کر کبھی کبھی غرور اور تکبّر کا دھوکا دیتی تھی۔''

غالباً یہی وجہ ہوگی اس ہنگامہ آرائی کی جس کا ہدف بعض حضرات نے عزیز مرحوم کو بنایا اور ان کے خلاف سبّ و شتم کا طوفان کھڑا کیا۔ لکھنؤ میں شعرا کی ایک نئی اور نوجوان نسل آپ

ہی کے دم سے قائم ہوئی اور پروان چڑھی جس نے رسالہ ''معیار'' کے ذریعے ادب کی اشاعت اور مذاقِ عامہ کی اصلاح میں نمایاں کردار ادا کیا ۔ آپ کے نامور شاگردوں میں جگت موہن لال رواں ، نواب مرزا جعفر علی خاں اثر ، جناب شبّیر حسن خاں جوش ملیح آبادی اور حکیم سید علی صاحب آشفتہ وغیرہ بجائے خود ایک ادارۂ ادب کا حکم رکھتے ہیں ۔[1]

مولوی عبدالسلام ندوی صاحبِ ''شعر الہند'' کے قول کے مطابق ''ان کا کلام اول سے آخر تک دلی کے رنگ کا ایک عمدہ نمونہ ہے ۔'' چند شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں :

یونہی گھٹ گھٹ کے مٹ گیا آخر
عقدۂ دل کسی سے وا نہ ہوا

عشق ہے اک طلسمِ رازِ بقا
مٹ گیا دل مگر فنا نہ ہوا

ہجومِ شوق کا بس قصہ مختصر یہ ہے
کہ جو میں چاہتا ہوں وہ کہا نہیں جاتا

آگے خدا کو علم ہے ، کیا جانے کیا ہوا
بس اُن کے رُخ سے یاد ہے اُٹھنا نقاب کا

۱۔ خم خانۂ جاوید ، جلد پنجم ، صفحات ۵۹۲ - ۶۰۰ ۔

ہے محبّت کی نظر میں کیا مزا خود دیکھ لو
چار آنکھیں جب ہوئیں تم کو حجاب آ ہی گیا

یہ مختصر سی ہے میری سوانحِ عمری
ہمیشہ وقفِ ستم ہائے روزگار رہا

شمع بجھ کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا
یادگارِ حسن و عشق اک داغ دل پر رہ گیا۔

مریضِ ہجر کو تم زہر دینا یا دوا دینا
مگر بالیں سے دم بھر چارہ سازوں کو ہٹا دینا

رُک جائے بات بات پہ جس ناتواں کی سانس
ایسے مریضِ غم کا بھلا اعتبار کیا
پیدا وہ بات کر کہ تجھے روئیں دوسرے
رونا خود اپنے حال پہ یہ زار زار کیا

جب کوئی ظلم وہ ایجاد کیا کرتے ہیں
عمرِ رفتہ تجھے ہم یاد کیا کرتے ہیں

وارفتگانِ حسن یہ کیا جانے کیا بنے
اُٹھ جائیں گر نگاہ سے پردے حجاب کے

طولِ شبِ فراق کی کچھ انتہا نہ پوچھ
اتنا جیے کہ زیست سے بیزار ہو گئے

موسمِ گل ہے، چمن ہے اور بھری برسات ہے
تختۂ سنبل کے نیچے اک اندھیری رات ہے

ذرّہ ذرّہ ہے چمن کا آئنہ دارِ بہار
ہو رہی ہے مست خوشبو سے ہوائے مرغزار
سبزہ لہریں لے رہا ہے، نکہتِ گل بے قرار
ہر طرف ہے جلوہ گر حدِّ نظر تک لالہ زار

عزیز کی بدیہہ گوئی، کاریگری اور شگفتہ مزاجی کے چند واقعات اگر یہاں بیان کر دیے جائیں تو دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

ایک روز عزیز کسی دوست کے ہاں مدعو تھے۔ چند احباب اور بھی شریکِ طعام تھے۔ اتفاق سے کھانا کھاتے کھاتے ایک دوست کا دانت، جو ہل رہا تھا، جڑ سے اکھڑ گیا۔ وہ بیچارہ دسترخوان سے اٹھ گیا۔ عزیز نے اسی وقت یہ قطعہ موزوں کر کے سنایا:

طفلی تھی یا کہ عہدِ مسرّت کا ایک خواب
سمجھا نہ میں کہ نیند کا جھونکا تھا یا شباب
ناپائیدار زیست کی اب کیا امید ہو
پیری نے بھی دیا مجھے دنداں شکن جواب

جنابِ عزیز کے ایک دوست کی بیوی، جو تعلیم یافتہ اور حسنِ صورت و سیرت سے آراستہ تھیں، انتقال کر گئیں۔ انہیں

سخت صدمہ ہوا۔ چند روز کے بعد مرنے والی کی ایک تحریر ملی جس میں اس نے اپنے عزیزوں کی نسبت شوہر کو کچھ وصیت کی تھی۔ وہ اس کو پڑھ رہے تھے اور ان کے گرد تمام اعزہ جمع تھے۔ بعض ان میں چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ اتفاق سے اسی وقت ڈاک میں حضرت عزیز کا ایک خط ان کو ملا۔ اس میں انھوں نے اپنی ایک تازہ غزل بھیجی تھی جس کا یہ شعر بالکل ان کے حسبِ حال تھا اور اس نے تمام حاضرین کو بے حد متاثر کیا:

ہجوم عام ہے سب رو رہے ہیں دیکھ کر اس کو
مرے بعد آج میرے گھر سے اک تحریر نکلی ہے

ایک روز عزیز امین آباد میں شوکت تھانوی سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک موٹا تازہ شخص پاس سے گزرا۔ شوکت صاحب دل میں سوچ ہی رہے تھے کہ آخر یہ کس چکی کا پسا کھاتا ہے کہ عزیز صاحب ان کے اس تجسس کو تاڑ گئے۔ پوچھا:

"جانتے ہو ان حضرت کو؟"

شوکت تھانوی نے نفی میں سر ہلایا تو بولے:

"یہ لکّۂ ابر ہے!"

شوکت صاحب پھر بھی حیران رہے تو فرمایا:

"منشی واحد علی ابر قدوائی کے صاحبزادے!"

ایک روز شوکت تھانوی نے پوچھا کہ بجنور کے اخبار "مدینہ" کی پیشانی پر آپ کا جو شعر لکھا رہتا ہے:

معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

یہ محض کاریگری ہے یا کچھ اور؟ تو ہنس کر کہا :

''ہے تو یہ واقعی کاریگری مگر آپ کاریگری کے اتنے مخالف کیوں ہیں ؟ ''مدینہ'' کی 'میم' اِدھر اور 'ہ' اُدھر۔ بیچ میں صرف 'دین' رہ گیا اور 'مہ' گویا شق ہوگیا۔ یہ بات اگر مجھے سوجھ گئی اور میں نے نظم کر دی تو آپ ناراض کیوں ہیں ؟''[1]

''کشکولِ ادب'' اور ''عزیزاللغات'' وغیرہ ان کی تصانیف اور کلام کے دو مجموعے ''گلکدہ'' اور ''صحیفہ'' ان کی یادگار ہیں۔ پہلا مجموعہ ''گلکدہ'' جب ۱۹۱۸ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تو علامہ اقبال نے عزیز کی فن کارانہ عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا :

''اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

سبحان اللہ ! یہ بات ہر کسی کو نصیب نہیں۔ موجودہ ادبیاتِ اردو کی نظر حقائق پر ہے اور یہ مجموعۂ غزلیات اس نئی تحریک کا بہترین نمونہ ہے۔ نام کی جدّت حیرت انگیز ہے۔ غزل میں جو خوبیاں ہونی چاہییں، عزیز کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ایک طرف اربابِ ذوق لطفِ زبان اور فنِ کلام سے لطف اندوز ہوتے ہیں، تو دوسری طرف نوآموز، عزیز کے نقشِ قدم پر

۱۔ نقوش، شخصیات نمبر۔

چل کر اعلیٰ درجے کے شاعر ہو سکتے ہیں ۔ میں آپ کے
کلام کو ہمیشہ بہ نظرِ استفادہ دیکھتا ہوں ۔''[۱]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنے تبصرے میں کچھ اور باتیں بھی لکھی تھیں جو ''الواعظ'' نے اپنے اقتباس میں چھوڑ دی تھیں ۔ ''گلکدہ'' جب دوسری بار ۱۹۳۱ع میں صدیق بکڈپو لکھنؤ سے شائع ہوا تو اس کے مقدمے میں جناب رحم علی الہاشمی نے لکھا :

''آپ کی نسبت آپ کے اساتذہ اور علما و ادبا کے جو خیالات ہیں اگر ان میں سے سب کا خلاصہ بھی دیا جائے تو مقدمے کی ضخامت دیوان سے زیادہ ہو جائے گی ۔ تاہم بعض تحریروں کا خلاصہ یہاں درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں جس سے مصنّف کی علمی زندگی پر روشنی پڑتی ہے ۔ ان میں سے بیشتر وہ تحریریں ہیں جو جرائدِ ادبیہ اور اخبارات میں مصنّف کی نسبت بغیر رو رعایت لکھی گئی ہیں ۔''

''اقتباسِ آراء'' کے عنوان کے تحت اقبال کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات کی آرا ہیں : شمس العلماء مولانا السید ناصرحسن ، شمس العلماء مولانا سید نجم الحسن ، شمس العلماء مولانا عبدالمجید صاحب فرنگی محلی ، مولانا شیخ فدا حسن ، علامہ آقا سیّد احمد استر آبادی ، زبدة العلماء جناب مفتی سید محمد علی صاحب ، لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی ،

۱۔ ہفت روزہ ''الواعظ'' لکھنؤ ، جلد ۱۱ ، شمارہ ۲۸ ، ص ۶ ، بابت ۱۶ اگست ۱۹۳۲ع ۔

مولانا ابوالکلام آزاد ، عبدالحلیم شرر ، صفی لکھنوی ، ذکی جائسی ، مولانا ظفر علی خاں ، مولانا عبدالماجد دریابادی ، پروفیسر مرزا رسوا ، محوی صدیقی لکھنوی اور دل شاہجہانپوری ۔ اقبال کی رائے یوں درج ہے :

"میں آپ کے کلام کو ہمیشہ بنظرِ استفادہ دیکھتا ہوں :

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

سبحان اللہ ! یہ بات ہر کسی کو نصیب نہیں ۔ موجودہ ادبیاتِ اردو کی نظر حقائق پر ہے اور یہ مجموعۂ غزلیات اس نئی تحریک کا بہترین ثبوت ہے ۔ میں نے اسے پنجاب یونیورسٹی کے امتحان آنرز اِن اردو کے نصاب میں داخل کرنے کی تجویز کی ہے ۔ آپ کے کلام کی جدّت حیرت انگیز ہے ۔ کیوں نہ ہو، آخر خاکِ پاکِ شیراز و کشمیر سے آپ کو نسبت ہے ۔"[1]

حضرت علامہ نے ایک اور موقع پر بھی اس شعر کو سراہا ہے اور اس کی وجہ بھی بیان فرمائی ہے ۔ جناب مجید ملک صاحب برسرِ ملاقات اقبال سے مختلف موضوعات پر دلچسپ گفتگو کر رہے تھے ۔ حضرت علامہ علم و حکمت کے موتی بکھیر رہے تھے ۔ بات اردو کے ایسے اشعار پر آ گئی جن کو حضرت علامہ کامیاب سمجھتے تھے یا پسند فرماتے تھے ۔ مجید ملک صاحب نے چند شعر سنائے جن کی

۱۔ گلکدہ ، ص ۱۲ ۔

اقبال نے تعریف کی ۔ اس کے بعد فرمایا ''کیا تمھیں مرزا ہادی عزیز کا وہ شعر یاد ہے ؟'' :

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

مجید ملک نے کہا ''آپ اس شعر کی پہلے بھی تعریف فرما چکے ہیں ۔ غالباً اسی لیے اس شعر پر بہت لے دے بھی ہوتی رہی ہے ۔'' فرمایا ''کس بنا پر ؟'' مجید ملک نے کہا ''اس وقت خیال نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ مختلف رسالوں میں اس شعر پر لمبی لمبی تنقیدیں چھپتی رہی ہیں ۔'' فرمایا ''اپنا اپنا خیال ہے ۔ مجھے یہ شعر بہت پسند ہے ۔ فنّی لحاظ سے اچھا ہے ، خیال میں جدّت ہے ، پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے تصویر کھنچ جاتی ہے ۔''[۱]

☆ ☆ ☆

۱- انوار اقبال ، مرتبّہ بشیر احمد ڈار ، ص ۲۰ ۔

۱۱

میاں شاہ دین ہمایوں

(۱۹۱۸ء)

جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں باغبان پورہ لاہور کے مشہور میاں خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۲ اپریل ۱۸۶۸ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولوی نظام الدین ایک فاضل بزرگ تھے اور دادا مولوی قادر بخش فارسی اور عربی کے جیّد عالم۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں وہ شاہی خاندان کے بچوں کی اتالیقی پر مامور تھے۔ طبیعت شعر و سخن کے لیے نہایت موزوں پائی تھی۔ نادر تخلص کرتے تھے لیکن ان کا مجموعۂ کلام دست بردِ حوادث سے محفوظ نہ رہ سکا۔

ہمایوں مرحوم کی ابتدائی تعلیم باغبان پورہ میں ہوئی۔ چھ برس کی عمر میں کلامِ مجید ناظرہ ختم کیا۔ مڈل کے امتحان میں اوّل آئے۔ انٹرنس میں پنجاب بھر میں انگریزی میں اوّل رہے۔ بی۔ اے۔ کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۸۸۷ء میں مزید تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور ۱۸۹۰ء میں بیرسٹر بن کر واپس آئے۔ آتے ہی اپنے انگریزی لیکچروں اور اردو تقریروں سے اپنی علمیت اور جودتِ طبع

کی دھاک بٹھائی اور پنجاب یونی ورسٹی کی مجلسِ انتظامیہ کے رکن نامزد ہو گئے ۔

۱۸۹۳ع میں انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں مسلمانانِ پنجاب کی تعلیمی حالت پر نہایت پُر مغز ، معنی خیز اور بیدار کُن لیکچر دیا ۔ سرسید احمد خاں اس لیکچر کی عمدگی اور مقرر کی سنجیدگی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے آیندہ سال ان کو اس کانفرنس کی صدارت پیش کی ۔ اس وقت ان کی عمر صرف چھبیس سال تھی ۔ اس کے بعد قوم نے انھیں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی دوسری نشست منعقدہ مارچ ۱۹۰۸ع کا صدر منتخب کیا ۔ ۱۹۱۳ع میں وہ دوبارہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر چنے گئے اور ان کا خطبۂ صدارت اپنی فصاحت و بلاغت اور تجاویز کی نوعیت کے لحاظ سے بہت پسند کیا گیا ۔ یہاں تک کہ حکومت نے بھی انھیں یکے بعد دیگرے اعزازات پیش کیے ۔ پہلے وہ پنجاب کی مجلسِ وضعِ قوانین کے رکن نامزد کیے گئے ، پھر عدالت عالیہ (چیف کورٹ) میں جج مقرر ہوئے جہاں سے وہ چیف ججی کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچ گئے ۔

ان کا قد چھوٹا ، بدن بھاری ، چہرہ کتابی شہابی ، پیشانی فراخ ، ناک بلند ، آنکھیں قدرتی طور پر خمار آلود ، ابرو گھنے ، ہونٹ پتلے پتلے ، بال پیچھے کی طرف مڑے ہوئے ، داڑھی سیاہ بھری بھری اور مقطّع قسم کی ، شکل سے بزرگی ، نیکی اور تدبّر و فکر کی علامات نمایاں تھیں ۔ کم گو ، متین اور مستعد تھے ۔ طبیعت شروع ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل تھی ۔ انگلستان جانے سے قبل قدیم رنگ میں عشقیہ غزلیں کہتے تھے ۔ واپس آئے تو یہ رجحان بالکل بدل گیا ۔

بعد کا کلام قومی درد سے لبریز اور خیال افروز ہے۔ منتخب مجموعۂ کلام ''جذباتِ ہمایوں'' کے نام سے ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے میاں بشیر احمد بار ایٹ لاء نے شائع کیا۔

جسٹس شاہ دین ہمایوں سے علامہ اقبال کے نہایت مخلصانہ تعلقات تھے۔ میاں صاحب ۱۸۹۰ع میں ولایت سے بیرسٹر بن کر آئے تو ایک طرف ان کا علی گڑھ تحریک سے خاص تعلق پیدا ہوا، دوسری طرف وہ لاہور کے قابل نوجوانوں کے دائرے کے مرکز بن گئے۔ اس دائرے میں اقبال بھی شامل تھے۔ چنانچہ اپنی پہلی نظم 'چمن کی سیر' میں، جو اکتوبر ۱۹۰۱ع کے 'مخزن' میں شائع ہوئی، حضرت ہمایوں فرماتے ہیں:

اعجاز[1]! دیکھ تو سہی یاں کیا سماں ہے آج
نیرنگ[2]! آسمان و زمیں کا نیا ہے رنگ
اقبال[3]! تیری سحر بیانی کہاں ہے آج
ناظر[4]! کمانِ فکر سے مار ایک دو خدنگ

از نغمہ ہائے دلکشِ این چار یارِ ما
پنجاب خوش نواست ہمایوں دیارِ ما

''شالامار باغ کشمیر'' پر ایک نظم لکھی جو 'مخزن' میں جون ۱۹۰۳ع

۱۔ اعجاز حسین اعجاز۔
۲۔ میر غلام بھیک نیرنگ۔
۳۔ علامہ اقبال۔
۴۔ چودھری خوشی محمد ناظر۔

میں شائع ہوئی ۔ اس میں فرماتے ہیں :

ناظر! بڑا مزا ہو جو اقبال ساتھ دے
ہر سال ہم ہوں ، شیخ[1] ہو اور شالامار ہو

اقبال نے بھی اپنے بعض اشعار میں ہمایوں کا ذکر نہایت محبت سے کیا ہے ۔ چنانچہ اس غزل میں جس کا مطلع یہ ہے :

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے
بجلیاں بے تاب ہوں جس کے جلانے کے لیے

ایک شعر یہ بھی تھا جسے نظر ثانی کے وقت اقبال نے قلمزد کر دیا تھا ۔[2]

ترک کر دی تھی غزل خوانی مگر اقبال نے
یہ غزل لکھی ہمایوں کو سنانے کے لیے

۲ جولائی ۱۹۱۸ع کو ہمایوں نے لاہور میں انتقال کیا اور اپنے آبائی قبرستان واقع باغبان پورہ میں دفن ہوئے ۔ اس سانحۂ ارتحال پر اقبال نے اپنے جذباتِ غم کا اظہار اس نظم میں کیا ہے جو ''بانگِ درا'' میں ''ہمایوں'' کے عنوان سے موجود ہے ۔ یہ ایک شاعر کی طرف سے دوسرے شاعر کی خدمت میں آنسوؤں کا خراج ہے اور یقیناً اقبال کی بہترین نظموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے :

اے ہمایوں ! زندگی تیری سراپا سوز تھی
تیری چنگاری چراغِ انجمن افروز تھی

۱- شیخ عبدالقادر مدیر ''مخزن'' لاہور ۔
۲- باقیاتِ اقبال ، ص ۳۹۲ ، مخزن نومبر ۱۹۰۱ع ۔

گرچہ تھا تیرا تنِ خاکی نزار و دردمند
تھی ستارے کی طرح روشن تری طبعِ بلند
کس قدر بے باک دل اس ناتواں پیکر میں تھا
شعلۂ گردوں نورد اک مشتِ خاکستر میں تھا
موت کی لیکن دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں
شب کی خاموشی میں جز ہنگامۂ فردا نہیں
موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

ایک اور شعر بھی ملتا ہے جس سے اس دلی لگاؤ کا اظہار ہوتا ہے جو اقبال کو ہمایوں سے تھا :

دوش بر خاکِ ہمایوں بلبلے نالید وگفت
اندریں ویرانہ ما ہم آشنائے داشتیم

اس سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال ان سے کس قدر آشنا تھے بلکہ یہ اس زمانے کی یاد بھی تازہ کراتا ہے جب علمی صحبتوں میں یہ لوگ مل کر بیٹھتے تھے اور جب ہمایوں مرحوم نے لاہور میں محمڈن ینگ مین ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی تھی ۔

اقبال نے یہ قطعۂ تاریخ بھی موزوں کیا تھا جو ہمایوں کی قبر پر کندہ ہے ۔ اس میں ہمایوں کی نکتہ سنجی ، خوش آہنگی اور فصاحت کا اعتراف کیا گیا ہے :

در گلستانِ دھر ھمایونِ نکتہ سنج
آمد مثالِ شبنم و چوں بوئے گل رمید

می جست "عندلیب خوش آہنگ سال فوت"

۱۳۳٦ھ

علّامۂ فصیح زہر چار سو شنید

۳۳۴ × ۴ = ۱۳۳٦ھ

"علّامۂ فصیح" کے اعداد کو چار سے ضرب دینے کے بعد مطلوبہ تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ "علامۂ فصیح" کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن چند ہستیوں کی اقبال کے دل میں بہت قدر و منزلت تھی، ان میں ایک ہمایوں مرحوم بھی تھے۔ ہمایوں کے قابل فرزند میاں بشیر احمد بار ایٹ لاء نے جنوری ۱۹۲۲ء میں رسالہ "ہمایوں" انھی کی یادگار کے طور پر جاری کیا تھا[1] جس میں کبھی کبھی علامہ اقبال کا تازہ کلام بھی شائع ہوتا تھا۔

☆ ☆ ☆

۱۔ ملفوظاتِ اقبال، مرتّبۂ محمود نظامی، صفحات ۲۱ - ۲۵ -

۱۲

غلام محمد طُور

(۱۹۱۸ء)

پروفیسر غلام محمد طور ایم ۔ اے ، شیخ غلام محی الدین سابق وزیر ریاستِ جموں و کشمیر کے فرزند اور اقبال کے دوست تھے ۔ جولائی ۱۸۸٦ء میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ مولانا عبدالسلام کو شاہجہان کے عہد میں بارگاہ شاہی سے بعض خدمات کے صلے میں کارداری کے مالی ، دیوانی اور فوجداری عہدے حاصل ہوئے ۔ سیالکوٹ اور گورداسپور کے ضلعوں میں جاگیریں بھی ملی تھیں ۔ سکھوں کی عمل داری میں بھی اس خاندان کا ستارہ اوج پر رہا ۔ شیخ غلام رسول مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مصاحب اور شیخ امام بخش کاردار تھے ۔

طور ایم ۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد سیالکوٹ کے مشن کالج میں تاریخ کے لیکچرار مقرر ہوئے ۔ پھر ایم ۔ اے ۔ او کالج علی گڑھ میں تاریخ کے اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر متعین کیے گئے ۔ آپ انگریزی ، فارسی اور اردو میں اچھی خاصی مہارت رکھتے تھے

اور مستند اہلِ قلم شمار ہوتے تھے ۔ اخبار ''آبزرور'' ، ''اخبارِ وطن'' ، ''ہمدرد'' اور '' کامریڈ'' کے صیغۂ ادارت میں بھی وقتاً فوقتاً کام کیا ۔ رسالہ ''مخزن'' بھی کچھ دن ان کے ہاتھوں میں رہا ۔[1]

شاعری سے آپ کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی ۔ کشمیر کے قدرتی نظارے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے ۔ انھوں نے کوہسارِ شملہ کا لطف بھی اٹھایا تھا ۔ اس لیے نظموں میں جہاں عشق و محبت اور درد و سوز کی چاشنی ہے وہاں قدرت کی رنگینی کی نقاشی بھی موجود ہے ۔ شاعری کو وہبی اور عطیۂ الٰہی سمجھتے تھے ۔ استادی شاگردی کے قائل نہ تھے ۔ افسوس ہے کہ عمر تھوڑی پائی اور ۲۱ نومبر ۱۹۱۸ع کو صرف ۳۲ سال کے سن میں انتقال کیا ۔

طور غزلیں کم کہتے تھے ، نظمیں زیادہ لکھتے تھے ۔ ان کا مجموعۂ کلام '' کلامِ طور'' کے نام سے ۱۹۲۱ع میں نسیم ایجنسی دہلی نے شائع کیا تھا جس پر اقبال نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا ۔ یہ رائے نذر محمد سیالکوٹی کی کتاب ''بھارت سبھا'' (حصہ اول موسوم بہ 'مشاہیر ہند') میں ''کلامِ طور'' کے اشتہار کے طور پر درج ہے :

''کلامِ طور میری نظر سے گزرا ۔ بہت اچھا کلام ہے ۔ طور مرحوم ایک ہونہار شاعر تھے مگر افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی ۔ بہرحال جو کچھ انھوں نے لکھا ، بہت اچھا لکھا ۔ کاش ! ان کو اپنے مجموعۂ کلام پر نظرثانی کی مہلت مل سکتی ۔''[2]

۱- خم خانۂ جاوید ، جلد پنجم ، صفحات ۴۵۱ - ۴۵۲ -
۲- انوار اقبال ، ص ۳ -

نمونۂ کلام حسبِ ذیل ہے :

جہانِ فانی کے ذرّے ذرّے میں ہے تغیّر کا رنگ پیدا
تو ایسے صحرا میں سخت مشکل ہے سیرِ فصلِ بہار کرنا

رہے گلشن میں ہم جب تک، رہے گلشن کی جاں ہو کر
ہنسی گل کی، چٹک غنچے کی، بلبل کی فغاں ہو کر
یہ کیا رہنا ہے گر دل میں رہے رازِ نہاں ہو کر
رہے نور آنکھ میں، سینے میں دل، قالب میں جاں ہو کر

ازل میں جو شرارے اس رُخِ روشن کے چمکے تھے
وہی خورشیدِ خاور ہیں، وہی ماہِ منوّر ہیں

الٰہی! کون سی بجلی نہاں ہے بے قراروں میں
کہ اہلِ آسماں شامل ہیں ان کے غمگساروں میں

چھپانا شاہدِ گل کو ہے گر چشمِ عنادل سے
بنا دے باغباں گلشن میں اک دیوار پھولوں کی

شمعِ آخرِ شب ہیں ہم محفلِ جہاں میں
باقی رہے گی کب تک پھر داستاں ہماری

شاعر کی محفل

چراغاں ہو رہا ہے ہر طرف گلزار عالم میں
ہے تاریکی مگر شاعر کی بزمِ رنج و ماتم میں

ٹپکتی ہے مسرّت اہلِ عالم کی نگاہوں سے
ہجومِ اشکِ خوں افگن ہے اس کی چشمِ پرنم میں
جہاں والوں کی جاں میں جان آئی دیدِ یاراں سے
مگر وہ جان دیتا ہے کسی کے ہجر کے غم میں
نظارے کر رہے ہیں اہلِ عالم نازنینوں کے
وہ نظّارات بالا کر رہا ہے فکرِ پیہم میں
وہ ہے موجود عالم میں مگر مفقود گمراہی
وہ پوشیدہ بھی ہے عالم سے ظاہر بھی ہے عالم میں
مگر سننا خدا را ، طور کی آواز آتی ہے
کسی سے ہے مگر گویا وہ تنہائی کے عالم میں

یادِ رفتگاں

یاس و حسرت کیوں اُمنڈ آئے ہیں مجھ ناشاد پر
ہو رہی ہے کس لیے اقلیمِ دل زیر و زبر
کیوں ڈبونے کو مجھے ہے موج بحر اضطراب
کیوں بہا جاتا ہوں اس دریا میں جوں طفلِ حباب
کیوں تلاطم میں ہے اے دریائے چشم خوں فشاں
تیرے ہر قطرے میں ہے سامان بحر بے کراں
میں ترا ممنوں ہوں اے احسانِ یاد رفتگاں
شوق سے آ اور لے پہلو میں میرے چٹکیاں
میری قسمت میں ازل سے ہے لکھا سوز و گداز
میرے سینے میں خدا نے ہے بھرا سوز و گداز

برق خرمن نور حسن اوّلیں کی مجھ میں ہے
آتشِ عشق اک بت پردہ نشیں کی مجھ میں ہے
درد کہتے ہیں جسے میں اس کی اک تصویر ہوں
درد کی یعنی بنا ہوں ، درد کی تعمیر ہوں
تیری منزل میرے دل سے بڑھ کے ہوسکتی ہے کیا
اس سے بڑھ کر کون سا ہوگا مقام آرام کا

نوحۂ محبت

تجھے کیا ہوا ؟ ہوئی کیا تری وہ وفا شعاری ؟
ترے دل سے سنگ دل ! تھی کبھی جوئے مہر جاری
کبھی جس سے بہرہ ور تھا ، کبھی جس سے پُر ثمر تھا
مرا نخلِ زندگانی

تجھے کیا ہوا ؟ ہوئیں کیا تری دل نوازیاں وہ ؟
تری غم گساریاں وہ ، تری چارہ سازیاں وہ ؟
مری جاں وہ دن بھی کیا تھا کہ تو مجھ پہ خود فدا تھا
ہوئی کیا وہ خوش گمانی

تجھے کیا ہوا ؟ ہوئی کیا تری ہائے ! وہ محبّت ؟
جو مجاز تھی بظاہر ، پہ دراصل تھی حقیقت
مٹی تیرے دل سے یکسر ، کروں کس طرح سے باور ؟
کہ یہ شے نہیں تھی فانی !

تجھے کیا ہوا ؟ ہوئی کیا تری وہ حیا پسندی ؟
کہ ابھی نہ شوخیاں تھیں ترے طفل دل نے سیکھی
ترا حسن ، عشق میرا ابھی سیدھا سادہ سا تھا
تھی یہ مختصر کہانی

تجھے کیا ہوا ؟ نگاہیں پھریں کیوں وہ دلبرانہ ؟
بلا جن کی گودیوں میں مرا ذوقِ شاعرانہ
وہی مشعلِ محبت ، وہی شمعِ بزمِ الفت
وہ چراغ لامکانی

تجھے کیا ہوا ؟ ہوئیں کیا تری پیاری پیاری باتیں
مجھے یاد ہوبہو ہیں ، مری جاں وہ ساری باتیں
ترا مجھ سے وہ لپٹنا ، مرا تجھ سے پیار کرنا
بہ کمالِ جانفشانی

تجھے کیا ہوا ؟ ہوا کیا وہ زمانۂ فراغت
کہ میں جس کو رو رہا ہوں ، وہی روزگار فرصت
وہی پیاری ہم نشینی ، گلِ رُخ کی بوسہ چینی
ہوئی کیا وہ زندگانی

تجھے کیا ہوا ؟ ہوا کیا ترا جذبۂ محبت
کہ سکوں نے جس کے مجھ پہ ہے اٹھا رکھی قیامت
میں مروں گا بے اجل کیا ہے یہی ثمر وفا کا
مرے او جفا کے بانی[1]

☆ ☆ ☆

۱- شعلۂ طور ، مطبوعہ مرغوب ایجنسی لاہور ، ۱۹۱۷ع ، صفحات ۱۰ - ۱۴ -

۱۳

اکبر الہ آبادی

(۱۹۲۱ء)

سیّد اکبر حسین رضوی ، جو لسان العصر اکبر الہ آبادی کے نام سے معروف ہیں ، ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء مطابق ۲۷ ذی القعدہ ۱۲۶۳ھ کو بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد سید تفضّل حسین عرف چھوٹے میاں نہایت فاضل اور صوفی بزرگ تھے ۔ وہ نائب تحصیل داری کے عہدے پر فائز تھے ۔ انھوں نے بیٹے کو ابتدائی عربی فارسی کتابیں گھر میں پڑھا کر ۱۸۵۶ء میں جمنا مشن اسکول میں داخل کرایا مگر تین ہی سال بعد نامعلوم وجوہ کی بنا پر انھیں اسکول چھوڑنا پڑا ۔ پھر ذاتی طور پر مطالعہ جاری رکھا ۔ اس طرح انگریزی ، فلسفہ اور تصوّف میں اچھا خاصا درک حاصل کر لیا ۔

تصوّف کی طرف ان کی طبیعت ابتدا ہی سے مائل تھی ۔ ان کا خاندانی مذاق بھی عارفانہ تھا ، اس لیے عالمِ طفولیت ہی سے اپنے والد سید تفضّل حسین صاحب کی طرح دانا پور (بہار) کی خانقاہ چشتیہ نظامیہ کے سجادہ نشین سیّدالطریقت سید شاہ محمد قاسم ابوالعلائی

کے مرید اور ان کی توجہِ باطنیہ کا مرکز تھے - یہ انھی کا فیضِ نظر تھا کہ اکبر اپنی عمر کے ساتھ ساتھ روحانیت میں ترقی کرتے رہے ، گو اُنھوں نے باضابطہ صوفی ہونے کا دعویٰ کبھی نہ کیا - کتاب ''نذرِ محبوب'' (مطبوعہ آگرہ ۱۳۰۳ھ) میں ان کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے :

''برادر بجاں برابر گرامی شان سید اکبر حسین صاحب صدر الصدور غازی پور سلمہ‌اللہ تعالیٰ کی ذات میں بفضلہ سیادت و حکومت دونوں اضافتیں جمع ہیں - زمانۂ طفولیت ہی میں برادر موصوف نے ہمارے پیر و مرشد برحق سید شاہ محمد قاسم دانا پوری قدس سرہ‘ سے بیعت کی تھی - الحمدللہ کہ اس کا اثر پورا پورا اس وقت تک باقی ہے - اور باوجودیکہ زمانۂ دراز تک برادر موصوف سید احمد خاں صاحب کے جلسوں میں شریک رہے مگر اعتقادات میں فرق نہ آیا - چنانچہ برادر موصوف نے مجھے علی گڑھ سے ایک خط لکھا تھا - اس کی نقل بجنسہ اس مقام پر تحریر کی جاتی ہے :

''سرتاج برادرانِ طریقت ، مسند آرائے بزمِ معرفت زاداللہ عرفانہ‘ تسلیم !

آپ کی تحریر کے ورود نے عزت بخشی - آپ کا خیال نہایت عمدہ ہے - آپ ہی کے گھر کا فیض ہے کہ اس زمانے میں اور اس حالت میں بھی میرے عقائد محفوظ ہیں - وہی ہوا ہے کہ

اس طوفانِ بے تمیزی میں بھی درِ دل سے کبھی کبھی
پردۂ غفلت آلٹ دیتی ہے اور یہ شعر زبان پر آ جاتا
ہے :

حلقۂ پیر مغانم زازل درگوش است
بر ھمانیم کہ بودیم ہماں خواھد بود

موروثی معتقد[1]
اکبر حسین"

اکبر نے شروع شروع میں معمولی ملازمتیں کیں - ۱۸۶۸ء میں وکالت کا ادنٰی امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار ہوئے اور پھر داروغۂ آبکاری ہوگئے - ۱۸۷۰ء میں ہائی کورٹ میں چیف جج کے مثل خواں مقرر ہوئے - ۱۸۷۳ء میں وکالت کا اعلٰی امتحان پاس کر کے ۱۸۸۰ء تک وکالت کی - اسی سال منصف مقرر ہوئے ، جہاں سے ترقی کر کے ۱۸۹۳ء میں عدالتِ خفیفہ کے جج اور ۱۸۹۴ء میں ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج ہو گئے - ۱۹۰۳ء میں انھیں ہائی کورٹ کی ججی پیش ہوئی مگر آنکھوں کی تکلیف کی بنا پر قبول نہ کی بلکہ ملازمت ہی سے سبکدوشی حاصل کر لی -

۱۵ دسمبر ۱۹۰۹ء کو آنکھ کا آپریشن کرایا - ۵ جون ۱۹۱۳ء کو ان کا جوان بیٹا ہاشم داغِ مفارقت دے گیا - بیوی اس سے پہلے فوت ہوچکی تھیں - ان صدموں سے ان کا سکونِ خاطر ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا اور وہ مسلسل بیمار اور پریشان رہنے لگے - آخر

۱- حاشیۂ حیاتِ اکبر ، مصنفۂ سیّد عشرت حسین ، ص ۵۳ -

۹ ستمبر ۱۹۲۱ء (۶ محرم ۱۳۴۰ھ) کو خود بھی اس دارِ فانی سے چل بسے - بیماری کے دنوں میں موت کو اکثر یاد کیا کرتے تھے، جیسے ان کی زندگی رفیقِ اعلیٰ سے ملنے کے لیے ایک تڑپ تھی :

سر جھکا کر یاد کر لیتا ہوں اپنی موت کو
حاضری ہو جاتی ہے اللہ کے دربار کی

مگر ان کی دلی آرزو یہ تھی کہ کوئی ایسا کام کر جائیں جس سے دنیا انھیں بھلا نہ سکے - وہ خدا سے اس کی توفیق مانگتے رہتے تھے :

دعا ہے کہ مر کر بھی رہ جاؤں کچھ
وگرنہ یونہی مر کے رہ جاؤں گا

وہ اپنی طرز کے بے نظیر شاعر تھے - اپنے عصر کے حالات سے متاثر اور ملک و ملّت کی صلاح و فلاح اور ترقی و عروج کے خواہاں تھے - اُنھوں نے خیال کی حرّیت اور فکر کی آزادی کا ایک خاص انداز اختیار کر کے اپنے اشعار سے خوب کام لیا - ان کی شاعری مغربی تہذیب کے خلاف ایک زبردست احتجاج تھی - وہ بے غرض مصلح تھے اور اسی حیثیت سے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور اب تک یاد کیے جاتے ہیں -

علامہ اقبال کو حضرت اکبر الہ آبادی سے دلی عقیدت تھی - وہ عمر اور تجربے میں اقبال سے بڑے اور شاعری میں ان کے پیش رو تھے - یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کے روابط کا سلسلہ کب اور کیسے شروع ہوا ، البتہ گمانِ غالب ہے کہ اخبار و رسائل میں ایک دوسرے کا کلام دیکھ کر دونوں ایک دوسرے کی قدر و قیمت سے واقف ہوئے ہوں گے - اقبال ان کو اپنا پیر و مرشد اور راہبر قرار دیتے

تھے - دو چار مرتبہ ان کی زیارت سے آنکھیں روشن کرنے کے لیے الہ آباد بھی گئے تھے - خط و کتابت بھی رہتی تھی جس میں دونوں ایک دوسرے کے کلام کی دل کھول کر داد دیتے تھے - حضرت اکبر نے اپنے خطوط میں اقبال کو اپنا ''روحانی دوست'' کہا ہے اور ان سے ملنے کی تمنّا ظاہر کی ہے -

یہ اس وقت کی بات ہے جب اقبال کی شاعری نیا نیا نشان بلند کر رہی تھی اور ان کی شہرت پنجاب کی حدود سے نکل کر ہندوستان میں پھیلنی شروع ہوئی تھی - تاہم ابھی ان کی شاعری کو بین الملی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی - مگر اکبر نے پُوت کے پاؤں پالنے ہی میں پہچان لیے تھے - انھوں نے ابتدا ہی میں اندازہ لگا لیا تھا کہ اقبال کا ستارہ کس بلندی پر جانے والا ہے - اور اگر اس جوہرِ قابل کی حفاظت و پرداخت کی گئی تو یہ ساری دنیا میں چکاچوند پیدا کر دے گا - وہ چاہتے تھے کہ اپنے دل کی گرمی بھی اقبال کے قلب میں منتقل کر دیں - باہمی مراسلت سے جہاں دونوں کی سیرت و کردار اور عظمت و کمال پر روشنی پڑتی ہے، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے -

عقیدت و محبّت کے ایسے گہرے تعلقات کو ملحوظ رکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کو بے شمار خط لکھے ہوں گے - قرائن بھی اس کے حق میں ہیں کہ ضرور لکھے گئے تھے مگر افسوس کہ دونوں کی مراسلت سے صرف چند خط ہم تک پہنچ سکے ہیں اور وہ بھی ۱۹۱۱ع سے ۱۹۲۰ع تک کے درمیانی عرصے کے - البتہ ۱۹۱۰ع کے ایک انگریزی لیکچر میں ان کا ذکر ملتا ہے جو

آغازِ سرما میں اقبال نے اسٹریچی ہال ایم ۔ اے ۔ او کالج علی گڑھ میں دیا تھا ۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس کا اردو ترجمہ ''ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کے عنوان سے مارچ ۔ اپریل ۱۹۱۱ع کے ''پنجاب ریویو'' میں شائع کیا ۔ پھر مئی ۱۹۱۱ع میں برکت علی اسلامیہ ہال لاہور کے ایک جلسے میں پڑھ کر سنایا گیا جو خاص اسی مقصد کے لیے منعقد ہوا تھا اور جس میں علامہ اقبال خود بھی موجود تھے ۔ اس میں دو جگہ حضرت اکبر کا ذکر نہایت اچھے الفاظ میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ برِعظیم کی اسلامی اور معاشری زندگی ، بالخصوص تعلیم یافتہ پود کی ذہنی بیداری میں حضرت اکبر کے اثرات خاصے نمایاں ہیں ۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :

''جناب مولانائے اکبر الہ آبادی ، جنھیں موزوں طور پر ''لسان العصر'' کا خطاب دیا گیا ہے ، اپنے بذلہ سنجانہ پیرایے میں ان قوتوں کی ماہیت کے احساس کو چھپائے ہوئے ہیں ، جو آج کل کے مسلمانوں پر اپنا عمل کر رہی ہیں ۔ ان کے کلام کے ظریفانہ لہجے پر نہ جائیے ۔ ان کے شباب آور قہقہے ان کے آنسوؤں کے پردہ دار ہیں ۔ وہ اپنے نہاں خانۂ صنعت میں اس وقت تک آپ کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے جب تک آپ ان کا مال خریدنے کے لیے ذوقِ سلیم کے دام اپنی جیب میں ڈال کر نہ آئیں ۔''[1]

یہ پہلا دستاویزی ثبوت ہے جو اکبر سے اقبال کے متاثر ہونے

۱۔ ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر ۔

کی نشان دہی کرتا ہے ۔ اس کے بعد وہ خطوط ہیں جن میں ایک دوسرے سے ہم کلام ہونے اور ایک دوسرے کی شخصیت میں دلچسپی لینے کے شواہد ملتے ہیں ۔ اقبال کا پہلا خط حضرت اکبر کے نام ۶ اکتوبر کا اور دوسرا ۹ نومبر ۱۹۱۱ع کا ہے ۔ ان کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ خط و کتابت کا سلسلہ اس سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا اور اقبال کے پاس اس وقت بھی حضرت اکبر کے کئی خط موجود تھے جنھیں وہ حرزِ جاں بنائے ہوئے تھے اور تنہائی میں بار بار پڑھ کر ان سے مستفید ہوتے تھے ۔ چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں :

> ''آپ کے خطوط ، جو سب میرے پاس محفوظ ہیں ، بار بار پڑھا کرتا ہوں اور تنہائی میں یہی خاموش کاغذ میرے ندیم ہوتے ہیں ۔''[1]

> ''آپ کے خطوط سے مجھے نہایت فائدہ ہوتا ہے اور مزید غور و فکر کی راہ کھلتی ہے ۔ اسی واسطے میں ان خطوط کو محفوظ رکھتا ہوں کہ یہ تحریریں نہایت بیش قیمت ہیں اور بہت سے لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہے ۔''[2]

خدا کرے یہ بیش قیمت تحریریں اب بھی محفوظ ہوں اور شائع ہو کر لوگوں کو فائدہ پہنچا سکیں ۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے جب ہفتہ وار ''شیرازہ'' جاری کیا تھا تو حضرت اکبر کے دو تین خط علامہ اقبال سے لے کر شائع کر دیے تھے ۔ ہماری کل کائنات یہی ہے ۔

جیسا کہ نجی خطوں میں عام طور پر ہوتا ہے ، اقبال کے خطوں

---

۱ ، ۲ ۔ اقبال نامہ ، جلد ۲ ، صفحات ۳۸ - ۴۴ ۔

کے مضامین میں بہت کچھ تنوع ہے۔ خیریت و مزاج پُرسی ، علالت پر اظہارِ تردد ، شوقِ ملاقات اور متوقع ملاقات پر اپنی خوشی اور خوش نصیبی کا اظہار ، لاہور آنے کی دعوت ، موسم کی کیفیت ، اعزہ واحباب کی یاد اور ان کے انس و لطف کا ذکرِ خیر ، لاہور میں انفلوئنزا کی وبا کا ذکر ، اپنے سفر اور سیاحت کا حال ، اپنی اور اکبر کی ہم رنگی اور ہم مذاق کا اعتراف ــــ اس نوع کے دوستانہ اور محبانہ کوائف ۔ پھر ملک و قوم کی معاشری ، سیاسی ، علمی اور نفسیاتی کیفیات کا حال : مثلاً لاہور میں ہمدم و ہمراز کے نہ ہونے کی شکایت ، اپنے ہم خیالوں کی نایابی اور اپنی تنہائی کا رونا ، لاہور میں ضروریات اسلامی سے لوگوں کی ناواقفیت ، پنجاب میں صحیح قسم کے علما اور صحیح اسلامی سیرت رکھنے والے نوجوانوں کا فقدان ، صوفیا کی ابتر حالت اور جمود پر افسوس ، ترکوں کی فتح ، دہلی دربار ، گاندھی جی کا خاموش مقابلہ ، کلکتے کا فساد ، پنجاب کا مارشل لاء ، لاہور کی مخدوش حالت وغیرہ ــــ یہ تمام مضامین نہایت بے تکلفی سے ادا ہوئے ہیں ۔ ان سے خط لکھنے والے کے خلوص ، دلی اضطراب ، نفسیاتی کیفیت اور ان احساسات و افکار کا پتا چلتا ہے جو اس کے بلند مرتبہ اور پہناور اقوال و اشعار کے محرک ہوتے رہے ہیں ۔ سب سے اہم خط وہ ہیں جن میں مکتوب الیہ سے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے ۔ ان کے کلام کا تجزیہ کر کے محاسن و معائب بیان کیے گئے ہیں اور اشعار کی باریکیوں اور فلسفیانہ نکات پر بحث کر کے حقائق و معارف کی پردہ کشائی کی گئی ہے۔

اقبال کی طرح حضرت اکبر کے خطوط کے بھی کئی مجموعے

شائع ہو چکے ہیں ۔ ان میں اقبال کے نام کا تو کوئی خط نہیں ہے مگر اقبال کا ذکر جگہ جگہ آتا ہے ۔ تعریف کے رنگ میں بھی اور خفگی کے انداز میں بھی ۔ اچھے رنگ میں تو یوں کہ وہ اقبال کو اپنا صحیح جانشین سمجھتے تھے اور دل سے خواہش مند تھے کہ "ان کی عظمت اور محبوبیت قائم رہے ۔"[۱] ان کے نزدیک "اقبال نہایت عالی خیال بزرگ ہیں اور اسلامی جماعت کے ترقی خواہ ۔ ان کی طبیعت نہایت غیور واقع ہوئی ہے ۔"[۲] وہ خواجہ حسن نظامی سے اقبال کے مشغول فی الطاعۃ ہونے کا ذکر سن کر خوش ہوتے اور کہتے تھے :

"پس آپ شہداء علی الناس میں داخل ہیں یا ہو جائیں گے ـــــ خیر جو کچھ ہوا اب آپ کے سپرد چارج ہے ۔ ہم تو آپ کی ملاقات کی مسرت مول لینے پر مستعد ہیں ۔"[۳]

اس محبت اور شفقت کے باوجود ، جو اکبر کو اقبال سے تھی ، وہ جہاں مخالفت ضروری سمجھتے تھے اس کا برملا اظہار کر دیتے تھے اور کوئی لگی لپٹی نہ رکھتے تھے ۔

ادبی پہلو سے دونوں کے خطوط خصوصیت کے حامل ہیں ۔ دونوں شاعر تھے ، دونوں فلسفی تھے ، دونوں کے قلوب اپنے عصر کے حالات سے متاثر تھے اور دونوں کو اپنی ملّت اور اپنے وطن کی صلاح و فلاح اور ترقی و عروج عزیز تھی ۔ ایک لسان العصر

۱۔ خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی ، ص ۹۷ ۔ اکبر اس دور میں ، مرتّبہ اختر انصاری اکبرآبادی ، ص ۱۷۴ ۔

۲۔ مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد ، ۱۳ دسمبر ۱۹۱۶ء ۔

۳۔ اکبر بنام اقبال ، ۳ مارچ ۱۹۱۲ء ۔

تھا ، دوسرا ترجمانِ حقیقت ۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچانتے اور ایک دوسرے کی روح میں اتر گئے تھے ۔ دونوں ایک دوسرے کو کلام اور فکر کی داد دیتے تھے ۔ اقبال نے اپنے کئی خطوں میں بڑے خلوص اور جوش کے ساتھ الہاماتِ اکبر کی تحسین کی ہے اور ان کے رنگ میں شعر کہہ کر ان کی فوقیت کا اعتراف کیا ہے ۔ ایک مرتبہ اپنے ایک فارسی مصرع :

ایں سرِّ خلیل است بہ آزر نتواں گفت

پر حضرت اکبر سے مصرع بھی طلب کیا ہے ۔

اکثر خط مثنوی "اسرارِ خودی" کے افکار و خیالات پر مشتمل ہیں اور تصوّف کی نوعیت اور چگونگی کی تشریح و توضیح کرتے ہیں ۔ یہ مثنوی ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی ۔ اس کے مذہبی اور قومی جوش اور اشعار کی تعریف[1] کرنے کے باوجود حضرت اکبر کو اس کے بعض مضامین مثلاً خودی ، تصوّف اور حافظ شیرازی کی شاعری پر تنقید کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی اور انھوں نے اسی بنا پر مثنوی کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا تھا ۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ :

"اقبال بادۂ سخن کو چھوڑ کر محتسبِ فلسفہ کا دُرّہ اٹھائیں
بہ عوض اس کے ہم رندانِ بےسامان کے ساقی بنے رہیں ۔
ہمارے سروں پر تیغ بکف آئیں ۔ ہم کو ان سے محبت ہے ۔"[2]

خواجہ حسن نظامی اس مثنوی کے اختلافی پہلوؤں پر نہ صرف خود

۱- خطوطِ مشاہیر ، ص ۸۲ ۔
۲- مکتوباتِ اکبر بنام مرزا سلطان احمد ، صفحات ۶۸ - ۶۹ ۔

مضامین لکھ رہے تھے بلکہ اپنے احباب سے بھی لکھوا رہے تھے ۔ علمی بحث نہیں کرتے تھے ۔ محض اقبال کو حریف قرار دے کر بدنام کرنا چاہتے تھے ، مگر اقبال خواجہ صاحب کو تصوّف کی تاریخ و ادبیات اور علومِ قرآن سے ناواقف سمجھ کر معذور جانتے تھے اور اپنے پیر و مرشد حضرت اکبر سے شکایت کرتے تھے کہ خواجہ صاحب نے خواہ مخواہ ''مشہور کر دیا ہے کہ میں صوفیائے کرام سے بدظن ہوں ۔''[۱] پھر اس غلط الزام کی تردید کرتے تھے کہ :

''خواجہ حافظ کے دیوان کے مطالعے سے میکشی بڑھ گئی ہے ۔ حالانکہ 'اسرارِ خودی' میں جو کچھ کہا گیا ہے ، وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید ہے ، جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر ہے ۔ خواجہ حافظ کی ولایت سے اس تنقید میں کوئی سروکار نہیں ، نہ ان کی شخصیت سے ۔''[۲]

اسی سلسلے میں حافظ علیہ الرحمۃ اور عجمی تصوّف پر اظہارِ خیال فرماتے اور یہ شبہ ظاہر کرتے ہوئے کہ حضرت اکبر نے اس مثنوی کے صرف وہی اشعار دیکھے ہیں جو حافظ کے متعلق ہیں ، باقی اشعار پر نظر نہیں فرمائی ، اقبال نہایت لجاجت سے پوری مثنوی پڑھنے کی درخواست کرتے ہیں تا کہ اکبر ''ایک مسلمان (اقبال) پر بدظنی کرنے سے محفوظ رہیں ۔''[۳] رفتہ رفتہ تکدّر دُور ہو جاتا ہے ۔ اقبال شکایتِ حافظ کو مثنوی سے خارج کر دیتے ہیں اور حضرت اکبر پہلے

۱۔ اقبال نامہ ، جلد ۲ ، ص ۵۲ ۔
۲۔ اقبال نامہ ، جلد ۲ ، ص ۵۳ ۔
۳۔ اقبال نامہ ، جلد ۲ ، ص ۵۵ ۔

کی طرح اقبال کو دل میں جگہ دینے لگتے ہیں۔ میں نے اس ساری بحث کو ایک علیحدہ مضمون میں سمیٹا ہے جو 'معرکۂ اسرارِ خودی' کے عنوان سے مجلہ 'اقبال' اکتوبر ۵۳ء اور اپریل ۵۴ء میں شائع ہو چکا ہے ؛ اس لیے یہاں اعادے کی ضرورت نہیں ۔

حضرتِ اکبر کے نام اقبال کے سولہ خطوں کی نقل ''اقبال نامہ'' مرتبۂ شیخ عطاءاللہ میں موجود ہے ۔ ایک آدھ خط کسی دوسرے مجموعے میں بھی ہے ۔ ان سے مجموعی طور پر جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک عالی خیال ، باصلاحیت و کمال مرید کی ہے جس پر مرشد کو بھی فخر ہے ۔ دیکھیے مرید کسبِ فیض اور شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لیے کس قدر بے تاب ہے :

''٦ اکتوبر ۱۹۱۱ء ــــ کل ظفر علی خان صاحب سے سنا تھا کہ جناب کو چوٹ آ گئی ۔ اسی وقت سے میرا دل بے قرار تھا اور میں عریضہ خدمتِ عالی میں لکھنے کو تھا کہ آج جناب کا محبت نامہ ملا ۔ دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس تکلیف کو رفع کرے اور آپ کو دیر تک زندہ رکھے تا کہ ہندوستان کے مسلمان اس قلب کی گرمی سے متاثر ہوں جو خدا نے آپ کے سینے میں رکھا ہے ۔ میں تو آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں ۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں ۔ لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں

اس ہجوم میں تنہا ہوں ۔ ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے :

طعنہ زن ہے ضبط اور لذّت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل رازداں کے واسطے

لارڈ بیکن لکھتے ہیں 'جتنا بڑا شہر ہو اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے ۔' سو یہی حال میرا لاہور میں ہے ۔
ناتمام نظم کے اشعار آپ نے پسند فرمائے ۔ مجھے یہ سن کر مسرت ہوتی ہے کہ آپ میرے اشعار پسند فرماتے ہیں ۔ 'غرّۂ شوال' پر چند اشعار لکھے تھے ۔ 'زمیندار' اخبار کے عید نمبر میں شائع ہوئے ۔ ان کو ضرور ملاحظہ فرمائیے ۔ میں نے چند اشعار آخر میں ایسے لکھے کہ ٹرکی اور اٹلی کی جنگ نے ان کی تصدیق کر دی ۔ اگر 'زمیندار' اخبار آپ تک نہ پہنچا ہو تو تحریر فرمائیے ، میں یہاں سے بھجوا دوں گا ۔

خواجہ حسن نظامی واپس تشریف لے آئے ۔ مجھے بھی ان سے محبت ہے اور ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں ۔ خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارتِ روضۂ رسولؐ نصیب کرے ۔ مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے ۔ دیکھیے کب جوان ہوتی ہے ۔"[۱]

اس خط کے جواب میں حضرت اکبر الہ آبادی نے ۲۷ اکتوبر

۱۔ اقبال نامہ ، جلد ۲ ، صفحات ۳۴ - ۳۶ ۔

۱۹۱۲ء کو اقبال کے نام جو خط لکھا تھا ، وہ اتفاق سے محفوظ رہ گیا ہے ۔ اس کو یہاں مِن و عَن نقل کیا جاتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرشد بھی مرید سے ملنے کا مشتاق ہے ، کیونکہ بالمشافہ گفتگو سے گوناگوں فوائد حاصل ہونے کی توقع ہے :

''الہ آباد ۔ ۲۷ اکتوبر (۱۹۱۱ء)

حبیبی و مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ ۔ زعفران عطیۂ جناب پہنچی ۔ تہِ دل سے شکرگزار ہوں ۔ خانۂ احسان آباد ۔ آپ نے تکلف فرمایا ۔ میرا منشا یہ تھا کہ کسی معتبر تاجر کو آپ یا آپ کے کوئی دوست لکھ دیں کہ عمدہ زعفران کا ویلیو پے ایبل پارسل مجھ کو بھیج دے ۔ خیر اس بات کی خوشی ہوئی کہ میرے ''روحانی دوست'' نے مجھ کو تحفہ عنایت فرمایا ۔ اس خیال میں بڑی لذت ہے ۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ میرے اسلامی بھائی نے تحفہ بھیجا ۔ یہ ایک شرعی اصطلاح ہے اور ان روزوں بڑے جھگڑے کی بات ہے ۔ خدا قوم میں اخوتِ اسلامیہ پیدا کر دے ۔ ایک صحابی سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کا جسمِ مبارک مرقد میں اُتارا گیا اور ہم لوگوں نے اپنے دلوں کو الگ الگ پایا ۔ آپ کی نظم میں نے پڑھی ۔ ماشاء اللہ ، چشمِ بد دور ! میر منشی گورنمنٹ رضا حسین خاں صاحب تشریف فرما تھے ۔ سید عابد حسین صاحب بی ۔ اے ۔ ایک نہایت ذہین اور وسیع الخیال نوجوان بھی موجود تھے ۔ بعض اور بزرگوار بھی تھے ۔ سب نے

نہایت تعریف کی ۔ منشی صاحب نے تو نقل مانگی ہے ۔ لیکن مجھ پر بہت اثر ہوا ۔ وہ اثر باعثِ سکونِ خاطر ہے ۔ میں افسوس کیا کرتا تھا اور صرف ایک آپ کے ہونے سے وہ افسوس کم نہیں ہوا کہ قوم کیوں بے بصیرت ہو گئی ہے ۔ اگر جان کو قوت نہیں پہنچا سکتی تو تدبیرِ بلاکت کی کیوں مؤید ہے ۔ دعاؤں میں آیا ہے :

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الحَقَّ حَقّاً وَارْزُقْنَا اَتِّبَاعَہ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلاً وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَہ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ الْاَشْیَاء کَمَا ھِیَ ۔

(یا اللہ ! مجھ کو امرِ حق ، حق کی طرح دکھا اور توفیق دے کہ اس کا اتبّاع کروں ۔ یا اللہ ! باطل کو باطل دکھا اور توفیق دے کہ اس سے اجتناب کروں ۔ یا اللہ مجھ کو اشیاء کی حقیقت دکھا جس طور پر کہ وہ واقعے میں ہیں) ۔

مجھ کو افسوس تھا اور ہے کہ با اثر اور لائق مسلمان یہ دعا کیوں نہیں کرتے یا اس میں اثر کیوں نہیں ہوتا ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چشمِ بصیرت عطا فرمائی ہے کہ اس عمر میں بلا تجربۂ دنیا آپ کے دل کی نظر کم سے کم اخلاقی حقائق کی طرف ہے : ع

کافروں کی مُسلم آئینی کا بھی نظّارہ کر

کس قدر بلیغ و صحیح و لبریزِ معنی ہے۔ اگرچہ یہ لطیف و خوب صورت و بلیغ ترکیبِ الفاظ آپ کی علمی قابلیت اور خاص شاعرانہ سلیقے کا نتیجہ ہے، لیکن یہ خیال مرتّب و با وقعت ہو کر کس کے دماغ کو نصیب ہے۔ 'گرم گفتاری' اور 'خود داری' کے قوافی بھی حقائق کے مضامین سے مزین ہیں۔ 'شکست رشتۂ تسبیح' اور 'پختہ زنّاری' آپ کا حصہ ہے۔ الغرض جملہ اشعار لاجواب ہیں۔ میری مدح سے بجز اس کے کہ آپ خوش ہوں اور کچھ ہونا نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بھی بہت ہے لیکن کبھی آپ سے ملاقات ہو اور زبانی گفتگو ان اشعار کے معانی پر ہو، تو گوناگوں فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو آیندہ طریقِ عمل کے لیے کارآمد ہوں۔ میں ہنوز اچھا نہیں ہوں۔ اچھا تو مدت سے نہیں ہوں لیکن ابھی معمولی حالت نے بھی عود نہیں کیا۔ نشست و برخاست میں تکلف ہے تاہم بہت افاقہ ہے۔

خواجہ حسن نظامی صاحب تشریف فرما تھے۔ کل دہلی گئے۔ آپ کا ذکرِ خیر فرماتے تھے بلکہ جاپان کے عزم کا بیان بھی فرمایا۔ سبحان اللہ! اپنا ایک شعر یاد آیا۔ کسی نے اعتراض کیا تھا کہ راہِ سلوک عبث ہے، خدا نہیں ملتا۔ میں نے کہا:

جُستجو ہی میں وہ لذت ہے کہ اللہ اللہ
کیوں میں پوچھوں وہ دلآرام ملے گا کہ نہیں

میری ایک غزل کا یہ شعر ہے۔ پس اشاعتِ اسلام کے لیے

اٹھنا بجائے خود جاں فزا اور روح نواز ہے ۔ اگر کوئی بے سامانی پر خردہ گیری کرے تو اس کے لیے عرفی کہہ گئے ہیں :

دانم نہ رسد ذرہ بہ خورشید ولیکن
شوقِ طیران می کشد اربابِ همم را

اور یہ بھی خوب کہا گیا ہے :

مباش اے رہنوردِ عشق فارغ از طپیدن ھا
کہ در آخر بجائے می رسد از خود رمیدن ھا

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

(سورة المائدہ)

نہیں معلوم مفسّرین نے اس کی کیا شرح لکھی ہے ۔ اردو میں تو یہ معنی لکھے ہیں :

مسلمانو ! اللہ سے ڈرتے رہو اور (نیز) اس تک پہنچنے کے ذریعے کی جستجو کرتے رہو ۔

آپ کیا کر سکتے ہیں ۔ جو خدا کا حکم ہے ، کیجیے گا ۔ خدا ہماری اور آپ کی اور سب مسلمان برادران کی عاقبت بخیر کرے ۔ مکرّر آپ کی شکر گزاری کرتا ہوں ۔ اب لکھا نہیں جاتا ، تھک گیا ۔ مہینوں کے بعد اتنا لکھا ہے ۔

دعا گوئے شما ، اکبر

اٹلی و ٹرکی کے متعلق بہت لٹریچر رکیک پیدا ہوگیا ہے۔
اعتدال شرط ہے۔"[1]

اس خط میں جس نظم کی تعریف کی گئی ہے، وہ "بانگِ درا" میں 'غرۂ شوال یا ہلالِ عید' کے عنوان سے موجود ہے۔ اس کے دو بند ہیں۔ دوسرا بند یوں شروع ہوتا ہے:

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

اسی میں یہ شعر بھی ہیں:

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مُسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ، ان کی گرفتاری بھی دیکھ
دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زنّاری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظّارہ کر
اور اپنے مُسلموں کی مُسلم آزاری بھی دیکھ
ہاں تملّق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تُو
اور جو بےآبرو تھے ان کی خودداری بھی دیکھ
جس کو ہم نے آشنا لطفِ تکلّم سے کیا
اس حریفِ بےزباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ
چاک کر دی تُرکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اَوروں کی عیّاری بھی دیکھ

۱۔ اقبال نامہ، مرتبۂ چراغ حسن حسرت، صفحات ۸۱ - ۸۴ -

اس کا آخری شعر یہ ہے[1] :

صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ اور خاموش رہ
شورشِ امروز میں محوِ سرودِ دوش رہ

اس کے فوراً ہی بعد ترکیہ اور اطالیہ میں جنگ چھڑ گئی ، جس سے ترکیہ کو بہت نقصان پہنچا اور اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا ۔

۹ نومبر ۱۹۱۱ء کے خط میں اقبال لکھتے ہیں :

''ترکوں کی فتح کا مژدۂ جاں فزا پہنچا ، مسرت ہوئی ۔ مگر اس کا کیا علاج کہ دل کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا ۔ معلوم نہیں روح کیا چاہتی ہے اور آنکھوں کو کس نظارے کی ہوس ہے ۔ میں ایک زبردست تمنّا کا احساس اپنے دل میں کرتا ہوں ۔ گو اس تمنّا کا موضوع مجھے اچھی طرح سے معلوم نہیں ۔ ایسی حالت میں مجھے مسرت بھی ہو تو اس میں اضطراب کا عنصر غالب رہتا ہے ۔ لاہور کی بستی میں کوئی ہمدمِ دیرینہ نہیں ۔ نام و نمود پر مرنے والے بہت ہیں ۔ قومی جلسوں سے بھی پہلو تہی کرتا ہوں ۔ ہاں ، آپ کے خطوط جو میرے پاس سب محفوظ ہیں ، بار بار پڑھا کرتا ہوں اور تنہائی میں یہی خاموش کاغذ میرے ندیم ہوتے ہیں ۔ کئی دفعہ ارادہ کیا کہ آپ کی خدمت میں استدعا کروں کہ خط ذرا لمبا لکھا کیجیے مگر میں

۱۔ بانگِ درا ، صفحات ۱۹۹ - ۲۰۱ ۔

خود لمبا خط لکھنے سے گھبراتا ہوں - پھر میرا کوئی حق نہیں کہ آپ کو لمبا خط لکھنے کی زحمت دوں - یہ ایک قسم کی روحانی خود غرضی ہوگی ، جس کا ارتکاب میرے نزدیک گناہ ہے - آپ کی ملاقات کے لیے دل تڑپ رہا ہے - خدا جلد کوئی سامان پیدا کرے - کیا آپ (جارج پنجم کی تاج پوشی کے) دربار کے موقع پر دہلی تشریف لائیں گے ؟

'زمیندار' میں یہ پڑھ کر نہایت افسوس ہوا کہ اردو شاہنامہ[1] تلف ہو گیا - جو شعر اس میں شائع ہوئے ہیں ، وہ بڑے زور کے ہیں :

رگِ موج سے خون جاری کریں[2]

اس پر تو فردوسی اور نظامی بھی فخر کرتے -

ہاشم طال عمرہٗ کو میری طرف سے بہت بہت پیار کیجیے - میری روح کو اس نام سے ایک خاص تعلق ہے - اللہ تعالیٰ

۱- یہ 'شاہنامہ' ایک طویل نظم تھی جس میں اکبر نے اُس وقت کی ترکیہ اور اطالیہ کی جنگ کے حالات اپنے خاص رنگ میں بیان کیے تھے - مگر اس خیال سے کہ حکومت شاعر کی زبان اور قلم کی نگرانی کر رہی ہے ، بہ تقاضائے احتیاط شائع نہ کی تھی - اس کے تلف ہو جانے پر اقبال کا تاسف بجا تھا مگر بعد میں اس کے کچھ اشعار ایک خاندانی بیاض سے مل گئے اور ''علی گڑھ میگزین'' کے ''اکبر نمبر'' میں شائع بھی ہو گئے -

۲- اس شعر کا پہلا مصرع یہ ہے :

جو دریا پہ یہ تیر باری کریں

اس بچے کی عمر دراز کرے اور دین و دنیا میں اسے بامراد کرے۔ سکول کی خواندگی میں اس کا وقت ضرور ضائع ہوتا ہوگا مگر باوجود اس کے کس قدر خوش نصیب لڑکا ہے کہ پیرانِ مشرق سے فیض کی نظر لے رہا ہے - یہی نظر صبغۃ اللہ ہے "و من احسن من اللہ صبغۃ" ۔ اب کوئی دن جاتا ہے کہ پیرانِ مشرق دنیا میں نہ رہیں گے اور آیندہ زمانے کے مسلمان بچے نہایت بدنصیب ہوں گے ۔"[1]

اس خط کے یا اس کے بعد کے کسی خط کے جواب میں حضرتِ اکبر نے اقبال کو جو خط ۳ مارچ ۱۹۱۲ء کو لکھا تھا وہ بھی خوش قسمتی سے مل گیا ہے ۔ اس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پیر اپنے مرید کو خلافت کا بار سونپ کر خود سبک دوش ہو رہا ہے :

"الہ آباد - ۳ مارچ ۱۹۱۲ء

عزیزی و حبیبی و مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ! میں آج تک آپ کے الطاف نامے کا جواب نہ لکھ سکا : وجہ تردّدات اور نادرستئی مزاج ۔ چونکہ مکان کے بعض گوشے خالی پڑے ہیں ، ایک طرف جہاں کچھ اسباب رکھا تھا ؛ احاطے والوں ہی میں سے کسی بد دیانت نے تمام بکس اور الماریاں توڑ ڈالیں ۔ کچھ اسباب بھی چوری ہوگیا ہوگا ۔ کچھ پتہ نہ چل سکا لیکن لوہے کا صندوق نہ کھل سکا ۔ میرے تو

۱- اقبال نامہ ، جلد ۲ ، صفحات ۳۷ - ۳۹ ۔

کوئی کپڑے بھی آتار کر لے جائے تو وہیں تک اثر پہنچے گا جہاں تک سردی معلوم ہو۔ لیکن ہاشم کی ماں کے زیورات جو ہاشم بیچارے کو ملے ہیں، ان کا محافظ ہوں۔ اس کے متعلق تردد میں رہا اور ہوں۔

پھر ایک قدیم و معتبر ملازم نہایت ہوشیار اور خیر اندیش کم عمر مر گیا۔ پھر ہاشم علیل ہوگئے۔ ان کو قے آنے کا عارضہ ہے۔ کبھی کبھی عود کر آتا ہے۔ کچھ خدمت گار ہیں لیکن خیر طلب اور سچا ہمدرد کوئی عزیز نہیں ہے۔ ہاشم کے سبب سے میں قید میں ہوں۔ شاید دو ایک سال میں وہ اپنی پوزیشن کو بخوبی سمجھ سکیں۔ خرچ اور ارادوں اور مذاق میں وہ بے امتیاز ہیں۔ روایتیں سنتے ہیں اپنے بھائی جان کے وقت کی، جب میری تنخواہ بارہ سو یا اس سے سوا تھی۔ پھر خطرناک شوق رفل چلانے کا۔

منکہ طول گشتمے از نفس فرشتگاں
جور و جفائے عالمے میکشم از برائے تو

جب ہاشم کی ماں زندہ تھیں تو میں جانتا ہی نہ تھا کہ ہاشم کہاں ہیں۔ نہ گھر کے نظام سے کچھ مطلب تھا۔ یہ ارادہ تھا کہ آنکھ پر آپریشن ہو جائے تو سیاحت میں زندگی بسر کروں، جہاں تک صحت اور کیسہ مدد دے۔ یہ خدا کی مرضی تھی کہ سات برس بعد آپریشن میں کامیابی ہوئی تو منتظمۂ مکان و مالکۂ عشرت منزل

چل بسیں۔ انھیں کے رشتہ دار زیادہ اس شہر میں تھے اور ہیں۔

میں نہ کمیٹی کا مشتاق ہوں، نہ بڑے لوگوں کا۔ اب تو شکستہ حالی کیا، ہمیشہ دل کے لیے شکستہ حالی اچھی رہی ہے۔ آبِ رواں، املی کا درخت، قُمری کی آواز، جنگل کا سماں، مسجد کا صحن، جو بہت زیادہ دلکش ہے، نصیب نہیں ہوتا۔ ہاں آپ سے ملنے کا بہت آرزومند ہوں:

امانت عشق کی بعد اپنے کیا جانے ملے کس کو
نہیں معلوم جائے کس کے سر یہ دردِ سر اپنا

مدت کا پرانا شعر ہے۔ دیکھا کہ وہ بارِ غم جو میرے دل پر مستولی تھا، آپ نے اُٹھا لیا۔ وہی درد تھا، وہی سمجھ اور بصیرت تھی، جس نے آپ کے قلم سے قوم فروشی کی طعن ترشوا دی۔ یوں تو ہر شخص کے خیالات علیحدہ ہوتے ہیں اور آپ تو ماشاءاللہ ابھی کم عمر ہیں۔ آپ کو بہت کچھ کرنا ہے۔ سوسائٹی اچھی ہو یا بری، خواہ مخواہ اس کا ممبر ہو کر حتی‌الوسع زندگی کو شیریں کرنا ہے۔ میں سیر ہو چکا ہوں۔ صورت و معنی میں ہر طرف تبدیلی پاتا ہوں۔ کہیں صورت باقی ہے تو معنی ندارد۔ کہیں کچھ صاف معنی ہیں تو صورت مکروہ ہے۔ نہایت کم ہے کہ صورت و معنی کا وہی نبوی سانچا ہو۔ یقیناً زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ 'با زمانہ بساز' صحیح ہے لیکن بے ضرورت 'با زمانہ

بساز' کیوں ؟ کم از کم یہ کہ مجھ میں یہ قابلیت نہیں رہی کہ موجودہ سوسائٹی میں خوش رہ سکوں۔ میرے اشارات بڑی تفصیل چاہتے ہیں ۔ آپ کبھی ملیں تو یقیناً بڑی روحانی مسرت ہوگی ، لیکن آپ کو بھی بہت سی باتوں پر توجہ ہو جائے گی ۔ حسن نظامی کی تحریر سے آپ کی مشغولیٔ طاعت و قرآن خوانی کا ذکر دریافت کر کے خوش ہوا ۔ وکذالک جعلناکم آمۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شہیدا ؕ پس آپ 'شہداء علی النّاس' میں داخل ہیں یا انشاءاللہ داخل ہو جائیں گے ۔ میرے حق میں بھی دعا فرماتے رہیے ۔ بہ سبب تبخیر و قبض کے چار دن سے نماز فجر وقت پر نہیں پڑھ سکتا ۔ شعرگوئی میں دل نہیں لگتا ۔ میرے ظریفانہ اشعار سے کبھی بہت زندہ دلی اور شوخی کا قیاس ہو سکتا ہے ، لیکن عادۃً وہ بھی ایک اسلوبِ ادائے خیال ہے ، ورنہ بے حد افسردہ رہتا ہوں۔ اور نہ بھی افسردہ رہوں تو ایک حیرت سی رہتی ہے ۔ اب اعتراض کس پر کروں ، وہ زمانہ گزر گیا ۔ رات یہ اشعار ذہن میں آئے :

کامیابی ہجرِ ملت ہو تو ناکامی بھلی
لطفِ دشمن ہی سے شہرت ہو تو گمنامی بھلی
بے وفا سمجھیں تمہیں اہلِ حرم ، اس سے بچو
دیر والے کج ادا کہہ دیں ، یہ بدنامی بھلی

وغیرہ وغیرہ۔ لیکن لطفِ دشمن اور کامیابی ضروری اور مطلوب ہے۔ جب قوم تھی تو سب کچھ کہہ سکتے تھے۔ خیر جو کچھ ہو، اب آپ کے سپرد چارج ہے۔ ہم تو آپ کی ملاقات کی مسرّت مول لینے پر مستعد ہیں۔ آپ کا مصرع : ع

درگرہ ہنگامہ داری چوں سپند

ہم کو ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ بیدل نے کہا ہے :

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہای درِ دل کُشا بہ چمن درآ

لیکن آپ کا مصرع بلیغ تر ہے۔ آپ نہ مانیں تو میں توضیح کر دوں گا۔ حسن نظامی نے بر مہ کتھا خوب لکھا تھا۔ وہ تو عالمِ بے خودی ہے لیکن 'گرہ' اور 'سپند' ہوش میں بھی لذیذ ہیں۔

اب تھک گیا، پھر کبھی۔

اپریل ہی میں ہاشم کا امتحان ہے۔ میں نہیں جانتا کس طرح آسکوں گا، گو قابلیتِ سفر ہو بھی۔ بہرکیف لاہور وغیرہ کے سفر کا ارادہ تو ہے، خدا اگر پورا کرے۔[1]

دعاگوئے شما، اکبر"

مندرجہ بالا خط کی آخری سطور سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۱۲ء کے اوائل میں اراکینِ انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے اصرار پر

۱- اقبال نامہ، مرتّبہ چراغ حسن حسرت، صفحات ۸۴-۸۷۔

علامہ اقبال نے حضرت اکبر کو انجمن کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی جس کے جواب میں حضرتِ اکبر نے اپنی معذوری کا اظہار کیا تھا۔ لیکن ۲۹ فروری ۱۹۱۲ء کو الہ آباد سے خواجہ حسن نظامی کو لکھا:

"حضرتِ اقبال کی مشغولی فی الطاعۃ سے نہایت خوشی ہوئی۔ اس سے دل لگ جائے تو سلطنت ہیچ ہے:

چو مجنوں سر برآورد از تہِ خاک
ندا آمد بدو از ایزدِ پاک
کہ اے مجنوں چہ آوردی بدرگاہ
برآمد از دلِ مجنوں یکے آہ
کہ چنداں شورِ لیلیٰ در سرم بود
کجا پروائے روزِ محشرم بود

جب لیلیٰ کے تصوّر میں یہ محویت تھی تو لیلیٰ آفریں کی محبت میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں ان کو مبارکباد لکھوں گا۔ انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسے میں وہ مجھے اصرار و شوق کے ساتھ مدعو کرتے ہیں۔ میری اسیری و معذوری کے حالات سے وہ آگاہ نہیں۔ خدا مسبّب الاسباب ہے، شاید نجات پا جاؤں۔"[1]

انجمنِ حمایتِ اسلام کا یہ اجلاس ۱۰۔ اپریل ۱۹۱۲ء کو

۱۔ خطوطِ اکبر بنام خواجہ حسن نظامی، صفحات ۹۔۱۰۔ اکبر کے شب و روز، ص ۱۱۶۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کی وسیع گراؤنڈ میں منعقد ہوا تھا۔ اقبال نے اس میں اپنی مشہور نظم ''شمع اور شاعر'' پڑھ کر سنائی تھی۔ نظم طویل تھی اور اتفاق سے انجمن کے دو سرپرستوں نے اصرار کیا کہ اقبال کی نظم ان کی صدارت میں پڑھی جائے۔ چنانچہ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے علامہ مرحوم نے اس کو دو نشستوں میں سنایا۔ ایک نشست کی صدارت فقیر سیّد افتخارالدین نے فرمائی اور دوسری کی مرزا سلطان احمد نے۔ ثانی الذکر نے آتے ہی یہ فقرہ چست کر دیا کہ ''اقبال بھی عجب ہرجائی ہے۔ کبھی میری بغل میں، کبھی فقیر سیّد افتخارالدین کی آغوش میں''۔ اقبال نے نظم پڑھنے سے پہلے ذیل کے اشعار ارشاد فرمائے جن میں ''سلطان'' اور ''فقیر'' کا واضح اشارہ موجود ہے:

همنشینِ بے ریایم از رہِ اخلاص گفت
اے کلامِ تو فروغِ دیدۂ برنا و پیر
درمیانِ انجمن معشوقِ ہرجائی مباش
گاہ با ''سلطان'' باشی، گاہ باشی با ''فقیر''
گفتمش اے همنشیں معذور می دارم ترا
در طلسمِ امتیازِ ظاهر هستی اسیر
من کہ شمع عشق را در بزمِ جاں افروختم
سوختم خود را و سامانِ دوئی هم سوختم[1]

نظم ''شمع اور شاعر'' اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے بعض اشعار لوگوں

۱۔ باقیاتِ اقبال، صفحات ۲۰۸ - ۲۰۹ -

کی زبان پر چڑھ گئے ۔ روزنامہ ''زمیندار'' نے ۱۱ اپریل ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں اس پر تعریفی شذرہ لکھا اور اس کے چند بند شائع کیے ۔ حضرت اکبر نے یہ دیکھ کر ۱۳ اپریل ۱۹۱۲ء کو مندرجہ ذیل خط مدیرِ ''زمیندار'' کے نام لکھا جو ۱۹ اپریل ۱۹۱۲ء کے شمارے میں شائع ہوا :

''ڈاکٹر اقبال صاحب کی نظم کے دو تین بند جو زمیندار میں چھپے ہیں ، میں نے دیکھے ۔ وہ نظم اس کی مستحق ہے کہ اس کی مدح کی جائے ۔ یہ رباعی پیش کرتا ہوں :

اس نظم کا نقطہ نقطہ ہے منبعِ نور
ہر حرف سے ہے تجلیِ حق کا ظہور
اوج ملکوت کا ہے عالم ہر لفظ
ہر بیت اقبال کی ہے ''بیت المعمور''

نظم ''شمع اور شاعر'' بانگِ درا میں موجود ہے ۔ نظر ثانی کے وقت اقبال نے ساتویں بند کا یہ شعر قلمزد کر دیا :

ملک ہاتھوں سے گیا ، ملّت کی آنکھیں کھل گئیں
سرمہ چشمِ دشت میں گرد رمِ آہُو ہوا[1]

اواخرِ ۱۹۱۲ء میں اکبر اور اقبال کے مشترک دوست مرزا سلطان احمد نے ، جو ان دنوں ریاست بہاولپور میں مشیرِ مال تھے ، اپنی تصنیف ''فنونِ لطیفہ'' حضرت اکبر کی خدمت میں پیش کی ۔ اس میں شاعری ، موسیقی ، مصوّری ، فنِ تعمیر اور سنگ تراشی پر نہایت جامعیّت سے

۱- باقیاتِ اقبال ، ص ۳۶۳ ۔

سے بحث کرنے کے علاوہ اکبر اور اقبال کے اشعار کی تعریف کی گئی تھی - یہ کتاب انھوں نے اقبال کے نام ان الفاظ کے ساتھ معنون کی :

''آدابِ ایشیائی اقوام کے مطابق تحفہ ، ہدیہ اور نذرانہ دینے کے واسطے پہلے سے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی - اس رواج کی پابندی سے مجھے حضرت ڈاکٹر محمد اقبال ایم - اے بالقابہ سے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے - اس خلوص اور اس روز افزوں احترام اور محبت کے اعتبار سے ، جو حضرت اقبال کی نسبت میرے ناچیز دل میں ہے ، میں یہ ادنیٰ نذر پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں -

حضرت اقبال کی خداداد قابلیت ، کشادہ دلی اور دوست نوازی سے امید کرنی چاہیے کہ ''مجھے شرفِ قبولیت سے ممتاز فرمایا جائے گا - احقر سلطان احمد ، ۲۶ نومبر ۱۲ء -''

اکبر نے اس کتاب کی رسید دیتے ہوئے ۲۴ دسمبر ۱۲ء کو مرزا صاحب کی خدمت میں لکھا :

''میں کیا اور میرے شعر کیا ، آپ کی تحسین سے حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے . . . میں بہت خوش ہوا کہ آپ نے مکرمی ڈاکٹر اقبال کے نام پر اس کتاب کو معنون کیا - حضرت اقبال نے کیا بلند اور روشن طبیعت پائی ہے اور کیا طرزِ ادا ہے ، کیا بلاغت ہے - مغربی لٹریچر کی تکمیل ، اس پر یہ رنگِ طبیعت کہ بیدل کا دل بھی صدقے ہو - ان کا یہ مصرع

''درگرہ ہنگامہ داری چوں سپند''

میں کبھی نہیں بھولتا - میں ان کی طرف سے بھی سپاس گزاری

کرتا ہوں اگرچہ اب تک مجھ کو ان سے ملنے کی مسرت حاصل نہیں ہوئی ۔ عجیب قید میں ہوں ۔ اس موسم میں ناتوانی اجازتِ سفر نہیں دیتی ۔ یہاں سردی تیز ہے ۔ ہاشم کے اسکول میں مئی میں تعطیل ہوتی ہے ۔ اُس وقت گرمی کی شدت ہوتی ہے ۔ دیکھیے کب زیارت کا موقع ملتا ہے ؟ بہرکیف اس مطلع سے تسکین ہو جاتی ہے :

آرزو دنیا میں کب نکلی اولوالابصار کی
چشمِ موسیٰ کو بھی حسرت رہ گئی دیدار کی''[۱]

آخر جذبِ محبت رنگ لایا ۔ حضرتِ اکبر کی کشش اقبال کو الہ آباد کھینچ لے گئی اور وہ جنوری ۱۹۱۳ع میں ان کی زیارت سے مشرف ہوئے ۔ یہ پیر اور مرید کی پہلی ملاقات تھی ، جس کے بارے میں حضرت اکبر نے اپنے ۲۴ جنوری ۱۹۱۳ع کے خط میں مرزا سلطان احمد کو لکھا :

''ڈاکٹر اقبال صاحب نے بڑی زحمت اُٹھائی ۔ صرف چند گھنٹوں کے لیے مجھے ملنے کو الہ آباد تشریف لائے تھے ۔ آپ صاحبوں کا کرم ہے ، نیک دلی ہے ، ورنہ میری کیا ہستی ہے :

چل بسے اسباب غفلت چشم عبرت رو چکی
میری ہستی تھی ہی کیا اور تھی جو کچھ وہ ہوچکی

۱۔ مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد ، صفحات ۴۴-۴۵ ۔ اکبر کے شب و روز ، صفحات ۱۲۹-۱۳۰ ۔

ڈاکٹر اقبال صاحب بہ لحاظ جملہ حالاتِ کے اس وقت اس حلقے میں آیاتِ الٰہی میں سے ہیں - آپ نے بجا ان کی مدح کی ہے - وہ بھی نازاں ہیں کہ آپ ایسے عالم ، فلاسفر ، نیک دل بزرگ کی خدمت میں نیاز حاصل ہے -"[1]

اقبال کی دوسری ملاقات ۷ ستمبر ۱۹۱۳ع کو ہوئی جس کا ذکر اکبر نے مرزا سلطان احمد کے نام اپنے ۹ ستمبر کے خط میں اور مولانا عبدالماجد کے نام ۱۰ ستمبر کے خط میں اس طرح کیا :

"عید میں عشرت اور خواجہ حسن نظامی صاحب میری تسلیِ خاطر کے لیے تشریف فرما تھے - پرسوں آپ کے دوست اور مدّاح ڈاکٹر اقبال صاحب بھی بسلسلۂ کانپور مجھ سے ملنے کو تشریف لائے تھے - اب تو لکھنے پڑھنے میں زیادہ دل نہیں لگتا - یا تسبیح یا حیرت - علالت اور ناتوانی ، نیز عاداتِ سابقہ نے محتاج خدمت کر رکھا ہے -"[2]

"کل ڈاکٹر اقبال صاحب جو مجھ سے ملنے تشریف لائے تھے ، دہلی گئے -"[3]

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے وضو خانے کے انہدام پر ہنگامۂ دار و گیر گرم تھا اور مسٹر مظہرالحق بیرسٹر پٹنہ قابلِ قدر قانونی خدمات انجام دے رہے تھے - اقبال بھی

۱- مکتوباتِ اکبر بنام مرزا سلطان احمد ، ۲۴ جنوری ۱۹۱۳ع -
۲- مکتوباتِ اکبر ، ص ۱۴۹ - اکبر کے شب و روز ، صفحات ۱۴۰ - ۱۴۱ -
۳- خطوطِ مشاہیر ، ص ۴۸ -

قانونی مشوروں کے لیے کانپور تشریف لے گئے تھے اور راستے میں حضرت اکبر سے ملے تھے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے مسٹر مظہرالحق کے کام کی تعریف کی ۔ حضرتِ اکبر نے دو شعر کا قطعہ کہہ کر خواجہ حسن نظامی کو بھیج دیا جو انھوں نے ہفت روزہ ''توحید'' میرٹھ میں اس طرح شائع کیا :

''اکبری سرٹیفیکٹ

مسٹر مظہر الحق کو

حسبِ فرمائش حضرتِ اقبال

خدمتِ ملّت سے مخدوم و مکرّم ہوگئے
ان کا درجہ خلق میں با شان و رونق ہوگیا
عرش پر پہنچے ہیں مسجد کی طرف داری سے وہ
حق پرستی سے عروجِ مظہرالحق ہوگیا''[۱]

۱۹۱۸ء میں الہ آباد یونی ورسٹی نے ایم ۔ اے ۔ کے امتحان کے لیے اقبال کو ممتحن مقرر کیا اور زبانی امتحان کے لیے الہ آباد بلایا ۔ اقبال نے وہاں جانا اس لیے قبول کر لیا کہ اسی بہانے حضرت اکبر کی صحبت میسّر آ جائے گی ۔ اکبر نے اس امر کی اطلاع پا کر ۹ مارچ ۱۹۱۸ء کو خواجہ حسن نظامی کو لکھا :

''کل ڈاکٹر اقبال صاحب کا خط آیا ہے کہ ۱۶ یا ۱۷ مارچ کو میں الہ آباد آؤں گا اور میرے ساتھ ایک اور صاحب

۱۔ ہفت روزہ ''توحید'' میرٹھ ، جلد ۱ ، شمارہ ۲۱ ، ص ۳ ، بابت ۱۶ ستمبر ۱۹۱۳ء ۔

ہوں گے جو صرف آپ ہی کے اشتیاق میں آتے ہیں۔

تین سال پیشتر اقبال صاحب میرے مہمان ہوئے تھے۔ مجھی سے ملنے آئے تھے۔ دو دفعہ تشریف لائے تھے۔ اس وقت میں اس قدر دل گرفتہ اور ضعیف نہ تھا۔ تاہم کچھ دلچسپی کی امید ہے۔ آپ ہوتے تو میری قائم مقامی کرتے، نیدھا کو احکام دیتے۔ میں تو زیادہ حاضری بھی نہیں دے سکتا۔ ڈاکٹر صاحب سوشل طور پر ایک نعمت ہوں گے۔''[۱]

لیکن انھی دنوں الہ آباد میں پلیگ کی وبا پھوٹ پڑی۔ علامہ اقبال کے والد صاحب چند روز کے لیے لاہور آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے اقبال کو الہ آباد جانے سے منع کر دیا۔ اس طرح اس سال آرزو حسرت میں بدل گئی اور ملاقات نہ ہو سکی۔

۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو اقبال تیسری بار حضرتِ اکبر سے ملے۔ اس مرتبہ تین دن وہاں قیام کیا۔ حضرتِ اکبر نے ۵ مارچ کو خواجہ حسن نظامی کو لکھا:

''۲۹ فروری کو ڈاکٹر اقبال صاحب تشریف لائے۔ کسی مقدمے میں ضلع گیا کو گئے۔ مجھ سے ملنے کو اس طرف سے گزرے۔ تین دن رہے۔ ان میں میں نے بہت پولیٹیکل نشاط طبع پایا۔ دنیا بہ امید قائم۔''

۱۔ خطوطِ اکبر بنام خواجہ حسن نظامی، ص ۱۱۱۔ خطوطِ مشاہیر، ص ۱۸۶۔

واپس لاہور پہنچ کر اقبال نے اپنی خوش نصیبی کا اظہار کرتے ہوئے ۱۷ مارچ ۱۹۲۰ء کو حضرتِ اکبر کی خدمت میں لکھا :

''میں اپنے آپ کو خوش نصیب جانتا ہوں کہ آپ سے ملاقات ہو گئی اور دو روز لطفِ صحبت رہا ۔ آپ کی باتیں نظم ہوں یا نثر ، نوٹ کرنے کے قابل ہیں مگر افسوس ہے کہ کوئی ایسا آدمی آپ کے پاس نہیں ہے جو ان رموز و حقائق کو ، جو آپ کی زبانِ فیض ترجمان سے وقتاً فوقتاً نکلتے رہتے ہیں ، آیندہ نسلوں کے لیے محفوظ کرتا جائے ۔ اگر میں الہ آباد میں ہوتا تو وہی کام کرتا جو باسول نے جانسن کے لیے کیا تھا ۔

آپ کے پاس سے جُدا ہونے کو دل تو نہ چاہتا تھا مگر لاہور واپس ہونا ضروری تھا ۔ اب دیکھیے کب ملاقات ہوتی ہے ؟ کیوں نہ آپ لاہور تشریف لائیں ۔ پورا شہر آپ کی دید کا متمنّی ہے ۔ لاہور تک سفر کرنے اور الہ آباد بہ آرام واپس بھیجنے کی ذمہ داری میری ہے ۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی صحت درست نہیں رہتی اور میرا آپ کو اتنی دُور مدعو کرنا بے معنی ہے مگر کیا کروں ، دل جو نہیں مانتا ۔ خیر انشاء اللہ پھر جلد ملاقات ہوگی ۔ امید ہے کہ آپ کا مزاجِ عالی اچھا ہوگا ۔''

مرزا سلطان احمد نے اقبال کے متعلق کوئی مضمون لکھا جو لدھیانہ کے رسالے ''اقبال'' میں شائع ہوا ۔ اس میں اکبر اور اقبال کی ذہنی اور فکری مماثلت کی کچھ جھلکیاں دکھائی گئی تھیں ۔ یہ پرچہ

حضرت اکبر کے پاس پہنچا تو انھوں نے ۲۰ جنوری ۱۹۱۴ء کو مرزا صاحب کو لکھا :

''پرچہ 'اقبال' لدھیانہ میں آپ کا مضمون تحتِ عنوان ''اقبال'' نظر آیا ۔ دل چاہا مدح سرائی کروں لیکن وہ خیال اس پیرایے میں ظاہر ہوا :

خوب ہے موعظتِ حضرتِ سلطان احمد
دلِ انسان کی چمک خوب کہ سونا بہتر
غفلت و کبر سے غم خانۂ اکبر اچھا
خندۂ جام سے اقبال کا رونا بہتر
ظلم ہے ان کو اگر داد نہ دوں میں لیکن
اپنے مداح کا مداح نہ ہونا بہتر

چونکہ آپ نے اکبر و اقبال کا ذکرِ خیر اپنے مضمون میں کیا ہے ، اس بنا پر یہ اشعار موزوں ہوگئے ۔ میں نے دفتر اقبال لدھیانہ کو بھیج دیے ۔ آج آپ کا الطاف نامہ پہنچا ۔ جناب والا ! اگر مجھ میں یا حضرتِ اقبال میں کچھ ہے تو آپ ہی کے دل کی آواز ہے ۔''[1]

حضرتِ اکبر کی روحانی تربیت سے فائدہ اٹھا کر ۱۹۱۴ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے انیسویں سالانہ اجلاس میں چند ظریفانہ قطعات پڑھے ، جو ''اکبری اقبال'' کے نام سے شائع ہوئے ۔ ان میں چند ''بانگِ درا'' میں شامل ہیں ، باقی ترک کر دیے گئے ہیں ۔

۱۔ مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد ، صفحات ۵۵ - ۵۶ ۔

ایک متروکہ قطعہ، جس کے ایک شعر میں اکبر کی برتری کا اظہار کیا گیا ہے، یہ ہے:

ہند کی کیا پوچھتے ہو اے حسینانِ فرنگ
دل گراں، ہمّت سبک، ووٹر فزوں، روزی تنک
بے ٹکٹ، بے پاس، بھارت کی سیاسی ریل میں
ہو گیا آخر مسیتا بھی معِ اسباب بُک
"لُک وِدن" کا حکم تھا اس بندۂ اللہ کو
اب یہ سنتے ہیں نکلنے کو ہے "مسلم آؤٹ لُک"
کیا عجب پہلے ہی لیڈر میں یہ کر دے آشکار
کس طرح آیا کو لے کر اڑ گیا صاحب کا کُک
ختم تھا مرحوم اکبر پر ہی یہ رنگِ سخن
ہر سخنور کی یہاں طبعِ رواں جاتی ہے رُک
قافیہ اک اور بھی اچھا تھا لیکن کیا کریں
کر دیا متروک دلّی کے زباں دانوں نے ٹُک

بعض اہلِ زبان نے حسبِ عادت ان پر اعتراضات کیے اور اقبال کو بُرا بھلا کہا۔ اس سلسلے میں اکبر نے اقبال کو اور اقبال نے اپنے ۱۶ جولائی ۱۹۱۴ء کے خط میں حضرتِ اکبر کو لکھا:

"آپ کا نوازش نامہ ملا جس کو پڑھ کر مسرت ہوئی۔ حضرت! میں آپ کو اپنا پیر و مرشد تصوّر کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص میری مذمّت کرے، جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو، تو مجھے اس کا مطلق رنج نہیں بلکہ

خوشی ہے - جب آپ سے ملاقات اور خط و کتابت نہ تھی
اُس وقت بھی میری ارادت اور عقیدت ایسی ہی تھی جیسی
اب ہے اور انشاء اللہ جب تک میں زندہ ہوں ، ایسی ہی
رہے گی - اگر ساری دنیا متفق اللسان ہو کر یہ کہے کہ
اقبال ہوج گو ہے تو مجھے اس کا مطلق اثر نہ ہوگا ، کیونکہ
شاعری سے میرا مقصد بقول آپ کے حصولِ دولت و جاہ
نہیں ، محض صداقت ہے -

عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں - ان کو کیا
معلوم کہ کسی شاعر کو داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے
کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کو داد دینا مقصود
ہو ، اس کے رنگ میں شعر لکھے ، یا بالفاظِ دیگر اس کا
تتبّع کر کے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے - میں نے بھی
اسی خیال سے چند اشعار آپ کے رنگ میں لکھے تھے مگر
عوام کی جہالت و بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ اور لیا
اور میرے اس فعل سے عجیب و غریب نتائج پیدا کر لیے -
سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں
کو سمجھ عطا کرے - 'نقّاد' کو جو خط آپ نے لکھا ہے ،
میں اسے شوق سے پڑھوں گا - اگر وہ خط شائع ہو جائے
تو رسالے کی کاپی بھیج دیجیے گا - میرے پاس 'نقاد'
نہیں آتا -

سبحان اللہ ! ''غم بڑا مدرکِ حقائق ہے''[1] زندگی کا سارا فلسفہ اس ذرا سے مصرع میں مخفی ہے ۔''[2]

۹ نومبر ۱۹۱۴ع کو اقبال کی والدۂ ماجدہ فوت ہوئیں ۔ اس کا آنھیں بہت قلق ہوا ۔ آنھوں نے ''والدۂ مرحومہ کی یاد میں'' کے عنوان سے ایک پُر درد نظم لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی ۔ اکبر الہ آبادی نے تعزیت کرتے ہوئے فرمایا :

حضرتِ اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں
یہ حق آگاہی ، یہ خوش گوئی ، یہ ذوقِ معرفت
یہ طریقِ دوستی ، خودداریٔ باتمکنت[3]
اس کی شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
با خدا تھے ، اہلِ دل تھے ، صاحبِ اسرار تھے

۱- یہ حضرت اکبر کی اس دو بیتی کا مصرع ہے :

یار کا حسن سب پہ فائق ہے
واقعی دیکھنے کے لائق ہے
ان مصائب سے کام لے اکبر
غم بڑا مدرکِ حقائق ہے

(کلیاتِ اکبر ، جلد ۳ ، ص ۸۶)

۲- اقبال نامہ ، جلد ۲ ، صفحات ۴۰ - ۴۱ -

۳- ''کلیاتِ اکبر'' میں ''خودداریٔ باتمکنت'' کی جگہ ''خودداریٔ بے تمکنت'' چھپا ہے جو غلط معلوم ہوتا ہے ۔ (کلیاتِ اکبر ، جلد دوم و سوم ، شائع کردہ بزمِ اکبر کراچی ، ص ۳۲۱) ۔

جلوہ گر ان میں آنھی کا ہے یہ فیضِ تربیت
ہے ثمر اس باغ کا یہ طبعِ عالی منزلت
مادرِ مرحومۂ اقبال جنّت کو گئیں
چشم تر ہے آنسوؤں سے ، قلب ہے اندوہ گیں
روکنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو
نعمتِ عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو
اکبر اس غم میں شریکِ حضرتِ اقبال ہے
سالِ رحلت کا یہاں منظور اسے فی الحال ہے
واقعی مخدومۂ ملّت تھیں وہ نیکو صفات
''رحلتِ مخدومہ'' سے پیدا ہے تاریخِ وفات

۱۳۳۳ھ

اور یہ قطعۂ تاریخِ وفات لکھا جو آج بھی مرحومہ کی لوحِ مزار پر کندہ ہے :

مادرِ مرحومۂ اقبال رفت
سوئے جنّت زیں جہانِ بے ثبات
گفت اکبر با دلِ پُر درد و غم
''رحلتِ مخدومہ'' تاریخِ وفات[1]

۱۷ دسمبر ۱۹۱۴ء کو حضرتِ اکبر کے ایک شعر کی داد دیتے ہوئے اقبال نے لکھا :

''کل خط لکھ چکا ہوں مگر آپ کے اس شعر کی داد دینا

۱- قطعات و رباعیات ، حصہ اول ، مرتّبۂ بھیا احسان الحق ، شائع کردہ بزمِ اکبر کراچی ، ص ۳۸۹ -

بھول گیا :

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے ، عقل ، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

سبحان اللہ ! کس قدر باریک اور گہرا شعر ہے ۔ ہیگل ، جس کو جرمنی والے افلاطون سے بڑا فلسفی تصور کرتے ہیں ، اور تخیّل کے اعتبار سے حقیقت میں ہے بھی افلاطون سے بڑا ، اس کا تمام فلسفہ اسی اصول پر مبنی ہے ۔ آپ نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرے میں بند کر دیا ، یا یوں کہیے کہ ہیگل کا سمندر اس قطرے کی تفسیر ہے ۔ ہیگل لکھتا ہے کہ اصولِ تناقض ہستیٔ محدود کی زندگی کا راز ہے اور ہستیٔ مطلق کی زندگی میں تمام قسم کے تناقض ، جو ہستیٔ محدود کا خاصہ ہیں ، گداختہ ہوکر آپس میں گھل مل جاتے ہیں ۔

کیمبرج کی تاریخ ہندوستان کے لیے جو مضمون اردو لٹریچر پر مجھے لکھنا ہے ، اس میں اس شعر کا ضرور ذکر کروں گا ۔ اسی رنگ کے فلسفیانہ اشعار اور بھی لکھیے کہ خود بھی لذت اٹھاؤں اور اوروں کو بھی اس لذت میں شریک کروں ۔''[1]

حضرتِ اکبر کے اسی قسم کے ایک شعر پر مولانا عبدالماجد دریا بادی نے بحث کی اور اسے ایک یونانی فلسفی کے مطابق بتایا ۔ اس

۱۔ اقبال نامہ ، جلد ۲ ، صفحات ۴۲ - ۴۳ ۔

پر حضرت اکبر نے انھیں لکھا :

''جب میں نے یہ شعر کہا تھا اُس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ ابتداءً ایک یونانی فلاسفر نے یہ مسئلہ بیان کیا تھا ۔ اسی طرح جب میں نے یہ شعر کہا :

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے ، عقل ، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

اور جس کی داد ڈاکٹر اقبال صاحب نے دی ، اُس وقت تک مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہیگل نے اس خیال کو وسعت دی ہے ۔ لیکن فلسفہ ہے کیا ؟ نتیجہ غور و فکر کا ۔ آپ نے صفائیِ بیان کی مجھ کو داد دی ہے ۔ میں اس سے خوش ہوا ، لیکن یہ صفائیِ بیان غالباً بلکہ یقیناً اس سبب سے آئی کہ میرا اوریجنل خیال تھا ۔ اگر تقلید و ترجمہ کا سانچہ اس کو پیدا کرتا تو یہ بے تکلفی نہ ہوتی ۔ اگرچہ میں صفائیِ بیان کو ، جہاں تک ممکن ہو ، اَور تمام حالات پر مقدّم سمجھتا ہوں ۔''[۱]

۲۵ اکتوبر ۱۹۱۵ع کے خط میں اقبال نے حضرت اکبر کے دو شعروں کی تعریف کرنے کے بعد اپنے دل کا دکھڑا رویا ہے اور جو پیش گوئی کی ہے وہ بعد کے حالات نے سچ کر دکھائی ہے :

''نوازش نامہ ملا ۔ دونوں اشعار لاجواب ہیں :

فطرت کی زبان حسن کو سمجھو

۱- خطوطِ مشاہیر ، صفحات ۷۹ - ۸۰ - اکبر کے شب و روز ، ص ۱۸۲ -

سبحان اللہ ! یہ طرز اور معنی آفرینی خاص آپ کے لیے ہے۔ کوئی دوسرا یہاں مجالِ دم زدن نہیں رکھتا۔ اور دوسرا شعر :

غضب یہ ہے کہ کبھی محتسب بھی ہوتی ہے[1]

کئی دفعہ پڑھ چکا ہوں ، اس کا لطف کم ہونے میں نہیں آتا۔ کبھی موقع ہوتا ہے تو دل کا دکھڑا آپ کے پاس روتا ہوں۔ یہاں لاہور میں ضروریاتِ اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں۔ یہاں انجمن اور کالج اور فکرِ مناصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ پنجاب میں علما کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے اور اگر خدا تعالیٰ نے کوئی خاص مدد نہ کی تو آیندہ بیس سال نہایت خطرناک نظر آتے ہیں۔ صوفیا کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرتِ اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔ کئی صدیوں سے علما اور صوفیا میں طاقت کے لیے جنگ رہی ، جس میں آخرکار صوفیا غالب آئے۔ یہاں تک کہ اب برائے نام علما جو باقی ہیں وہ بھی جب تک کسی نہ کسی خانوادے میں بیعت نہ لیتے ہوں ، ہر دلعزیز نہیں ہو سکتے۔ یہ روش گویا علما کی طرف سے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ مجدد الف ثانی ، عالمگیر اور مولانا اسمٰعیل

۱- پورا شعر یوں ہے :

وہی نگہ جو رکھتی ہے رند مستوں کو
غضب یہ ہے کہ کبھی محتسب بھی ہوتی ہے

(خطوطِ مشاہیر ، ص ۸۴)۔

شہید رحمۃ اللہ علیہم نے اسلامی سیرت کے احیاء کی کوشش کی مگر صوفیا کی کثرت اور صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہِ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا - اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسا ہے - میں بھلا کیا کر سکتا ہوں ؟ صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں - ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان ، جو ذوقِ خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو ، مل جائے ، جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں - زیادہ کیا عرض کروں - اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو -''[1]

۲۷ جنوری ۱۹۱۶ع کے خط میں اقبال نے حضرت اکبر کے اس شعر :

وائے بر ہستی اگر مقصود ہستی ہو چکا

کی تعریف کرتے ہوئے لکھا :

''نہایت خوب ہے - سیدھے ، آسان اور مختصر الفاظ میں حقائق بیان کرنا آپ کا کمال ہے - عبدالماجد صاحب نے جو شعر آپ کا پسند کیا ہے ، نہایت خوب ہے - میں نے بھی اسی مضمون کا ایک شعر لکھا تھا :

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر
شمع بولی گریہ' غم کے سوا کچھ بھی نہیں''[2]

۱- اقبال نامہ ، جلد ۲ ، صفحات ۴۷ - ۴۹ -
۲- اقبال نامہ ، جلد ۲ ، صفحات ۴۹ - ۵۱ - یہ شعر اقبال کی ایک غزل کا
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

جن دنوں مثنوی "اسرارِ خودی" پر بحث چل رہی تھی اور خواجہ حسن نظامی مخالفت میں پیش پیش تھے ، حضرت اکبر نے ۲۱ جنوری ۱۹۱۶ع کو خواجہ حسن نظامی کے نام ایک خط لکھا اور مندرجہ ذیل چار شعر بھیجے جو انھوں نے شائع کر دیے:

حضرتِ اقبال اور خواجہ حسن
پہلوانی آن میں ، اِن میں بالکپن

جب نہیں ہے زور شاہی کے لیے
آؤ گتھ جائیں خدا ہی کے لیے

ورزشوں میں کچھ تکلّف ہی سہی
ہاتھاپائی کو تصوّف ہی سہی

ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص
می کنند دیوانہ با دیوانہ رقص[1]

اقبال نے ان اشعار کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور ۴ فروری ۱۹۱۶ع کو حضرت اکبر کی خدمت میں لکھا :

"آپ کا قطعہ 'حضرتِ اقبال اور خواجہ حسن' بہت خوب

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

ہے جو "بانگِ درا" میں شامل ہے ۔ اس کا مطلع اور مقطع یہ ہیں :

زندگی انساں کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے ، دم کے سوا کچھ بھی نہیں
زائرانِ کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں ؟

۱۔ خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی ، ص ۲۴ ۔

رہا ۔ صرف ایک بات ہے کہ خواجہ صاحب کو تو کبھی رقص اور سُکر نصیب ہوتا ہوگا ، میں اس نعمت سے محروم ہوں ۔''[1]

انھی دنوں اقبال نے اکبر کے ایک شعر کی ، جس کی وہ پہلے بھی اپنے ایک خط میں تعریف کر چکے تھے ، مزید تحسین و تشریح کرتے ہوئے انگریزی میں ایک مختصر سا مضمون لکھا جو لکھنؤ کے انگریزی ہفتہ وار ''نیو ایرا'' میں شائع ہوا ۔ اس کا اُردو ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :

''جرمنی کے عظیم مثالیت پسند فلسفی ہیگل کے نزدیک تکوین عبارت ہے اُس ہستیٔ مطلق سے جو اپنی مطلقیت سے علیحدہ ہو کر پھر اپنی ذات کی طرف عود کر آتی ہے اور خود کو ایک کائنات کی معروضی شکل میں مشاہدے کے قابل بناتی اور اشیا کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ مگر اس کائنات کی حقیقت اپنے جوہر میں اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ہستیٔ مطلق کی ایک وحدت ہے ، جو ایک مرئی اور محسوس کثرت میں جلوہ نما ہے ۔ رہی یہ بات کہ واپسی کا یہ عمل زمان میں ہے یا زمان کے خارج میں ہے (کیونکہ اس بارے میں پیروانِ ہیگل میں اختلافِ رائے ہے) ، یہ صاف عیاں ہے کہ خود استاد ہیگل کے عقیدے میں اس کی محرک قوت ان لازمی طور پر متضاد مقولات میں مضمر ہے

۱۔ اقبال نامہ ، جلد ۲ ، ص ۵۳ ۔

جن سے ہستیٔ مطلق کو اپنی مطلقیتِ اولٰی کی بازیافت کے لیے ترکیبی طور پر گزرنا پڑتا ہے۔ اس عمل کے آغاز میں، جب ہم اصلی مطلقیت سے دور ہوتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تناقضات بالکل واضح اور آپس میں متباین ہیں۔ مگر جب ہم اس عمل کے انجام کے قریب پہنچتے ہیں، تو یہ وضاحت غائب ہونے لگتی ہے، یہاں تک کہ ہم اس عینِ مطلق تک پہنچ جاتے ہیں جس میں تمام تناقضات ایک دوسرے میں گُھل مل کر ایک وحدت میں متشکل ہو جاتے ہیں۔ یوں ہیگل کے فلسفے کا مرکزی خیال چند الفاظ میں اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ لامحدود، محدود بن جاتا ہے اور خود ارتقائی تباینات کی ترکیب کے ذریعے خود کو دوبارہ پا لیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ کائنات کی حیات لازماً متناقض قوّتوں کے ابدی تصادم سے بنتی ہے۔ افسوس کہ ہیگل کے خیال کا یہ خاکہ پوری طرح واضح نہیں مگر مجھے اُمید ہے کہ اس مختصر ہی سے آپ کو اکبر کے اس بظاہر سادہ شعر کے صحیح طور پر سمجھنے میں مدد ملے گی:

جہاں ہستی ہوئی محدود، لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

فطرت کی تخلیقی قوّتوں کا لا انتہا تصادم اس قدر عیاں ہے کہ وہ شاعروں اور مفکّروں کے مشاہدے سے بچ نہیں سکتا۔ ٹینی سن نے شاید اسے زیادہ دردناک پیرائے میں بیان کیا

ہے - اور ہمارے عرفی نے اسے ایک شاندار شعر میں یوں ادا کیا ہے :

بہ چشمِ مصلحت بنگر مصافِ نظمِ ہستی را
کہ ہر خارے دریں وادی درفشِ کاویاں بینی

مگر اکبر کا خاص اسلوب یہ ہے کہ وہ چند سادہ اور خوبی کے ساتھ منتخب الفاظ میں نہ صرف اس تصادم کو آپ پر واضح کر دیتے ہیں بلکہ اس سبب (یعنی لامحدود کی حدود) کو بھی عیاں کر دیتے ہیں ، جس سے یہ تصادم پیدا ہوتا ہے - ان کے الفاظ ''عقل'' اور ''عقیدے'' سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تصادم مادی سطح (عنصر) ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ ذہنی سطح تک بھی پہنچتا ہے - الگزنڈر کی مشہور کتاب ''مارل آرڈر اینڈ پروگرس'' (اخلاقی نظام اور ترقی) کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے خیالات ، ہمارے نصب العین ، ہمارے عقیدے اور ہمارے اطوارِ حیات کیونکر متواتر اور مسلسل ایک خاموش اور غیر خوں ریز جنگ میں مصروف ہیں اور آپس میں مزاحم ہوکر ایک دوسرے کو فنا اور جذب کرتے رہتے ہیں - [1]''

۱۱ جون ۱۹۱۸ع کے ایک خط میں اقبال نے حضرت اکبر کے

۱- انگریزی اخبار ''نیو ایرا'' لکھنؤ ، ۱۸ اگست ۱۹۱۷ع -

گروہ بندی پر زور دینے کے خیال کی نہایت دبی زبان میں مخالفت کی ہے ۔ فرماتے ہیں :

''اس وقت اسلام کا دشمن سائنس نہیں (جیسا کہ بعض لوگ نادانی سے سمجھے بیٹھے ہیں ۔ اسلام کی پوزیشن سائنس کے خلاف نہایت مضبوط ہے) مگر اس کا دشمن یورپ کا ٹیریٹوریل نیشنلزم (Territorial Nationalism) ہے جس نے 'ترکوں کو خلافت کے خلاف آکسایا ، مصر میں 'مصر مصریوں کے لیے' کی آواز بلند کی اور ہندوستان کو 'پین انڈین ڈیماکریسی' (Pan Indian Democracy) کا بے معنی خواب دکھایا ۔ آپ تو گروہ بندی پر بڑا زور دیتے ہیں بلکہ ایک جگہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے :

''مذہب کیا ہے ؟ گروہ بندی ہے فقط''

گو مجھے اس مصرعے سے اتفاق نہیں ، تاہم مذہب اسلام کا ایک نہایت ضروری پہلو قومیت ہے ، جس کا مرکز کعبۃ اللہ ہے ۔ اگر آپ کے نزدیک مذہب کا مقصد صرف گروہ بندی ہے ، اور کچھ نہیں ، جیسا کہ مذکورہ بالا مصرعے سے معلوم ہوتا ہے ، تو آپ کے قلم کی زبان سے یہ بات زیب نہیں دیتی ۔ کعبہ و کاشی کے سوا کوئی اور مقام بھی ہے ؟ آپ کے نزدیک تو کعبے کے سوا کوئی اور مقام نہ ہونا چاہیے ۔ یہی میرا بھی مذہب ہے ۔''[1]

۱- اقبال نامہ ، صفحات ۵۶ - ۵۷ -

۲۵ جولائی ۱۹۱۸ع کو اقبال نے لکھا :

''غم بڑا مدرکِ حقائق ہے'' اس مصرع کی پہلے بھی داد دے چکا ہوں ۔ آپ کے اکثر اشعار میں حقائق حیات اس سادگی اور بے تکلفی سے منظوم ہوتے ہیں کہ شیکسپیئر اور مولانا روم یاد آ جاتے ہیں ۔ آپ کے اس شعر (جہاں ہستی ہوئی محدود . . . الخ) پر ریویو کرتے ہوئے میں نے کسی انگریز فلسفی کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ خیالات وافکار بھی آپس میں بر سرِ بیکار رہتے ہیں ۔ کل مثنوی مولانا روم دیکھ رہا تھا کہ یہ شعر نظر پڑا :

ہر خیالے را خیالے می خورد
فکر ہم بر فکرِ دیگر می چرد

سبحان اللہ !

ایک خاص باب میں انھوں نے یہ عنوان قائم کیا ہے کہ باری تعالیٰ کے سوا ہر ہستی آکل و ماکول ہے ، اور اس ضمن میں شوپنہار (فلاسفر جرمنی) کے فلسفے کو اس خوبی سے نظم کر گئے ہیں کہ خود شوپن ہار کی روح بھڑک گئی ہوگی ۔

کل شام ایک محفل میں آپ کے شعر ("دل اس کے ساتھ ہے کہ خدا جس کے ساتھ ہے'' . . . الخ) پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی ۔ اگرچہ یہ شعر مشاعرے میں پڑھا نہیں گیا ، تاہم تمام شہر میں مشہور ہے ۔ ''بن خاکِ راہ ناچ لیا کر ہوا کے ساتھ'' پر آج گفتگو رہے گی ۔ یہ شعر بھی حقائق سے

خالی نہیں ۔''[1]

جہاں تک مثنوی رومی کے شعر کا تعلق ہے ، یہ دفتر پنجم کے باب ''در بیان آن کہ ماسوای اللہ تعالیٰ ہر چیز آکل و ماکول است'' میں موجود ہے ۔ یہ بیان اس طرح شروع ہوتا ہے :

زاں کہ تو ہم لقمہ ای ، ہم لقمہ خوار
آکل و ماکول اے جان ! ہوش دار

اس کے بعد اس کی مثالیں دی ہیں کہ ایک چڑیا کسی کیڑے پر تاک لگا رہی تھی کہ ایک بلی خود اسی کو شکار کر کے لے گئی ۔ ایک چور کسی شے کو چرانے کی فکر میں ہوتا ہے مگر کوتوال اس کی گھات میں لگا رہتا ہے ۔ گھاس شفاف پانی پیتی ہے مگر اسے بھی کوئی جان دار چر جاتا ہے ۔ غرض کہ :

''ہم چنیں ہر ہستیِ غیرِ اللہ''
وَ ہو یطعمکم ولایطعم چو اوست
نیست حق ماکول و آکل لحم وَ پوست

اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ :

آکل و ماکول کے ایمن بود
زآکلی کاندر کمین ساکن بود
امن ماکولاں جذوب ماتم است
رو بداں درگاہ کو لایطعم است

۱۔ اقبال نامہ ، جلد ۲ ، صفحات ۶۳ - ۶۶ ۔

حد یہ ہے کہ :

ہر خیالے را خیالے می خورد
فکر آں فکر دگر را می چرد

"بن خاکِ راہ ، ناچ لیا کر ہوا کے ساتھ" یہ حضرت اکبر کی ایک سہ بیتی کا مصرع ہے جو "کلیاتِ اکبر" میں غزلیات کے تحت یوں درج ہے :

نامِ خدا زباں پہ گو ہے دعا کے ساتھ
ممکن نہیں خیال خدا ماسوا کے ساتھ
اس دیرِ بے ثبات میں اللہ کو نہ بھول
بدلا نہ کر بتوں کی نگاہ و ادا کے ساتھ
اظہار وجد کے لیے محفل کی کیا تلاش
بن خاک راہ ، ناچ لیا کر ہوا کے ساتھ

انگریزی کے رسالے "ایسٹ اینڈ ویسٹ" کے اگست کے شمارے میں مثنوی "اسرار و رموز" پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا ایک نہایت قابلیت سے لکھا ہوا مضمون شائع ہوا ۔ اسی ماہ منشی دیا نرائن نگم کے رسالہ 'زمانہ' میں مثنوی پر ایک مختصر سا ریویو نکلا اور ساتھ ہی اکبر الہ آبادی کا کلام بھی شائع ہوا ۔ چند اشعار حسبِ ذیل تھے :

جب دین نہ ہو ، اصلاحِ بشر دنیا میں پھر آخر کون کرے ؟
غفلت کے سوا اس محفل میں ، مہماں کی خاطر کون کرے ؟
اک علم تو ہے بت بننے کا ، اک عـلـم ہے حق پر مٹنے کا
اُس علم کی سب دیتے ہیں سند ، اس علم میں ماہر کون کرے ؟

غوطے تو لگائے زمزم میں ، اور غرق ہیں حُبِّ دنیا میں
پانی نے بدن کو پاک کیا ، اب جان کو طاہر کون کرے ؟
مذہب کی ہے دھوم اور ساتھ اس کے اعمال نہیں ، اخلاق نہیں
چُپ چُپ کی صدا ہے چار طرف ، اس راز کو ظاہر کون کرے ؟
جب علم ہی عاشقِ دنیا ہو ، پھر کون بتائے راہِ خدا ؟
جب خضر اقامت پر ہوں فدا ، تائیدِ مسافر کون کرے ؟
سودا بھی ہے رنگِ طبعِ بشر ، فطرت ہی میں ہیں اسباب جنوں
اکبر کو بھی ہوش آجائے تو پھر ، اس کام کو آخر کون کرے ؟

وہی صاحب عمل ہیں ، شرع و دیں جن کا وظیفہ ہے
یہ صلح کل فقیری فقرہ یا شاہی لطیفہ ہے

اقبال نے ان سب باتوں کی اطلاع دیتے ہوئے اپنے ۱۴ ستمبر ۱۹۱۸ء کے خط میں حضرت اکبر کو لکھا :

''ابھی تو مسلمانوں کو اور ان کے لٹریچر کو آپ کی سخت ضرورت ہے ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمرِ خضر عطا فرمائے ۔ آج 'زمانہ' میں ایک ریویو مختصر نظر سے گزرا ۔ 'زمانہ' کے اسی نمبر میں آپ کے اشعار بھی دیکھے ہیں جن کو کئی دفعہ پڑھا ہے اور ابھی کئی بار پڑھوں گا ۔ بالخصوص اِس شعر نے ''جب علم ہی عاشقِ دنیا ہو . . . الخ'' بہت اثر دل پر کیا ۔ مگر اس شعر کو (یہ صلح کل فقیری فقرہ یا شاہی لطیفہ ہے) آپ کے اشعار میں دیکھ کر تعجب ہوا ۔ یہ کب کا شعر ہے ؟ ''شاہی لطیفہ'' کی داد دینا میرے قلم کے امکان سے باہر ہے ۔

ایک نہایت مخلص نوجوان یہاں لاہور میں ہے ، تاجر کتب ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' کو پھر شائع کرنا چاہیے مگر مولانا اکبر دیباچہ لکھیں ۔ میں نے آپ کی طرف سے ہرچند عذر کیا مگر وہ مُصر ہے ۔ آخر میں نے اس سے کہا کہ مولانا کی خدمت میں عرض کروں گا ۔ ایسی فرمائش کرتے ہوئے حجاب آتا ہے کہ مجھے آپ کے ضعف و ناتوانی کا حال معلوم ہے ۔ تاہم اگر کسی روز طبیعت شگفتہ ہو اور آلام و افکار کا احساس شگفتگیِ طبیعت سے کم ہوگیا ہو تو دس پندرہ سطور اس کی خاطر لکھ ڈالیے ۔ یہ لڑکا آپ کا غائبانہ مرید ہے ۔''[۱]

ہماری خوش نصیبی ہے کہ اس خط کے جواب میں حضرت اکبر نے ۱۰ ۔ اکتوبر ۱۹۱۸ع کو جوکچھ لکھا ، وہ بھی محفوظ ہے اور حاضر ہے ۔ دیکھیے اکبر کس مقام سے ارشاد و ہدایت کا فریضہ ادا کر رہے ہیں :

''پیارے ڈاکٹر صاحب ! آپ کا آخری خط ، ۲۴ ستمبر ۱۹۱۸ع کا ، اس وقت سامنے ہے ۔ آج کسی قدر حواس درست ہوئے ہیں ۔ ایسی تکلیف اٹھائی کہ بیان دشوار ہے ۔ معلوم نہیں کس گناہ کی سزا ملی کہ دو دن دربار بند رہا ، یعنی نماز بہ حالتِ انتشار ادا ہوئی ۔ قرآن پڑھوا کر سنا ، شدتِ درد سے ہوش پگھل رہا تھا ۔ مسہل سے افاقہ ہوا ،

۱۔ اقبال نامہ ، جلد ۲ ، صفحات ۶۸ - ۷۰ ۔

ناتوانی زیادہ ہے ، دنیا کم نظر آتی ہے ، نشاطِ نفس نہیں ہے ۔ اب 'اغفر و ارحم' کا ورد ہے ۔ زندہ و کارگزار خلقت کا ساتھی کیوں کر بنوں ؟ ہر حالت کا عالم جداگانہ ہے ۔ آپ خود غور کیجیے کہ کتنی تبدیلیاں ہوئیں ، آیندہ کیوں نہ ہوں گی ؟ جن حالات میں انسان گھرا ہوتا ہے ، جن محسوسات کا مجموعہ بنتا جاتا ہے ، ان کا اثر بھی ہوتا ہے ، مذاقِ فطرتی بھی ایک چیز ہے ۔ مجھ کو کیا خوشی ہو کہ ہندوستان میں صرف ایک شخص ، یعنی اقبال ، نے اس شعر کی داد دی :

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے ، عقل ، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

انھی ادراک حقائق سے وہ فلسفہ پیدا ہوتا رہتا ہے جس کو شریعتِ ظاہر ضعفِ زبان اور اختلافِ بیان کے سبب سے تسلیم نہیں کر سکتی ۔ ''دریاها فرو برند و آروغی نیارند'' مناسب ہے مگر ہمارا ظرف اتنا کہاں ! جو بلند خیالی فطرت نے آپ میں ودیعت کی ہے اس کا شکر کیجیے ، خاموشی سے اس کی لذت لیجیے ۔ اطمینان چاہیے تو اپنے ہی دل کو دیکھا کیجیے اور قربِ الٰہی کی تمنّا کیجیے ۔ واسجد و اقترب ۔ نہ قوم ہے نہ لیڈر ، نہ کسی پر کسی کا اثر ، نہ کوئی طاقت جامع ہے ۔ یاروں کی پارٹی بندیاں ہیں ۔ خدا کے لیے نہیں ، اپنی واہ وا یا سوشل مزے کے لیے ۔ ہاں گورنمنٹ کی طاقت ہے ۔ اس کے کام کے لیے گروہ بندیاں ہیں ۔ نہ

"میں مستثنیٰ ہوں نہ آپ ، نہ کوئی اَور ، الاّ ماشاء اللہ ۔
وقت ہے ، "دور ہے : ع

ہر ایک کا یہ مشن نہیں ہے کہ دور دنیا میں غزنوی ہو

جب رُت بدلے گی ، اُس وقت شگوفے کھلیں گے ۔ جو طوفانِ بے تمیزی برپا ہے اور لوگ اپنی حدوں کو بھول گئے ہیں ، اس کی ذمہ دار بھی خود گورنمنٹ ہے ۔ اللہ جانے اور وہ ۔ آپ ہی نے اس شعر کو سمجھا :

جو ہیں صاحب عمل بس شرع و دیں ان کا وظیفہ ہے
یہ صلحِ کل فقیری فقرہ یا شاہی لطیفہ ہے

جی ہاں ، جی ہاں ! عمل کی طاقت ہو ، وہ مسند ہو ، تو قانون سے بھی کام چلتا ہے ۔ ہم تو فقروں اور لطیفوں سے کام لے رہے ہیں اور یہی چاہیے ۔ خاموشی اور عزت سب سے بہتر ۔

میں زیادہ نہ لکھ سکا ۔ قوتِ نظم اس وقت نہیں ہے ۔ آیندہ جو ہو سکے ۔ بے تکلفانہ آپ کو لکھ دیا ، خرافات ہو تو چشم پوشی کیجیے گا ۔ خدایت یار باد !"

رسالہ "زمانہ" میں اکبر کی شاعری پر تجزیہ شائع ہوا مگر اقبال کو پسند نہ آیا ۔ آپ نے ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۸ع کو حضرت اکبر کی خدمت میں تحریر فرمایا :

" 'زمانہ' میں ریویو دیکھا تھا ۔ خیر اچھا ریویو تھا مگر آپ کی شاعری پر ریویو لکھنے کا حق آج تک کوئی ادا

نہیں کر سکا ۔ 'زمانہ' نے جو اشعار انتخاب کیے وہ دو چار روز ہوئے بار روم میں مزے لے لے کر پڑھے گئے ۔ وقت کی مصلحت نہیں ورنہ میں آپ کے اشعار پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھتا ، اور زندگی رہی تو انشاء اللہ کبھی ضرور لکھوں گا ۔ مطلع آپ کا لاجواب ہے :

کم ہیں جو سمجھتے ہیں کہ مقصود وہی ہے[1]

سبحان‌اللہ و الیہ المصیر ۔"[2]

۲۸ نومبر ۱۹۱۸ء کو اقبال نے حضرت اکبر کے بعض اشعار کی تعریف کا پہلو یوں نکالا :

"اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر فلسفہ ڈاکٹر بیگ ، چیچک کی بیماری سے دفعتاً انتقال کر گئے اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے اصرار پر دو ماہ کے لیے انجمن کے کالج کی ایم ۔ اے کی جماعت مجھ کو لینی پڑی ۔ امید ہے دو ماہ تک نیا پروفیسر مل جائے گا ۔ یہ لڑکے شام کو ہر روز

۱۔ یہ مصرع جس قطعے کا ہے ، اس کے تین شعر یہ ہیں :

گو سب کو ہے تسلیم کہ معبود وہی ہے
کم ہیں جو سمجھتے ہیں کہ مقصود وہی ہے
آنکھوں میں اُتر آتے ہیں موہوم کے نقشے
دل میں یہ سمائی ہے کہ موجود وہی ہے
اللہ ہی کی ہر موج سے پہنچے گا ترا دل
سرچشمۂ فیض و کرم و جود وہی ہے

۲۔ اقبال نامہ ، جلد ۲ ، صفحات ۱۷ - ۷۲ ۔

میرے مکان پر آ جاتے ہیں ۔ دن میں جو تھوڑی سی فرصت ملتی ہے ، اس میں ان کے لیکچر کے لیے کتب دیکھتا ہوں ۔ لیکچر کیسا ہے ؟ انسان کی ذہنی مایوسیوں اور ناکامیوں کا افسانہ ہے جسے عرفِ عام میں تاریخِ فلسفہ کہتے ہیں ۔ ابھی کل شام ہی میں ان کو آپ کا یہ شعر سنا رہا تھا :

'میں طاقتِ ذہن غیر محدود جانتا تھا ، خبر نہیں تھی کہ ہوش مجھ کو ملا ہے تُل کے ، نظر بھی مجھ کو ملی ہے 'نپ کے

سبحان اللہ ! کیا خوب کہا ہے ، جزاک اللہ !

بہرحال ان لیکچروں کے بہانے سے ان لڑکوں کے کان میں کوئی نہ کوئی مذہبی نکتہ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے : ع

جان حاضر ہے مگر راہِ خدا ملتی نہیں

میں آپ کا مقصود خوب سمجھتا ہوں ۔ سیدھے سادے الفاظ میں حقائق بیان کر دینا آپ کا خاص حصہ ہے ۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے ۔

آپ کی رباعی :

اور شکر یہ ہے کہ موت آ جاتی ہے

بہت عرصے سے میں نے نوٹ کر رکھی ہے ۔''[1]

اقبال نے تاریخِ فلسفہ کے طالب علموں کو اکبر کا جو شعر

۱۔ اقبال نامہ ، جلد ۲ ، صفحات ۴۷-۴۳ ۔

سنایا ، وہ ان کی اس غزل سے لیا گیا ہے :

نگاہِ ظاہر طریقِ عرفاں میں سوئے انکار کیوں نہ لپکے ؟
کہاں سے لائے وہ چشمِ معنی کہ برق چمکے نظر نہ جھپکے
میں طاقتِ ذہنِ غیر محدود جانتا تھا ، خبر نہیں تھی
کہ ہوش مجھ کو ملا ہے تُل کے ، نظر بھی مجھ کو ملی ہے نپ کے
تمھاری تعلیم کے مصالح جو چاہیں برسائیں ان پہ شوخی
مری نظر میں تو حسن یہ ہے کہ چشمِ خوباں سے شرم ٹپکے
ہؤا ہے خون آرزو کا اکثر ، یہ ہے بہارِ کلامِ اکبر
سخن کو رنگین کر دیا ہے ، دل و جگر نے تڑپ تڑپ کے
جو میرے دل کا ابھار دیکھا ، جو رنگ اس کا بتوں کو بھایا
تو پوچھا یہ پھل کہاں سے پایا ؟ کہا یہ میں نے کہ ہر کو جپ کے

اکبر کا یہ مصرع : ''اور شکر یہ ہے کہ موت آ جاتی ہے'' ان کی رباعی کا نہیں بلکہ اس سہ بیتی قطعے کا مصرع ہے جس کے دو شعر یہ ہیں :

ہنگامۂ شکر و شکوہ دنیا میں ہے گرم
لیکن مرے دل سے یہ صدا آتی ہے
کھلتا نہیں رازِ دہر ، شکوہ یہ ہے
اور شکر یہ ہے کہ موت آ جاتی ہے

۲۰ اپریل ۱۹۱۹ء کو لاہور میں مارشل لاء (آئینِ عسکری) کے نفاذ کا ذکر کرنے کے بعد اقبال نے لکھا :

''آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے مگر یہ زمانہ گھر سے باہر نکلنے کا نہیں ۔ اللہ تعالیٰ اس ملک کے لوگوں کی

حالت پر رحم کرے ۔

مومن کو چاہیے کہ خدا ہی کا ہو رہے[1]

چند روز ہوئے ایک مصرع ذہن میں آیا تھا۔ دوسرا مصرع نہیں ہو سکا:

ایں سرِ خلیل است بآزر نتواں گفت

غور فرمائیے، کچھ ذہن میں آئے تو مطلع کیجیے ۔"[2]

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اکبر نے مصرعِ ثانی تجویز کیا یا نہیں ۔

اکبر اور اقبال کے خطوں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ دونوں کے درمیان تحفے تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا تھا ۔ جس طرح اقبال نے کشمیری زعفران تحفے کے طور پر حضرت اکبر کو بھیجی تھی ، اسی طرح اکبر نے بھی ایک دفعہ لنگڑا آم تحفۃً اقبال کو بھیجا ، جس پر اقبال نے شکریے میں یہ شعر لکھا :

اثر یہ تیرے اعجازِ مسیحائی کا ہے اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا ، لاہور تک پہنچا

۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو جب حضرتِ اکبر کا انتقال ہوا تو اقبال نے ۱۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ایک تعزیتی خط ان کے صاحب زادے

۱- یہ مصرع اکبر ہی کے ایک شعر کا ہے جو یوں ہے :
جب آسمان اہلِ دغا ہی کا ہو رہے
مومن کو چاہیے کہ خدا ہی کا ہو رہے

۲- اقبال نامہ ، جلد ۲ ، صفحات ۷۶-۷۷ -

۱۴

مولانا گرامی

(۱۹۲۷ء)

مولانا شیخ غلام قادر گرامی شاعرِ خاص حضور نظام دکن اگرچہ سن و سال میں اقبال سے بڑے تھے لیکن دونوں میں بڑی گہری دوستی اور پورے احترام کے ساتھ بے تکلفی تھی ۔ دونوں ایک دوسرے سے متاثر تھے اور باہم مشورۂ سخن بھی کرتے تھے ۔ ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں لیکن زیادہ تر مراسلت ہی رہتی تھی ۔ خوش قسمتی سے مولانا گرامی کے نام اقبال کے نوّے خط محفوظ رہ گئے ہیں جو میرے سیر حاصل مقدمے اور تعلیقات کے ساتھ اقبال اکادمی کراچی نے شائع کیے ہیں ۔ یہ خط اگرچہ نجی اور دوستانہ ہیں مگر ان سے جہاں اقبال کے فنِ شعرگوئی اور اس سلسلے میں ان کے ذہنی اور فکری ارتقاء کے مختلف منازل و مراحل کا پتا چلتا ہے وہاں ان کی شخصیت اور اوصاف و کمال کے بعض نئے گوشے بھی اجاگر ہوتے ہیں ۔ اس لیے یہ خطوط فنی ، ادبی ، تنقیدی ، سوانحی اور تاریخی ، غرض ہر اعتبار سے نہایت اہم ہیں ۔

مقدمے میں پوری تفصیل کے ساتھ میں نے مولانا گرامی کے حالات ، اقبال کے ساتھ ان کے مخلصانہ اور خوشگوار تعلقات اور ایک دوسرے کے تاثرات پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اقبال انھیں کس نگاہ سے دیکھتے تھے - یہاں میں نہایت اختصار سے کام لوں گا - تفصیل کے لیے کتاب ''مکاتیبِ اقبال بنام گرامی'' دیکھی جا سکتی ہے -

شیخ غلام قادر گرامی غدر سے چند سال قبل جالندھر میں پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم وہیں مسجد اور مکتب میں حاصل کی - پھر لاہور آ کر اورینٹل کالج سے فارسی اور وکالت کے امتحانات پاس کیے - ملکۂ شاعری قدرت کی طرف سے ودیعت ہؤا تھا ، بچپن ہی میں شعر موزوں کرنے لگے تھے - مولانا محمد حسین آزاد یکم ستمبر ۱۸۸۸ء کو اپنے ایک مکتوب میں ، جو میجر سیّد حسن بلگرامی کے نام ہے ، لکھتے ہیں :

''گرامی کو میں خوب جانتا ہوں ، یونیورسٹی پنجاب میں پڑھتا رہا ہے - وہاں سے نکل کر بھی کئی سال مجھ سے ملتا رہا - بارہ برس کا مسلسل مشّاق ہے اور جس رنگ میں یہ لکھتا ہے اُس میں آج اوّل درجے کا شاعر ہے - اس کی طبیعت خیال بند ہے - جلال اسیر ، قاسم مشہدی اور ظہوری وغیرہ بند میں اسی طرز میں کہتے تھے -''[1]

تعلیم سے فارغ ہو کر گرامی نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا - اس

۱- مکتوباتِ آزاد ، مطبوعہ گیلانی پریس لاہور ، ۱۹۲۷ء ، ص ۳۶ -

سلسلے میں امرتسر ، کپورتھلہ اور لدھیانہ کے مدرسوں میں فارسی پڑھائی - کچھ عرصہ پولیس کی ملازمت بھی کی اور چار سال تک لاہور میں نواب فتح علی خاں قزلباش کے معلّم و اتالیق رہے - یہاں سے نواب عماد الملک سیّد حسین بلگرامی کے چھوٹے بھائی میجر سیّد حسن بلگرامی کے وسیلے سے میر محبوب علی خاں نظامِ دکن کے دربار میں پہنچے اور ''شاعرِ خاص'' مقرر کر دیے گئے -

گرامی ۱۷ - ۱۹۱۶ء تک حیدر آباد دکن میں رہے اور خوب ٹھاٹھ سے رہے - انھوں نے وہیں کی بود و ماند اختیار کر لی تھی - میر محبوب علی خاں کے بعد میر عثمان علی خاں کا زمانہ بھی دیکھا اور ہر عہد میں محبوب و مقبول رہے - کئی دفعہ انعام و اکرام بھی حاصل کیے ، مگر وہاں سے ذیابیطس کا مرض لے کر پنجاب واپس آئے - شادی ہوشیار پور کے شیخ قمرالدین کی دختر اقبال بیگم سے ہوئی تھی جسے گرامی ترک کہتے تھے - بیوی کی خوش نودی کی خاطر گرامی نے جالندھر کی بجائے ہوشیار پور کو اپنا مستقر بنا لیا ، جس پر کہا گیا کہ لوگ تو جورو بیاہ کر لاتے ہیں ، گرامی کو جورو بیاہ لے گئی - یہیں ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا اور قبرستان کندن شاہ بخاری میں دفن کیے گئے :

گرامی کے انتقال کی وحشت اثر خبر سنتے ہی حضرت علامہ نے ان کی شخصیّت ، شاعرانہ کمال ، غیرمعمولی حافظے ، اخلاق و عادات اور ناقدانہ نظر کو یوں خراجِ تحسین ادا کیا :

''آج سے تقریباً بیس پچیس سال پیشتر میرے اور مولانا گرامی کے تعلقات کا آغاز ہوا - آپ اس وقت مستقل طور پر

حیدر آباد میں رہتے تھے اور کبھی کبھی پنجاب آیا کرتے تھے - اُس زمانے میں آپ زیادہ تر غزل ہی لکھا کرتے تھے، لیکن میرا خیال ہے کہ اُنھیں غزل اور مثنوی دونوں پر قدرت حاصل تھی - رباعی زیادہ تر اُنھوں نے آخری عمر میں کہی - ایک مثنوی مولانا روم کی طرز پر لکھنی شروع کی تھی جس کا کچھ حصہ شائع بھی ہو چکا ہے - دوسری مثنوی مُلاّ غنیمت کنجاہی کی مثنوی کے انداز پر تھی لیکن دونوں غالباً ختم نہیں ہوئیں - آپ کا بیشتر کلام غزل پر مشتمل ہے - کئی سال ہوئے مولانا گرامی نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ، جو اُنھی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، مجھے دکھایا تھا - اس مجموعے کا حجم قریباً تین سو صفحے ہوگا - یہ مجموعہ بیاض کی صورت میں تھا اور اس میں قریباً سب کی سب غزلیں موجود تھیں - مجھ کو معلوم نہیں کہ یہ مجموعہ اب کہاں ہے - غالباً محفوظ ہوگا -

میرے نزدیک اصنافِ سخن میں ان کو غزل کے ساتھ خاص شغف تھا - فارسی لٹریچر میں جو ''تازہ گوئی'' کا دور اکبر کے عہد سے شروع ہوا تھا، مولانا گرامی کو اس دور کا آخری شاعر سمجھنا چاہیے - ان کا کلام بحیثیتِ مجموعی، بالخصوص غزل میں، نظیری کے کلام سے ایک خاص نسبت رکھتا ہے -

شعر سے ان کی طبیعت کو فطری مناسبت تھی - اس فطری

مناسبت کے ساتھ زندگی کے عام حالات نے ان کو "فنا فی الشعر" کر دیا تھا ۔ گفتگو اور عام روش میں وہ نہایت سیدھے سادے آدمی تھے لیکن حقیقت میں نہایت ذہین آدمی تھے اور شعر کے علاوہ زندگی کے دیگر امور کو بھی خوب سمجھتے تھے ، گو ان امور میں عام طور پر دلچسپی نہیں لیتے تھے ۔

جدید فارسی زبان کا اثر ان کے کلام پر مطلق نہ تھا ۔ وہ کلاسیکل فارسی ہی میں لکھتے تھے ۔ فارسی زبان کے ساتھ ان کو ایک طبعی مناسبت تھی اور تراکیب وضع کرنے میں ان کا انداز مجتہدانہ تھا ۔ جدید فارسی تراکیب اور الفاظ سے اجتناب بھی ان کے صحیح ذوقِ شعر کی ایک دلیل ہے ۔ ان کے جذبات گہرے اور افکار بلند ہوتے تھے ۔ وہ تقریباً ہر وقت فکرِ سخن میں مصروف رہتے تھے ۔ بالخصوص رات کے وقت بہت کم کھاتے اور بہت کم سوتے تھے ۔

ان کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ تھی کہ حافظہ نہایت قوی تھا ۔ فارسی کے ہزاروں اشعار ان کو ازبر تھے ۔ اپنا کلام بھی سارے کا سارا یاد تھا ۔ میرا عقیدہ ہے کہ وہ ہر پہلو سے اپنے زمانے کے ایک بے نظیر آدمی تھے ۔ سادگی ، بے پروائی اور بلند پروازی کے ایسے مجموعے کی مثال اس زمانے میں مشکل سے ملے گی ۔

منجملہ دیگر خصوصیات کے ان کی ایک خصوصیت یہ بھی

تھی کہ اپنے کلام کو خود نہایت گہری ناقدانہ نظر سے دیکھتے تھے ۔ آخری عمر میں ان کی طبیعت طول نویسی کا بار برداشت نہیں کر سکتی تھی ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اپنی عمر کے آخری دو تین برسوں میں آنھوں نے رباعی کے سوا اور کچھ نہیں لکھا ۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے ، فارسی نثر میں آنھوں نے کچھ نہیں لکھا لیکن عام حالات سے اندازہ کر کے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ فارسی نثر لکھتے تو نہایت شگفتہ لکھتے ۔ ان کے اُردو خطوط بھی جدتِ بیان سے خالی نہ ہوتے تھے ۔

وہ نہایت صلح کُل تھے ۔ ان کے اخلاق وسیع تھے اور ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ وہ کسی کے کلام پر اس کے سامنے نکتہ چینی کریں ۔ اعلیٰ درجے کا شاعر ہونے کے علاوہ وہ اعلیٰ پائے کے نقّادِ شعر بھی تھے ۔ جب کوئی اچھا شعر سنایا جاتا تو ان کو معا یاد ہو جاتا اور پھر کئی کئی دن تک اسے پڑھتے رہتے ۔

گرامی کو خانِ خاناں کے زمانے میں پیدا ہونا چاہیے تھا ، قدرت کی ستم ظریفی نے آنھیں اِس زمانے میں پیدا کر دیا ۔ مگر یہ بات باعثِ اطمینان ہے کہ میر محبوب علی خاں عرش آشیانی نے ایسے زمانے میں ان کی قدر افزائی کی جب کہ فارسی شعر کا چراغ ہندوستان میں گل ہو چکا تھا ۔ پنجاب

کی ادبی روایات ، جن کا سلسلہ مسعود سعد سلمان سے شروع ہوتا ہے ، اصل میں فارسی ہی سے وابستہ تھیں۔ مولانا گرامی ان روایات کے بہترین حامل تھے : ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

گرامی کی بہترین یادگار ان کا کلام ہے ۔ ان کے احباب اور مداحین کو چاہیے کہ وہ ان کے کلام کو ان کے ورثا سے حاصل کر کے شائع کر دیں ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اپنے کلام کا ایک حصہ وہ ضرور اپنے ساتھ ہی لے گئے ہیں ۔''[1]

مولانا گرامی کا جو کلام دست بردِ حوادث سے محفوظ رہ گیا تھا ، وہ ان کی وفات کے چند سال بعد شائع ہوگیا تھا ۔ غزلوں ، مثنویوں اور متفرق کلام کے مجموعے کا نام ''دیوانِ گرامی'' ہے اور دوسرے کا ''رباعیاتِ گرامی'' ، مگر اب یہ دونوں مجموعے نایاب ہیں ۔

گرامی کی وفات سے کوئی دس سال قبل اقبال نے یہ معلوم کرنے کے لیے مراقبہ کیا کہ گرامی کو خاکِ پنجاب جذب کرے گی یا خاکِ دکن ؟ اس میں جو انکشاف ہوا وہ اقبال نے اپنے ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۸ع کے خط میں یوں پیش کیا :

''گرامی مُسلم ہے اور مُسلم تودۂ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے ۔ یہ ایک قوتِ نورانیہ ہے کہ جامع ہے جواہرِ موسویت و ابراہیمیت کی ۔ آگ اسے چُھو جائے تو برد و سلام بن جائے، پانی اس کی ہیبت سے خشک ہو جائے۔

۱- مخزن ، لاہور ، جون ۱۹۲۷ع ، صفحات ۲۹ - ۳۰ -

آسمان و زمین میں یہ سما نہیں سکتی کہ یہ دونوں ہستیاں
اس میں سمائی ہوئی ہیں ۔ پانی آگ کو جذب کر لیتا ہے ،
عدم بُود کو کھا جاتا ہے ، پستی بلندی میں سما جاتی ہے
مگر جو قوت جامع اضداد ہو اور محلّل تمام تناقضات کی ہو
اُسے کون جذب کرے ؟ مُسلم کو موت نہیں چُھو سکتی
کہ اس کی قوّت حیات موت کو اپنے اندر جذب کر کے
حیات و موت کا تناقض مٹا چکی ہے ۔''

یہ خط خاصا طویل ہے ۔ اس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلّم کی سیرت سے فتحِ مکہ کا ایک واقعہ بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ کس طرح مُسلمِ حنیف ، جذباتِ متناقض یعنی قہر و محبت کو اپنے قلب کی گرمی سے تحلیل کرتا ہے ۔ اور اس کا دائرۂ اثر اخلاقی تناقضات تک ہی محدود نہیں بلکہ تمامِ طبعی تناقضات پر بھی حاوی ہے ۔ فرماتے ہیں :

''پھر مُسلم، جو حامل ہے محمدیتؐ کا اور وارث ہے موسویت
و ابراہیمیت کا ، کیونکر کسی شے میں جذب ہو سکتا ہے ۔
البتہ اس زمان و مکان کی مقیّد دنیا کے مرکز میں ایک
ریگستان ہے جو مُسلم کو جذب کر سکتا ہے اور اس کی
قوتِ جاذبہ بھی ذاتی اور فطری نہیں بلکہ مستعار ہے ایک
کفِ پا سے ، جس نے اس ریگستان کے چمکتے ہوئے ذروں
کو پامال کیا تھا ۔''[1]

۱۔ مکاتیبِ اقبال بنامِ گرامی ، صفحات ۱۴۷ - ۱۴۸ ۔

یہ خط اُردو انشا کا ایک ایسا شاہکار ہے جو ادبِ عالیہ میں شمار ہونے کے لائق ہے۔

گرامی کی رحلت سے اقبال کو بے حد قلق ہوا۔ اُنھوں نے مندرجہ ذیل اشعار کہہ کر اپنے دل کا غم ہلکا کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک عظیم شاعر دوسرے بزرگ شاعر کو آنسوؤں کا خراج ادا کر رہا ہے :

آہ ! مولانا گرامی از جہان بربست رخت
آنکہ زد فکرِ بلندش آسماں را پشت پای

معنیِ مستورِ او در لفظ رنگینش نگر
مثلِ حوری بےحجاب اندر بہشتِ دلکشای

از نوای جاں فزای او عجم را زندگی
جام جمشید از شرابِ ناب او گیتی نمای

یاد ایّامی کہ با او گفتگوھا داشتیم
اے خوشا حرفی کہ گوید آشنا با آشنای

بر مزارش پست ترکن پردہ ھای ساز را
تا نہ گردد خواب او آشفتہ از شور نوای

گرامی کی ذات سے اقبال کو جو عقیدت تھی ، اس کی بڑی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ خوش ذوق اور خوش فکر شاعر تھے اور اپنے دور میں کلاسیکی فارسی شاعری کے کامل الفن ادا شناسوں میں شمار ہوتے تھے ۔ پھر فارسی اساتذہ کا کلام ان کو حفظ تھا اور ان کی نظر اتنی گہری تھی کہ نئی نئی تراکیب وضع کرنے میں انھیں کوئی دقّت پیش نہ آتی تھی ۔ اقبال نے جب اپنے پیغام کو آفاق گیر

بنانے کی خاطر اپنے دقیق اور بلند افکار کے اظہار کے لیے اردو سے زیادہ ثروت مند زبان فارسی کی طرف توجہ کی تو انھیں اسلوبِ بیان اور اندازِ اظہار کے اعتبار سے بعض نازک امور میں فارسی شاعری کے کسی بالغ نظر رمزشناس کے ساتھ مذاکرات کی ضرورت پیش آئی ۔ اس کے لیے گرامی سے بہتر کوئی شخصیت نہ تھی ۔ اقبال کا خادم علی بخش ہوشیار پور کا رہنے والا تھا ۔ اقبال کبھی کبھی اسے بھیج کر گرامی کو لاہور بلا لیتے اور دنوں نہیں بلکہ ہفتوں باصرار اپنے ہاں مہمان ٹھہراتے ۔ ان کی ناز برداریاں کرتے ، ان کے آرام و آرائش کا ہر طرح خیال رکھتے ، وقت بے وقت جس چیز کی گرامی کو طلب ہوتی ، مہیا کرتے ۔ شب و روز ان سے علمی گفتگو ہوتی اور اشعار کی باریکیوں پر بحث کی جاتی ۔ اقبال ان کا کلام سن کر محظوظ ہوتے اور اپنا کلام سنا کر ان کی تنقیدوں اور موشگافیوں سے فائدہ اٹھاتے ۔ بعض اوقات شعری الجھنیں پیش کر کے اشکال کے حل میں ان سے راہنمائی حاصل کرتے ۔ یہ سلسلہ آخری دم تک قائم رہا ۔ انھی صحبتوں کو یاد کر کے اقبال کہتے ہیں :

یاد ایّامی کہ با او گفتگو ھا داشتیم
ای خوشا حرفی کہ گوید آشنا با آشنای

شعر کے انہماک نے گرامی کو 'سست الوجود بنا دیا تھا ۔ جہاں بیٹھ جاتے تھے وہاں سے ان کے لیے اٹھنا تو خیر خارج از بحث بات تھی ، انھیں اٹھانا بھی بہت مشکل تھا ۔ تاہم ماحول میں خفیف سی ناسازگاری بھی اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ بن جاتی تھی ۔ ایک مرتبہ اقبال نے علی بخش کو ہوشیار پور بھیجا کہ مولانا گرامی کو لے کر

آئے۔ علی بخش وہاں کئی روز رہا۔ مولانا فرماتے آج چلتے ہیں ، کل چلتے ہیں۔ آخر ایک دن رختِ سفر باندھ ہی لیا۔ سامان تانگے پر رکھوایا ، خود باہر آئے۔ پھر اندر گئے ، بیگم سے باتیں کیں ، کچھ ضروری چیزیں لے کر ٹرنک میں ٹھونسیں اور باہر نکلے۔ گرمی کا موسم تھا۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے تانگے کی نشست تپ گئی تھی۔ سوار ہوتے ہی نیچے اُتر آئے اور سامان بھی اُتروا لیا۔ علی بخش سے کہا ”تم جاؤ ، ڈاکٹر صاحب سے کہنا تانگہ گرم ہو گیا تھا۔ اب سردیوں میں آئیں گے۔“[۱]

لیکن جب ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچ جاتے تو پھر پلٹنے کا نام بھی نہ لیتے۔ بیگم بیماری کا بہانہ کر کے پیغام پر پیغام بھیجتیں لیکن یہاں کچھ اثر نہ ہوتا۔ جانے کو تیار ہو جاتے تو ڈاکٹر صاحب فرماتے : ”یوں تو آپ جس وقت چاہیں گے میں آپ کو بھجوا دوں گا ، لیکن ایک رباعی ذہن میں اَڑ گئی ہے۔ تین مصرعے ہو چکے ہیں ، چوتھا نہیں ہوتا۔ ذرا غور تو کیجیے ، شاید چوتھا مصرع ہو جائے۔“ بس مولانا چوتھے مصرعے کی فکر میں مستغرق ہو جاتے اور بیگم کا خیال دھوآں بن کر اُڑ جاتا۔ مصرع نہ سوجھنے کا تو محض بہانہ ہوتا۔ اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ کسی طرح مولانا گرامی کچھ دیر کے لیے اَور رُک جائیں اور اُن کی پُرلطف صحبت سے لطف اندوز ہونے کا مزید موقع میسر آ جائے۔

۱۔ اس قسم کے بے شمار لطیفے مولانا عبدالمجید خاں سالک کی کتاب ”یارانِ کہن“ اور ”سرگزشتِ سالک“ میں موجود ہیں۔

دوسری طرف مولانا گرامی بھی اقبال کی فکری معجزنمائیوں سے مسحور ہوکر مذاکرات کا حق ایسے انداز میں ادا کرتے تھے گویا اپنی بقائے شہرت کو انھی مذاکرات پر موقوف و مبنی قرار دے لیا تھا ۔ اس اخلاص و مروّت کو بعض لوگوں نے استادی شاگردی کا درجہ دینے کی کوشش کی ہے حالانکہ ان دونوں کے تعلقات کی نوعیت خالص دوستانہ تھی ۔ یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے پر برابر اثر انداز ہوئیں ۔ اقبال کے خطوں کے مطالعے سے یہ بات تو یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے گرامی کی اکثر تنقیدوں سے فائدہ اٹھایا ، ان کے اشاروں اور کنایوں کو سمجھا اور ان سے روشنی حاصل کی ۔ لیکن ترمیموں سے کبھی اتفاق نہیں کیا ۔ بے شک گرامی زبان اور محاورے کے بادشاہ تھے ۔ زیادہ تر زبان کی صفائی کا خیال رکھتے تھے ، لیکن اقبال کی حیثیت ایک شاعر کے علاوہ داعی کی بھی تھی ۔ خالی خولی لفظوں اور محاوروں سے ان کا مطلب واضح نہیں ہوتا تھا ۔ ان کے سوچنے کا انداز مختلف تھا ، پیام کی سطح بلند تھی ، اس لیے ان کی تسلی نہ ہوتی تھی ۔ وہ جس مقام سے گفتگو کرتے اور جس اسلوب سے اپنی بات دوسروں کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے ، وہ بڑی جانکاہی چاہتا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار گرامی کی طرف رجوع کرتے اور بہ اصرار انھیں دعوتِ انتقاد دیتے تھے تاکہ بیان و اسلوب میں کوئی خامی رہ گئی ہو تو اس کا علم ہو جائے اور اس کی اصلاح کی جا سکے ۔ ایک خط میں گرامی کو لکھتے ہیں :

”غزل تنقید کے لیے ہی تو آپ کی خدمت میں ارسال کی تھی ۔ اس پر خوب تنقید کیجیے اور مفصل تحریر فرمائیے ۔

پھر میں انشاءاللہ نظر ثانی کروں گا ۔''

ایک اَور خط میں تحریر فرماتے ہیں :

مہربانی فرما کر غزل کے تمام اشعار پر اعتراض لکھیے تا کہ میں پورے طور پر مستفید ہو سکوں ۔ آپ نے صرف ایک شعر کی تعریف کر دی اور باقی اشعار چھوڑ گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان پر اعتراض کیجیے ۔ آپ کے کسی شعر میں اگر کوئی بات مجھے کھٹکے تو میں بلاتکلّف عرض کر دیا کرتا ہوں ۔ آپ کیوں ایسا نہیں کرتے ؟ مجھے تعریف سے اس قدر خوشی نہیں ہوتی جتنی اعتراض سے ، کیونکہ اعتراض کی تنقید سے علم میں اضافہ ہوتا ہے ۔''

''پیامِ مشرق'' میں ایک نظم ''جہانِ عمل'' کے عنوان سے موجود ہے ۔ ۲۰ نومبر ۱۹۱۸ء کو اس کے چند اشعار گرامی کو بھیجے ۔ ان میں ایک شعر یوں تھا :

حرفِ رازے کہ بروں ازحدِ صوت است ہنوز
از لبِ جام چکیدست و کلام است اینجا

اس کا پہلا مصرع اقبال کو کھٹکتا تھا ۔ گرامی نے اسے یوں تبدیل کرنے کا مشورہ دیا :

حرف آں راز کہ بیگانہ ز صوت است ہنوز

اور لکھا کہ ''راز کو حرف اور صوت کا لباس پہنا دو تو وہ کلام ہو جاتا ہے اور کلام کی تعریف بھی یہ ہے کہ وہ حرف اور صوت سے مرکّب ہو ۔'' مگر اقبال کی اس سے تسلی نہ ہوئی اور انھوں نے

جواب میں لکھا :

''بیگانۂ صوت است ہنوز'' خوب ہے مگر افسوس ہے کہ ''بیگانۂ صوت'' راز کی صفت میں واقع ہوا ہے ۔ حرف کی صفت میں واقع ہونا چاہیے تھا ۔ مجھے اپنا مصرع ابھی تک کھٹکتا ہے ۔ طبیعت حاضر ہو تو پھر غور کروں گا ۔ اس جگرکاوی کا اندازہ عام لوگ نہیں لگا سکتے ۔ ان کے سامنے شعر بنا بنایا آتا ہے ۔ وہ اس روحانی اور لطیف کرب سے آشنا نہیں ہو سکتے جس نے الفاظ کی ترتیب پیدا کی ہے ۔ جہاں اچھا شعر دیکھو ، سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی مسیح مصلوب ہوا ہے ۔ اچھے شعر کا پیدا کرنا اوروں کے لیے کفارہ ہونا ہے ۔''

(۲ دسمبر ١٩١٨ء)

''پیامِ مشرق'' ہی میں اقبال نے چند اشعار ''بوئے گل'' پر لکھے تھے ۔ ان کا خلاصہ یہ تھا کہ جنّت کی ایک حور دنیا کا نظارہ کرنے کے لیے پھول کی صورت میں نمودار ہوئی اور آخر پژمردہ ہو گئی ۔ جس کو لوگ نکہت کہتے ہیں وہ اس حور کی آہ ہے جس کو اس نے دنیا میں اپنی یادگار چھوڑا ہے ۔ آخری شعر یہ تھا :

زندانئے کہ بند ز پایش کشادہ اند
آہے گذاشت است کہ بُو نام دادہ اند

مولوی اسلم جیراج پوری استاد جامعۂ ملّیہ دہلی نے اعتراض کیا کہ ''گذاشت است'' ذوقِ سلیم کو کھٹکتا ہے ۔ اقبال کو بھی ان کے ایراد

میں کچھ نہ کچھ صداقت معلوم ہوئی ۔ انھوں نے گرامی کو لکھا :

''اس شعر پر تنقیدی نظر ڈالیے اور نتیجے سے آگاہ کیجیے ۔ مولوی سلیمان ندوی اور عبدالماجد (دریا بادی) سے بھی استصواب کیا ہے ۔ بہر حال گرامی کی رائے سب پر مقدّم ہے ۔ اس شعر کا مطلع ہونا ضروری ہے کہ بند کا آخری شعر ہے ۔ یوں بھی ہو سکتا ہے :

زاں نازنیں کہ بند ز پایش کشادہ اند
آہے بہ بت یادگار کہ بو نام دادہ اند''

(۲۱ اکتوبر ۱۹۲۳ع)

گرامی نے کوئی ترمیم تجویز کی جس پر اقبال نے انھیں پھر لکھا :

''آپ کی ترمیم سے زبان کے اعتبار سے شعر بہت ستھرا ہو گیا ہے مگر افسوس کہ اس سے وہ مطلب ظاہر نہیں ہوتا جو میں ادا کرنا چاہتا ہوں ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ نازنین خود تو رخصت ہو گئی مگر دنیا میں اپنی آہ چھوڑ گئی ہے ، جس کو لوگ خوشبو کہتے ہیں ۔ آپ کے شعر سے مترشح ہوتا ہے کہ ''وقتِ بند کشادن آہے سر داد'' لہٰذا معانی کے اعتبار سے میں اپنے ہی مطلع کو ترجیح دیتا ہوں ، جس کو آپ نے پسند فرمایا ہے ۔ لیکن ''سر دادنِ آہ'' کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا ۔''

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ، یہ بات یک طرفہ نہ تھی ۔ گرامی کو بھی اقبال کی تنقیدوں سے فائدہ پہنچتا تھا ۔ ایک دفعہ مولانا گرامی نے اپنی ایک غزل رسالہ 'ہمایوں' میں شائع کرانے کے لیے اقبال کو

بھیجی ۔ اقبال نے میاں بشیر احمد کو پہنچانے کی بجائے بعض باتوں کی طرف توجہ دلا کر مولانا کو واپس کر دی کہ اس پر نظرثانی فرمائیں ۔ گرامی نے جواب میں لکھا کہ غزل واپس بھیجنے کی کیا ضرورت تھی ، خود ہی اصلاح کردی ہوتی ۔

اسی طرح جب مولانا گرامی نے حافظ کی غزل پر ایک غزل کہی جس کے چند اشعار خان نیاز الدین خاں نے اقبال کے پاس بھیجے تو اقبال نے اس شعر کی تو تعریف کی :

عصیانِ ما و رحمتِ پروردگارِ ما
این را نہایتی ست نہ آن را نہایتی

اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۹ع کے خط میں خان نیاز الدین خاں کو لکھا :

''شعر مندرجۂ عنوان نے بے چین کر دیا ۔ سبحان اللہ ! گرامی کے اس شعر پر ایک لاکھ دفعہ 'اللہ اکبر' پڑھنا چاہیے ۔ خواجہ حافظ تو ایک طرف ، مجھے یقین ہے کہ فارسی لٹریچر میں اس پائے کا شعر کم نکلے گا ۔ انسان کی بے نہایتی کا ثبوت دیا ہے مگر اس انداز سے کہ موحّد کی روح فدا ہو جائے ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ایک معنی میں انسان بھی بے نہایت ہے اور یہی صداقت مسئلۂ وحدت الوجود میں ہے ۔ شاعر نے اس حقیقت کو اس خوبی سے نمایاں کیا ہے کہ پڑھنے والے پر اسلامی حقائق کا انکشاف ہو جاتا ہے ۔ یہی ہے کمالِ شاعری جو الہام کے پہلو بہ پہلو ہے . . . ''

لیکن مندرجہ ذیل شعر کی نسبت اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے

اقبال نے لکھا :

”عنوان آں نگاہ کہ خوں ریز عالمی
تمہید نیم خند تو مرگ ولایتی

اگر یہ شعر مطلع ہوتا تو خواجہ حافظ کی پوری غزل کا جواب ہوتا ۔ اور اگر یہ مصرع :

تمہید نیم خند تو مرگ ولایتی

خواجہ کو سوجھتا تو وہ اس پر فخر کرتے ۔ البتہ پہلے مصرع میں جو لفظ ”آں“ آیا ہے اس کو کسی نہ کسی طرح نکالنا چاہیے (عنوان آں نگاہ) ۔ یہ مشورہ مولانا کی خدمت میں پیش کیجیے ۔

زیادہ کیا عرض کروں ۔ اب کہ یہ خط لکھ رہا ہوں ، شعر مندرجۂ عنوان کے اثر سے دل سوز و گداز سے معمور ہے ۔ گرامی صاحب اپنے شعر کا فوری اثر دیکھتے تو نہ صرف میری ولایت کے قائل ہو جاتے بلکہ اپنی ولایت میں بھی انھیں شک نہ رہتا . . . “

معلوم ہوتا ہے کہ خان نیاز الدین خاں نے مولانا کو اقبال کی رائے سے مطلع کیا اور مولانا نے اقبال کا مشورہ قبول کر کے اپنے شعر میں مناسب تبدیلی کر دی ۔ چنانچہ خان نیاز الدین خاں کو لکھا :

”کیوں گرامی کو پندار کی کشاکش میں پھنساتے ہیں ۔ جناب ڈاکٹر صاحب کی بالغ نظری ، عالی دماغی کی دلیل ہے کہ انھوں نے گرامی کے شعر کو پسند کیا ۔ وہ فلاسفر ہیں ، حکیم ہیں ، گرامی ایک دقیانوسی جہل کا مریض

ہے ۔ آپ گرامی کی طرف سے ان کی خدمت میں شکریہ ادا
کر دیجیے :

عنوانِ یک نگاہ تو آشوبِ عالمی
تمہیدِ نیم خند تو مرگِ ولایتی

ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں میری طرف سے لکھ دیجیے کہ
اس شعر کو مطلع بنا دیں گے تو وہ مطلعِ آفتاب ہوگا ۔''[1]

خان نیازالدین خاں نے یہ پیغام بھی اقبال کو پہنچایا اور ساتھ ہی لکھ دیا کہ یہ بات مولانا گرامی کے ذہن میں نہ تھی جو آپ نے ان کے شعر سے پیدا کی ۔ اس پر اقبال نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۹ع کو گرامی کی ترمیم کے بارے میں لکھا :

''گرامی کے شعر میں ''یک'' نہایت موزوں ہے ۔ ''یک نگاہ'' اور ''نیم خند'' کا مقابلہ نہایت لطیف ہے ۔ یہ کچھ ضروری نہیں کہ صاحبِ الہام اپنی بلاغت سے خود بھی آگاہ ہو ۔ اگر گرامی صاحب کے خیال میں وہ معانی نہ تھے تو کچھ مضائقہ نہیں ۔ ان کے الفاظ میں تو موجود ہیں . . . ''[2]

انھی باتوں کی بنا پر گرامی اپنے خط میں خان نیازالدین خاں کو لکھتے ہیں :

''حضرت ڈاکٹر صاحب کا شعر لاجواب ہے اور سنگلاخ

۱۔ مکاتیبِ گرامی بنامِ نیازالدین خاں ، مطبوعہ ہفتہ وار ''لاہور'' ، ۹ مارچ ۱۹۶۴ع ، ص ۷ ۔
۲۔ مکاتیبِ اقبال بنامِ نیازالدین خاں ، ص ۲۳ ۔

زمین میں ہے ۔ گرامی کا فکرِ سال خوردہ اس زمین میں ٹھوکریں کھا رہا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب مجدد ہیں ، فلاسفر ہیں ، ادب آموزِ ہند ہیں ۔ گرامی ان کا سا دماغ کہاں سے لائے ۔ دو تین شعر لکھتا ہوں ۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمتِ عالی میں بھیج دیجیے ۔ ان کی داد سمیٹیے ۔ دوسروں کی داد عین بے داد ۔''[1]

گرامی نے اپنے لیے ''سال خوردہ'' استعمال کیا تھا ۔ اقبال نے ان کو چھیڑنے کے لیے لکھا :

''گرامی سال خوردہ ہے یعنی سالوں اور برسوں کو کھا جاتا ہے ۔ پھر بوڑھا کس طرح ہو سکتا ہے ؟ بوڑھا تو وہ ہے جس کو سال اور برس کھا جائیں ۔''

(۴ نومبر ۱۹۱۸ع)

اس پر گرامی نے لکھا :

''گرامی سفید ریش ہے ، غزالانِ معانی کو دام میں نہیں لا سکتا ۔ ممکن ہے ریشِ سفید سے رم کرتی ہوں ۔ چند روز صبر کیجیے ۔ خضاب سے ریشِ دلریش کا منہ کالا کروں گا ، پھر غزل لکھوں گا ۔ جناب نے صحیح کہا ہے :

از خضابم نہ رسد مطلبِ دیگر بہ خیال
ایں قدر هست کہ آهو نظراں رم نہ کنند''

۱- مکاتیبِ گرامی بنامِ نیاز الدین خاں ، ہفتہ وار ''لاہور'' ، ۹ مارچ ۱۹۶۳ع ، ص ۹ ۔

یہ دلچسپ مذاکرات اقبال کے ایک خط کے اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔ ۵ جنوری ۱۹۲۲ء کو اقبال نے مولانا گرامی کو لکھا:

"مجھے تو آپ کے اس شعر نے تڑپا دیا:

کتابِ عقل ورق در ورق فرو خواندیم
تمام حیلہ فروشی و مدعا طلبی است

مضمون میرے حسبِ حال تھا۔ تمام عمر کتابوں کی ورق گردانی میں گزری اور آخر یہ معلوم ہوا کہ کتاب حیلہ فروشی و مدعا طلبی کے سوا کچھ نہیں۔ عقل اس سے بڑھتی ہے مگر دل روشن نہیں ہوتا۔ آپ کا شعر پڑھتے ہی میری آنکھوں سے اس زور کے ساتھ آنسو اُمڈے کہ ضبط نہ ہو سکا:

خرد افروز مرا درسِ حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

نے عشق، نہ عقل، نے تصرف، نہ اثر
پیچیدہ بہ خویش مردہ در تابوتیم

سبحان اللہ! سبحان اللہ! آپ کے ایک ایک مصرع میں سو سو بوتل کا نشہ ہے۔ اسی واسطے تو گرامی پیرِ مغاں ہے۔"

☆ ☆ ☆

۱۵

شاد عظیم آبادی

(۱۹۲۷ء)

سیّد علی محمد شاد عظیم آبادی ۱۸۴۶ء (۹ محرّم ۱۲۶۲ھ) میں عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے جس خاندان میں آنکھ کھولی، وہ اپنی منزلت و اعزاز، دولت و امارت اور علم و فضل کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتا تھا۔ خوش حالی اور فارغ البالی کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے چرچوں میں رہ کر انھوں نے بچپن ہی سے عربی، فارسی اور اردو میں خاصی مہارت پیدا کر لی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں فیض آباد کے ایک محقّقِ زبانِ اردو بزرگ میر سیّد محمد، جو میر انیس کے ہم سن اور پڑوسی تھے، عظیم آباد آئے اور شاد کے اتالیق مقرر ہوئے۔ یہ انھی کی تربیت کا اثر تھا کہ جس نے شاد کی زبان کو فصیح و بلیغ اور مستند بنا دیا۔

شاد نے پندرہ برس کی عمر میں شاعری شروع کی اور شاہ اُلفت حسین فریاد عظیم آبادی سے کلام پر اصلاح لی۔ راسخ عظیم آبادی

سے بھی استفادہ کیا ۔ تمام عمر اُردو ادب کی خدمت میں گزاری اور نظم و نثر کی کئی تصانیف یادگار چھوڑیں ۔ ان علمی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ وقت نے انہیں ۱۸۹۱ع میں ''خان بہادر'' کا خطاب اور ایک ہزار روپیہ سالانہ کا وظیفہ عطا کیا ۔ ۳۲ برس آنریری مجسٹریٹ رہے اور ۱۹۲۷ع میں پٹنہ میں انتقال کیا ۔[1]

شروع شروع میں حافظ شیرازی کی طربیہ شاعری اور جرأت کی رنگینی کا اثر شاد کے کلام پر نمایاں تھا لیکن زمانے کی نامساعدت نے ان کو المیہ نگاری پر مجبور کر دیا اور ان کے کلام میں حزن و ملال اور درد و کرب کا رنگ اُبھرنا شروع ہوگیا ۔ مگر میر کی غم کوشی کے برخلاف ان کے غم میں ایک طنز ، تلخی اور آرزومندی کی جھلک پائی جاتی ہے ۔ ان کی غزلوں کا ایک منتخب دیوان ۱۹۳۸ع میں ان کے ایک عزیز شاگرد حمید عظیم آبادی نے مرتب کر کے ''نغمۂ الہام'' کے نام سے شائع کیا ۔ پھر ''الہاماتِ شاد'' کے نام سے ایک مختصر سا مجموعہ (مع سوانح) عبدالمالک آروی نے طاقِ بستان آرہ سے شائع کیا ۔

شاد کے اس قسم کے اشعار بے حد مشہور اور مقبول ہیں :

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ، ملنے کے نہیں ، نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم ، اے ہم نفسو ! وہ خواب ہیں ہم

۱- تذکرۂ جدید شعرائے اُردو (فیروز سنز) ، دوسرا حصہ ، صفحات ۲۶۷ - ۲۷۵ -

اے شوق پتا کچھ تو ہی بتا، اب تک یہ کرشمہ کھل نہ سکا
ہم میں ہے دلِ بے تاب نہاں، یا آپ دلِ بے تاب ہیں ہم
میں حیرت و حسرت کا مارا، خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبّت کہتا ہے، آ کچھ بھی نہیں، پایاب ہیں ہم
لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں، منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ قدر کرو، نایاب نہ ہوں، کمیاب ہیں ہم
مرغانِ قفس کو پھولوں نے، اے شاد! یہ کہلا بھیجا ہے
آ جاؤ جو تم کو آنا ہو، ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

تمنّاؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
ہوں اس کوچے کے ہر ذرے سے آگاہ
اُدھر سے مدتوں آیا گیا ہوں
نہیں اُٹھتے قدم کیوں جانبِ دیر
کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں
دلِ مضطر سے پھر ہے رونقِ بزم
میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں
لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

یہ بزمِ مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے

شاد 'مخزن' لاہور کے ابتدائی لکھنے والوں میں تھے اس لیے اقبال ان کی شاعرانہ قدر و قیمت سے اور وہ اقبال کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں سے پوری طرح واقف تھے۔ اقبال کے مندرجہ ذیل خط سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ وہ اپنے اس باکمال ہم عصر کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے:

"لاہور - ۲۵ اگست ۱۹۲۴ع

مخدومی تسلیم!

آپ کا والا نامہ مجھے ابھی ملا ہے۔ اس غائبانہ عقیدت کی وجہ سے جو آپ سے ہے، یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ اللہ تعالٰی کے فضل و کرم سے بہمہ وجوہ خیر و عافیت سے ہیں اور باوجود پیرانہ سالی کے آپ کی لٹریری مصروفیتیں کم نہیں ہوئیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی تصانیف تمام ملک کے لیے مفید ہوں گی اور دعا ہے کہ اللہ تعالٰی آپ کو ان کی تکمیل کے لیے دیر تک سلامت رکھے۔ جس تمدنی نظام نے آپ کو پیدا کیا وہ تو اب رخصت ہو رہا ہے بلکہ ہو چکا ہے لیکن آپ کی ہمہ گیر دماغی قابلیت اور اس کے گراں بہا نتائج اس ملک کو ہمیشہ

یاد دلاتے رہیں گے کہ موجودہ نظامِ تمدن پرانے نظام کا نعم البدل نہیں ہے - کاش عظیم آباد قریب ہوتا اور مجھے آپ کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا - شیخ عبدالقادر صاحب مع الخیر ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے (ان کے) بہت سے بال بچے ہیں - تھوڑے عرصے کے لیے ہائی کورٹ لاہور کے جج[1] بھی ہوگئے تھے مگر اب پریکٹس کرتے ہیں - آج کل لاہور سے باہر ہیں - انشاء اللہ جب ان سے ملاقات ہوگی، آپ کا سلام ان تک پہنچا دوں گا - اور مجھے یقین ہے کہ آپ کی خیریت سن کر وہ بھی میری طرح بے انتہا مسرور ہوں گے - امید ہے کہ جناب کا مزاج اچھا ہوگا -

مخلص

محمد اقبال لاہور"

☆ ☆ ☆

۱- ۱۳ مئی ۱۹۲۱ء سے ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۲ء تک لاہور ہائی کورٹ کے جج رہے -

۱۶

پیرزادہ محمد حسین عارف

(۱۹۲۸ع)

پیرزادہ محمد حسین عارف مشرقی تہذیب و شرافت کا ایک قابلِ تقلید نمونہ تھے ۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے پہلے ایم ۔ اے ۔ فارسی ہونے کے علاوہ اعلٰی پایے کے مترجم ، قانون دان ، ریاضی دان ، ماہرِ فلسفہ اور پاکیزہ گو شاعر تھے ۔[1] وہ ۱۰ محرّم ۱۲۷۳ھ (۱۰ ستمبر ۱۸۵۶ع) کو مہم ضلع رہتک میں پیدا ہوئے ۔ ''دہلی دربار رپورٹ'' ۱۹۱۱ع کے مطابق :

''آپ مہم ضلع رہتک کے قدیم اور معزز قریشی خاندان سے ہیں ۔ دہلی کے پٹھان سلاطین اور مغل شاہنشاہوں کے ماتحت اس خاندان کے متعدد افراد اعلٰی عہدوں پر فائز رہے ہیں ۔ اضلاع حصار ، رہتک گوڑگاؤں کے مسلم راجپوتوں کو حلقہ بگوشِ اسلام کرنے میں اور ان کی اصلاح کرنے میں

۱۔ اوریئنٹل کالج میگزین لاہور ، بابت مئی ۱۹۶۳ع ۔

اس خاندان نے نمایاں کام کیا ہے ۔"[1]

مشہور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر لائٹنر، پرنسپل پنجاب یونیورسٹی اوریئنٹل کالج لاہور، نے ۱۸۸۱ء میں آپ کو اس کالج کا اسسٹنٹ پروفیسر اور شعبۂ اُردو کا صدر مقرر کیا ۔ دو سال بعد آپ کو ریاضی اور فلسفہ پڑھانے پر لگا دیا گیا ۔ اس عرصے میں آپ پنجاب کی قانونی جماعت کے رکن بھی تھے اور اخبار "انجمنِ پنجاب" کے مدیر بھی ۔ آپ کی قابلیت سے خوش ہو کر ڈاکٹر لائٹنر نے آپ کا نام ای ۔ اے ۔ سی کے امتحانِ مقابلہ کے لیے بھیج دیا، جس میں کامیاب ہو کر ۱۸۸۵ء سے آپ نے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا ۔ ۱۸۹۰ء سے ۱۹۰۶ء تک آپ بطور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے خدمات انجام دیتے رہے ۔ ۱۹۰۶ء ہی میں دربارِ کشمیر نے آپ کی خدمات مستعار لے لیں ۔ وہاں آپ نے کشمیر کے نئے ہائی کورٹ کا اجرا کیا جس کے آپ واحد جج تھے ۔ اسی زمانے میں آپ نے ۱۶۵ اشعار کی ایک نظم "آئینۂ کشمیر" لکھی جس میں کشمیریوں کے حالِ زار کا نہایت دردناک نقشہ پیش کیا گیا ہے ۔ چار سال بعد آپ کو ڈویژنل اور سیشن جج بنا کر حصار میں متعیّن کر دیا گیا ۔ ۱۹۱۰ء میں آپ کو "خان بہادر" کا خطاب اور ۱۹۱۱ء کے دربار دہلی میں کرسی ملی ۔ ۱۹۱۲ء کے آخر میں آپ نے ملازمت سے سبکدوش ہو کر دہلی میں سکونت اختیار کر لی جہاں حکیم اجمل خاں مرحوم نے آپ کو طبّیہ کالج کا سیکرٹری مقرر کر دیا ۔ وہیں ۷ شوال

۱۔ دہلی دربار رپورٹ، ۱۹۱۱ء، ص ۳۸۱ ۔

۱۳۴۶ھ (۳۰ مارچ ۱۹۲۸ء) کو آپ کا انتقال ہوا اور طبیہ کالج کے احاطے ہی میں ایک نمایاں جگہ دفن کیے گئے۔

پیرزادہ صاحب اگرچہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں لاہور سے باہر رہے ہیں مگر لاہور کے علمی حلقوں میں ان کی خاصی شہرت تھی۔ اقبال بھی ان کے علمی کارناموں سے اچھی طرح واقف تھے۔ پیرزادہ صاحب کے فرزند بشیر احمد جب بیرسٹری کے لیے ولایت گئے تو اتفاق سے اسی جہاز میں سوار ہوئے جس میں علامہ اقبال سفر کر رہے تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ تعلیم پائی۔

پیرزادہ صاحب گورنمنٹ کالج لاہور میں مولوی محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے۔ ان کی صحبت میں رہ کر وہ بھی سیدھے سادے شعر کہنے لگے۔ چنانچہ اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں:

آنکھیں تو نے دیکھی ہیں آزاد کی
طرزِ نو کی نظم کے استاد کی

جب ہوا گم ملک سے ذوقِ سلیم
نظم میں کی اس نے اصلاحِ عظیم

یہ بتایا لکھ کے ''نیرنگِ خیال''
اس طرح لکھتے ہیں نثر اہلِ کمال

خضر سے محروم اسکندر رہا
قوم کو ''آبِ حیات'' اس نے دیا

عکس کھینچا ''اکبری دربار'' کا
یہ دیا تاریخ دانوں کو دکھا

اس طرح تاریخ اور انشا بہم
جمع کر سکتا ہے اِک جادو رقم

استوا پر شمسِ عقل آیا نہ تھا
حیف اسے ابرِ جنوں نے ڈھک لیا

مگر جب سیشن جج ہو کر فیروزپور میں تعینات ہوئے تو شہزادہ میرزا عبدالغنی ارشد گورگانی کی صحبت میسّر آئی اور ان سے باقاعدہ اصلاح بھی لی۔ خود کہتے ہیں :

جستجو ہے کیوں کسی استاد کی
پاس ہے جب میرزا عبدالغنی

کون بہتر ارشدِ نقّاد سے
جانتا ہے قافیے کے قاعدے

نظم کر کے کچھ حکایات اے عزیز!
اُس کو دکھلا ، نظم ہے جس کی کنیز

مستند ہے ہند میں جس کی زباں
نُقلِ محفل جس کی ہے طرزِ بیاں

یہ وہی ارشد گورگانی ہیں جنھوں نے اقبال کے اِس شعر کی تعریف کر کے اسے زندۂ جاوید کر دیا ہے :

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

پیرزادہ صاحب نے جن انگریزی ، عربی ، فارسی کتابوں اور رسالوں کے ترجمے کر کے آردو ادب کو مالا مال کیا ، ان میں چند ایک کے

نظم یہ ہیں :

منطقِ استقرائی ۔

مفتاح الافلاک یا علمِ ہیئت ۔

رسالہ سیاستِ مدن ۔

تشریحاتِ قوانینِ انگلستان ۔

اصولِ قانون ۔

رسالۂ علمِ سکونِ سیّالات ۔

رسالۂ علمِ سیّارات ۔

سر ولیم ہملٹن کے فلسفے کا خلاصہ ۔

علم اصولِ قانون ۔

رسالہ اقسام حقیقتِ اراضی و طریق ہائے مالگذاری ۔

عجائب الاسفار ترجمۂ سفرنامۂ ابنِ بطوطہ ۔

قصیدۂ ''بانت سعاد'' اور قصیدۂ ''بردہ'' (ان عربی قصائد کا منظوم ترجمہ) ۔

ذکر العارفین (بابا داؤد خاکیؒ کی نظم ''ورد المریدین'' — ۹۹۱ھ) کا ترجمہ (۱۳۲۹ھ) ۔

منظوم ترجمۂ آیت الکرسی وغیرہ ۔

۱۹۰۰ء میں آپ نے مثنوی مولانا روم کی سو حکایات کا اسی کی بحر میں سلیس ترجمہ کیا جو ''عقدِ گوہر یا موتیوں کا ہار'' کے نام سے موسوم ہے ۔ یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے اور ۱۳۲۶ اشعار پر مشتمل ہے ۔ ہر حکایت بیان کرنے کے بعد اس سے کوئی سبق آموز نتیجہ اخذ کیا گیا ہے ۔ اس کتاب کی اشاعت کے موقع پر اقبال نے چھ

قطعاتِ تاریخ لکھے تھے جن میں چار اُردو کے ہیں اور دو فارسی کے۔ ذیل میں یہ قطعات ملاحظہ فرمائیے تاکہ آپ کو مصنّف کی نسبت اقبال کی رائے معلوم ہو جائے اور یہ پتا چل جائے کہ اقبال پیرزادہ صاحب کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے:

مرحبا اے ترجمانِ مثنویِ معنوی
هست هر شعرِ تو منظورِ نگاهِ انتخاب
از پئے نظّارهٔ گلدستهٔ اشعارِ تو
حسنِ گویائی ز روئے خویش بردارد نقاب
بہرِ سالِ طبعِ قرآنِ زبانِ پہلوی
بلبلِ دل می سراید تلک آیات الکتاب

۱۳۱۷ھ

میرے مخدوم و مکرّم نے لکھی ایسی کتاب
شاہدِ لیلائے عرفاں کا جسے محمل کہیں
ہے مصنّف نخل بندِ گلشنِ معنی اگر
مزرعِ کشتِ تمنّا کا اسے حاصل کہیں
از پئے تاریخ ہاتف نے کہا اقبال سے
زیب دیتا ہے اگر مرغوبِ اہلِ دل کہیں

۱۳۱۸ھ

غیرتِ نظمِ ثریّا ہے یہ نظمِ دلکش
خوبیٔ قول اسی نظم کی شیدائی ہے

فکرِ تاریخ میں میں سر بگریباں جو ہوا
کہہ دیا دل نے یہ خضرِ رہِ دانائی ہے

۱۹۰۰ع

کتابِ مولوئ معنوی را
شفیقے ما چوں در اردو رقم کرد
سروشِ دل رقم زد بہرِ تاریخ
خیابانے ز بستانِ عجم کرد

۱۳۱۷ھ

بزمِ سخن میں اہلِ بصیرت کا شور ہے
یہ نظم ہے کہ چشمِ فصاحت کا نور ہے
میں نے کہا یہ دل سے کہ اے مایۂ ہنر
تاریخِ سالِ طبع کا لکھنا ضرور ہے
ہاتف نے دی صدا سرِ اعدا کو کاٹ کر
حقّا یہ نظم موجِ شرابِ طہور ہے

۱۹۰۱ع

روح فردوس میں رومی کی دعا دیتی ہے
آپ نے خوب کیا اور اسے خوب لکھا
دردمندانِ محبت نے اسے پڑھ کے کہا
نقشِ تسخیر پئے طالب و مطلوب لکھا
ہاتفِ غیب کی امداد سے ہم نے اقبال
بہرِ تاریخ اشاعت سخنِ خوب لکھا

۱۳۱۸ھ

یقین سے نہیں کہا جا سکتا مگر قرائن بتاتے ہیں کہ علامہ اقبال کو مولانا روم کی ذات سے جو عقیدت بعد میں پیدا ہوئی ، اس کے محرّکات میں اس کتاب کا بھی حصّہ ہے اور شاید یہی کتاب نقطۂ آغاز ہو ۔

پیرزادہ صاحب کا نادر کتب خانہ ، جس میں ۸۰۹ منتخب مطبوعہ کتابیں اور ۱۶۵ نہایت قیمتی قلمی نسخے تھے ، ۱۹۲۹ع سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں منتقل ہو چکا ہے اور ''مجموعۂ پیرزادہ'' کے نام سے موسوم ہے ۔

☆ ☆ ☆

۱۷

مولانا محمد علی جوہر

(۱۹۳۱ء)

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر (ولادت ۱۸۷۸ء) انگریزی کے زبردست انشا پرداز، اردو کے قادر الکلام شاعر، ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' کے بے باک ایڈیٹر، آتش بیان مقرر، ماہر سیاست دان، ہندوستان کی کامل آزادی کے مخلص علمبردار اور مسلمانوں کے محبوب رہنما تھے۔ علی گڑھ اور کیمبرج میں تعلیم پائی لیکن زندگی کا ایک بڑا حصہ قومی تحریکات کی نذر کیا۔ قید بھی ہوئے، صحت بھی تباہ کی اور زندگی کی ہر عزیز متاع آزادیٔ وطن کی راہ میں بے دریغ قربان کر دی۔ علامہ اقبال کو یورپ اور انگریزی خواں طبقے میں روشناس کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ۱۹۱۶ء سے دسمبر ۱۹۱۹ء تک جب وہ چھندواڑہ میں نظر بند تھے، تو قرآن مجید کے بعد اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' ہی ان کے زیرِ مطالعہ رہتی تھی۔

تحریکِ خلافت کے قائد کی حیثیت سے مولانا لاہور تشریف لائے

تو اقبال سے بھی ملے ۔ اقبال اُن دنوں انارکلی والی بیٹھک میں رہتے تھے ۔ مولانا نے اقبال کو ملامت کے انداز میں کہا : ''ظالم ! آپ نے اپنی پُرجوش نظموں سے لوگوں کو گرما کر ان کی زندگی میں تو ہیجان برپا کر دیا ہے مگر خود اپنی جگہ سے اُٹھ کر عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے ۔''

اقبال نے کہا ''آپ بھی عجیب آدمی ہیں ۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میں قوم کا قوال ہوں ۔ اگر قوال خود ہی وجد و حال میں شریک ہو کر ھُو حق میں تہہ و بالا ہونے لگے تو قوالی ہی ختم ہو جائے ۔ اس کو تو مجلس میں رہ کر بھی مجلس سے الگ ہی رہنا اور دوسروں کو جوش دلانا چاہیے ۔''

دسمبر ۱۹۱۹ع میں جب مولانا محمد علی جوہر چار سال کی طویل نظربندی کاٹ کر 'کانگرس' اور 'خلافت' کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے امرتسر آئے تو اقبال بھی وہاں پہنچے ۔ راستے میں چند شعر ہو گئے جو اقبال نے علی برادران کو مخاطب کرتے ہوئے جلسے میں پڑھ کر سنائے ۔ یہ شعر ''بانگِ درا'' میں 'اسیری' کے عنوان سے موجود ہیں ۔ ان میں کہا گیا ہے کہ قید ہونے والے کی فطرت بلند ہو تو قید اس کا مرتبہ بڑھا دیتی ہے ۔ ابر بہار کی بوند کو دیکھو کہ سیپی میں بند ہو کر موتی بن جاتی ہے اور عزت و آبرو پاتی ہے :

ہے اسیری اعتبار افزا ، جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ ازفر چیز کیا ہے ؟ اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دامِ قفس سے بہرہ مند
''شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند''

پھر ۱۹۲۰ع میں جب مولانا ایک وفد کے ہمراہ برطانیہ کے وزیر اعظم لائڈ جارج کے سامنے خلافت کا مسئلہ پیش کرنے ولایت گئے اور ناکام لوٹے تو اقبال نے اس دریوزہ گری کو باعثِ ننگ قرار دیا اور کہا :

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے ، جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

''مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی''

یہ اشعار بھی ''دریوزۂ خلافت'' کے عنوان سے ''بانگِ درا'' میں شامل ہیں ۔ اصل فارسی شعر میں ، جس کو تضمین کیا گیا ہے ، ''دیگراں'' کی جگہ ''ناکساں'' تھا ۔ اقبال نے مصلحتاً لفظی تغیّر کیا ہے ۔

پہلی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے مولانا انگلستان تشریف لے گئے تھے ۔ وہاں مشرق کی حمایت میں مغرب والوں سے

سیاسی جنگ لڑتے ہوئے آپ نے اپنی آخری تقریر میں فرمایا :

''آج جس مقصد کے لیے میں یہاں آیا ہوں ، وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جاؤں جب آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو ۔ میں اب غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا ۔ میں ایک غیر ملک میں ، جب تک وہ آزاد ہے ، مرنے کو ترجیح دوں گا ۔ اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی ۔''

مردِ مومن کی زبان سے نکلی ہوئی یہ بات پوری ہوئی - ۴ جنوری ۱۹۳۱ع کو انھوں نے لندن میں انتقال کیا اور سیّد امین الحسینی مفتیِ فلسطین کے اصرار پر انھیں مسجدِ قدس کے ایک حجرے میں ، جو مشرقی جانب ہے ، دفن کیا گیا ۔ ساری دنیا نے ان کے مرنے پر سوگ منایا ۔ اقبال نے انتہائی دل سوزی سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا :

یک نفس جانِ نزارِ او تپید اندر فرنگ
تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں درگذشت
ای خوشا مشتِ غبارِ او کہ در جذبِ حرم
از کنارِ اندلس ، از ساحلِ بربر گذشت
خاکِ قدس او را بآغوشِ تمنّا در گرفت
سوی گردوں رفت زاں راہی کہ پیغمبر گذشت
می نہ گنجد جزباں خاکی کہ پاک از رنگ و بوست
بندۂ کُو از تمیزِ اسود و احمر گذشت

جلوۂ او تا ابد باقی بچشم آسیاست
گرچہ آں نور نگاہی خاور از خاور گذشت

مولانا محمد علی جوہر کے کارناموں میں ان کی غزل سرائی کوئی بڑا درجہ نہیں رکھتی ، لیکن جس طرح ان کی آخری پیش گوئی کی صداقت کو دنیا نے دیکھا اور تسلیم کیا کہ وہ مر جانا قبول کریں گے مگر آزادی حاصل کیے بغیر غلام ہندوستان میں واپس جانا پسند نہیں کریں گے ، ان کے مرنے پر معلوم ہوا کہ انھوں نے زندان خانے میں بیٹھ کر اپنے جن واردات کو نظم کیا تھا ، وہ بھی سر تا سر صداقت تھیں اور پیش‌گوئیوں کی عجیب و غریب مثالیں ۔ انھوں نے فرمایا تھا :

اللہ ہی کے رستے میں جو موت آئے تو اچھا
اکسیر یہی ایک دعا میرے لیے ہے

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

ع : ساتم یہ زمانے میں پیا میرے لیے ہے

صاحبِ دل شاعر کی ان پیش‌گوئیوں کی صداقت سے کون انکار کر سکتا ہے ؟

یکم فروری ۱۹۳۱ع کو علامہ اقبال نے ایک خط میں ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ حیدر آبادی کو لکھا :

"مسٹر محمد علی مرحوم کا خاتمہ بخیر ہوا ۔ اگرچہ میں ان

کی سیاست کا کبھی مداح نہ تھا ، لیکن ان کی اسلامی سادگی اور آخری سالوں میں اپنی بعض آراء کے بدل لینے میں جس امانت و دیانت کا انھوں نے ثبوت دیا ، بہت احترام کرتا ہوں ۔ اپنے متعلق ان کی پیش گوئی بھی درست ثابت ہوئی اور اس سے بھی قوم میں ان کا وقار بڑھ گیا ۔ مسجدِ اقصیٰ میں آخری آرام گاہ کا میسر آنا ان کی خوش نصیبی ہے ، جس سے ان کا مرتبہ بلند تر ہوگیا ہے ۔ اب تو محض ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے ان کا مرتبہ نہایت ارفع ہو چکا ہے ۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے ۔''[1]

☆ ☆ ☆

۱- اقبال نامہ ، مرتبہٴ شیخ عطاء اللہ ، جلد اول ، ص ۲۶۸ -

۱۸

مولوی محبوب عالم

(۱۹۳۳ء)

سیالکوٹ سے تعلیم کے سلسلے میں لاہور آنے کے بعد اقبال کو جن احباب کی اوّلین صحبت میسر آئی ، ان میں مولوی محبوب عالم مدیر ''پیسہ اخبار'' لاہور بھی تھے - ان کے کارخانے میں ماسٹر چراغ دین ایک دفتری تھا جو سیالکوٹ کا رہنے والا تھا - وہ ہارمونیم بہت اچھا بجاتا تھا - اقبال کی اس سے دوستی تھی - اس وجہ سے بھی اقبال اکثر ''پیسہ اخبار'' کے دفتر میں آتے جاتے اور وہاں نشست و برخاست رکھتے تھے -

اُس وقت پنجاب میں پریس کافی ترقی کر چکا تھا اور اخبار بکثرت شائع ہوتے تھے- لاہور کا سب سے قدیم اور مشہور اخبار ''کوہِ نور'' پچاس کے پیٹے میں تھا - تین چار اَور اخباروں کا بھی چرچا تھا —— مولوی محبوب عالم کا ''پیسہ اخبار''، پنڈت مکند رام گرٹو اور ان کے صاحبزادے پنڈت گوپی ناتھ کا اخبار ''عام'' اور مولوی محرّم علی چشتی

کا ''رفیقِ ہند'' ـــــ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی طرز میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔

بعد میں مولوی انشاءاللہ خاں کا اخبار ''وطن''، منشی محمدالدین فوق کا اخبار ''پنجۂ فولاد'' و ''کشمیری میگزین'' اور شیخ عبدالقادر کا رسالہ ''مخزن'' جاری ہوا اور اقبال نے ایک ہونہار نوجوان کی طرح پریس کی قوت سے خاطرخواہ فائدہ اٹھایا ۔ ان کے مضامین ، ان کی نظمیں ، غزلیں ، ان کی ذہنی و فکری صلاحیتیں اور دیگر سرگرمیاں جس اخبار کے ذریعے سب سے پہلے عوام کے سامنے آئیں وہ ''پیسہ اخبار'' ہی تھا۔ اس اخبار کی فائلوں میں اقبال کی زندگی سے متعلق معلومات کے بیش بہا خزانے مدفون ہیں جن سے اقبال کے سوانح نگاروں نے کم ہی فائدہ اٹھایا ہے ۔

میں اس مضمون میں مولوی محبوب عالم کے تعارف کے ساتھ ساتھ چند ایسے واقعات کا ذکر بھی کروں گا جو اقبال کی زندگی پر بالکل نئی روشنی ڈالتے ہیں ۔

مولوی محبوب عالم ۱۸۶۳ء میں موضع بھروکی متصل وزیرآباد (ضلع گوجرانوالہ) میں اپنے ننہال کے ہاں پیدا ہوئے۔ برج اٹاری متصل لاہور میں آپ کے چچا مولوی احمد دین مدرس تھے ۔ یہاں آپ نے پرائمری کا امتحان پاس کیا ۔ وہاں سے قصورگئے جہاں آپ کے دوسرے چچا ماسٹر محمد الدین مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور ایک ماہوار رسالہ ''کلیدِ امتحان مڈل و انٹرنس'' بھی نکالا کرتے تھے ۔ مڈل کا امتحان وہاں سے پاس کرنے کے بعد ۱۸۸۰ء میں آپ میڈیکل کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح میڈیکل

کالج میں داخل ہونے کے لیے ایف - ایس سی اور بی ایس - سی کی کڑی شرائط نہ تھیں - تاہم چند ماہ بعد آپ کو یہ کالج چھوڑنا پڑا کیونکہ آپ کے والد مولوی اللہ دین کا انتقال ہو گیا اور آپ کے لیے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے وسائل مسدود ہو گئے -

اب آپ نے امتحان منشی و منشی عالم کی تیاری شروع کی اور منشی کے امتحان میں صوبہ بھر میں اول رہے - انعام بھی لیا اور وظیفہ بھی حاصل کیا - منشی عالم کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ آپ نے ۱۸۸٦ء میں ایک مطبع خادم التعلیم کے نام سے قائم کیا اور اپنے چچا کا رسالہ ''کلیدِ امتحان'' لاہور سے نکالنا شروع کیا - مگر بعض گھریلو حالات سے مجبور کر آپ کو مطبع لاہور سے گوجرانوالہ منتقل کرنا پڑا - جب وہاں بھی کام نہ چلا اور حالات روبراہ نہ ہوئے تو آپ اپنے وطن موضع فیروز والہ (ضلع گوجرانوالہ) میں چلے گئے اور وہیں سے ۱۸۸۷ء میں ایک ہفتہ وار اخبار ''ہمّت'' اور دوسرا ہفتہ وار اخبار ''سکول ماسٹر'' جاری کیا -

تجربے سے آپ کو معلوم ہوا کہ پبلک کو ایک سستے اور صحیح معنوں میں اخبار کی ضرورت ہے - چنانچہ آپ نے ''ہمّت'' کو ''پیسہ اخبار'' میں تبدیل کر کے ایک ہی ماہ بعد اپنا پریس اور کاروبار فیروز والہ سے پھر گوجرانوالہ میں منتقل کر لیا - ''پیسہ اخبار'' کا پہلا پرچہ مولوی محبوب عالم کے چھوٹے بھائی منشی عبدالعزیز نے خود سکولوں میں لے جا کر ایک ایک پیسہ میں فروخت کیا - بعد میں اس اخبار نے اتنی ترقی کی کہ یہ اپنی کم قیمت اور دلچسپ مضامین کی بدولت بہت جلد ہندوستان کا ''ٹٹ بٹس'' (Tit Bits) بن گیا -

''پیسہ اخبار'' کے ساتھ ساتھ آپ نے گوجرانوالہ سے ایک ماہنامہ 'زمیندار و باغبان و بیطار'' جاری کیا جو ڈسٹرکٹ بورڈوں میں بے حد مقبول ہوا ۔ اسی رسالے نے بعد میں مولوی ظفرعلی خاں کے والد منشی سراج الدین احمد کو روزنامہ ''زمیندار'' جاری کرنے کی ترغیب دی جس کے نام پر کچھ عرصہ دونوں میں جھگڑا بھی چلا مگر دوستوں نے بیچ میں پڑ کر صلح صفائی کرا دی ۔

۱۸۸۹ع میں اس خیال سے کہ لاہور میں اخبار گوجرانوالہ سے زیادہ ترقی کر سکتا ہے ، مولوی محبوب عالم پھر لاہور چلے آئے اور لاہور ہی کو مستقل وطن بنا لیا ۔ یہیں کاروبار کو ترقی دی اور وفات کے بعد بھی اسی جگہ دفن ہوئے ۔

جب تک مولوی محبوب عالم گوجرانوالہ میں تھے، آپ کانگرس کے زبردست حامی تھے ۔ لاہور آ کر بھی آپ کچھ عرصہ اسی حکمت عملی پر قائم رہے مگر جب آپ نے دیکھا کہ کانگرس میں ہندوؤں کا غلبہ ہے اور مسلمانوں کے حقوق ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں ، تو آپ نے کانگرس کے مقاصد سے قطع تعلق کر کے مسلمانوں کی ترجمانی و حمایت شروع کر دی ۔ پھر بھی آپ کی معتدل اور مرنجان مرنج پالیسی کی وجہ سے سارا پریس آپ کا احترام کرتا تھا اور آپ ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں ہردلعزیز تھے۔ البتہ کبھی کبھی معاصرانہ چشمک کی وجہ سے تلخی سی ہو جاتی تھی مگر یہ عارضی ہوتی تھی جو آناً فاناً پیدا ہوتی اور چشم زدن میں مٹ جاتی ۔

۱۶ مارچ ۱۸۹۸ع سے مولوی صاحب نے ہفتہ وار ''پیسہ اخبار'' کا ایک روزانہ ایڈیشن جاری کیا ، جس نے بہت سے ملکی اور قومی

معاملات پر روشنی ڈالی۔ مگر لوگ چونکہ اس وقت روزانہ اخبار کی قدر و قیمت سے واقف نہ تھے اس لیے ۲ مئی ۱۸۹۹ء کو روزانہ ایڈیشن بند کر دیا گیا۔

۱۹۰۴ء میں آپ نے پھر روزانہ ''پیسہ اخبار'' کا سلسلہ شروع کیا۔ اس مرتبہ اخبار بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۰۷ء کے پُرآشوب زمانے میں جب سودیشی اور سوراج کی تحریک بڑے زوروں پر تھی، ''پیسہ اخبار'' نے اپنی سلامت روی اور مستقل مزاجی سے مسلمانوں کو جادۂ اعتدال سے ہٹنے نہ دیا۔ آخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ''پیسہ اخبار'' کی اشاعت اتنی بڑھ گئی کہ بارہ دستی پریس بھی بمشکل وقت پر چھاپ سکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ولایت سے چھاپے کی مشینیں منگوائیں اور پریس کو خادم التعلیم اسٹیم پریس بنا دیا۔

''پیسہ اخبار'' ہی کے ذریعے ہمیں یہ بات پہلی مرتبہ معلوم ہوئی کہ ۱۹۰۱ء میں اقبال نے ای۔ اے۔ سی کے امتحان میں شرکت کا ارادہ کیا مگر عین امتحان سے ایک روز قبل طبی معائنے کے وقت غالباً ضعفِ بینائی کی بنا پر ڈاکٹروں نے آپ کا نام فہرستِ امیدواران سے خارج کر دیا۔ اس پر ستمبر ۱۹۰۱ء کی کسی اشاعت میں ''پیسہ اخبار'' اور اکتوبر ۱۹۰۱ء کے ''کشمیری گزٹ'' میں منشی محمد الدین فوق نے میڈیکل بورڈ کے خلاف نہایت زوردار مضامین لکھے جن کے اقتباسات حسبِ ذیل ہیں:

پنجاب کے امتحانِ مقابلہ میں ایک کشمیری مسلمان

''بزرگانِ قوم سے مخفی نہیں کہ قوم میں کیسے کیسے لائق

اور ہونہار نوجوان موجود ہیں جن سے قوم کو فخرِ قوم ہونے کی توقع اور امید ہے۔ منجملہ اور بہت سے نوجوانوں کے اس وقت شیخ محمد اقبال ایم۔اے، جو اپنی بے نظیر لیاقتوں کے باعث چند ہی دنوں میں بہت شہرت حاصل کر چکے ہیں، پنجاب کے امتحانِ مقابلہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر میں شامل ہوئے تھے۔ اس مقابلے کے امتحان میں وہ چیز جس سے باوجود دل سوزی، قابلیت اور علمیت کے ناکامی کا نہایت ہی خطرہ ہوتا ہے، یہ ہے کہ امتحان سے ایک روز قبل میڈیکل بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے امیدواروں کی صحت کا معائنہ کرتا ہے اور جس کی صحت میں اسے شک ہوتا ہے، اسے امتحان کے ناقابل قرار دے کر امیدواروں کی فہرست سے خارج کر دیتا ہے۔ امسال بھی دو امیدوار، ایک ہندو اور ایک مسلمان (محمد اقبال صاحب ایم۔اے) اسی طبی معائنے کی نذر ہوئے ہیں۔

''معزز ہمعصر 'پیسہ اخبار' سچ اور بہت سچ لکھتا ہے اور میری رائے میں ہمعصر کی یہ قابلِ وقعت رائے اس قابل ہے کہ پنجاب کے تمام اخبار اس کی تقلید کر کے پُر زور مضامین لکھیں۔''

ہمعصر ''پیسہ اخبار'' کی رائے ذیل میں درج کی جاتی ہے:

''پنجاب کے امتحانِ مقابلہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امیدواروں کی مصیبتوں میں یہ سب سے بھاری اور دردناک ہے کہ امتحان سے ایک روز پہلے میڈیکل بورڈ امتحان میں

شریک ہونے والے امیدواروں کی صحت کا معائنہ کرتا ہے۔ اور جس کی صحت میں اسے شک ہوتا ہے ، اسے ناقابلِ امتحان قرار دے کر نکال دیتا ہے ۔ اس ہفتہ میں جو امیدوار طبی لحاظ سے خارج کیے گئے ہیں ، ان میں سے ایک شیخ محمد اقبال ایم۔اے بھی ہیں ۔ ان کی صحت ایسی اچھی ہے کہ جس میں کوئی نقص نظر نہیں آتا ، لیکن ڈاکٹروں کے فیصلے کے سامنے جھکنا پڑتا ہے ۔ بجائے اس کے کہ امتحان کی تیاری کر لینے کے بعد ان کا ڈاکٹری امتحان لیا جائے ، نہایت بہتر ہو کہ امتحان کی تیاری کرنے سے پہلے ایسے امیدواروں کی جسمانی صحت کا امتحان کر کے انھیں خارج کر دیا جائے ۔ موجودہ صورت میں ، جب کہ وہ امتحان کے لیے محنتِ شاقہ اور صرفِ کثیر اٹھا کر تیاری کر لیتے ہیں ، انھیں آخری وقت میں جواب ملنا کس قدر روحانی تکلیف کا باعث ہوگا ؟"[1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اسی ناکامی کے بعد اقبال کے دل میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ترقی کرنے کا خیال پیدا ہوا اور آپ اللہ کا نام لے کر اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی کفالت پر ۲ ستمبر ۱۹۰۵ع کو عازمِ انگلستان ہوئے جہاں سے پی ایچ ۔ ڈی اور بیرسٹری کی سند لے کر واپس آئے ۔

۱۹۱۰ع میں ایک عجیب لطیفہ ہوا ۔ شیخ یعقوب علی تراب کے

۱۔ کشمیری گزٹ ، ماہ اکتوبر ۱۹۰۱ع ۔

اخبار ''الحکم'' قادیان مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۱۰ء میں ایک خبر چھپی کہ آپ کی نواسی کا نکاح بعد از نماز مغرب پانچ سو روپیہ حق مہر پر ڈاکٹر محمد اقبال سے ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس بیسیوں خطوط استفسار کے آئے اور کئی دوستوں نے زبانی بھی شکایت کی کہ ہمیں اس موقع پر کیوں یاد نہ کیا؟ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب پہلے ہی قادیانی (احمدی) ہو چکے تھے، اس لیے اس خبر کو صحیح تسلیم کرنے کے وجوہ موجود تھے۔ خود اقبال پر بھی ڈورے ڈالے جا چکے تھے جس کے ثبوت میں ایک منظوم خط بھی ملتا ہے جو ''پیغامِ بیعت کے جواب میں'' کے عنوان سے مئی ۱۹۰۲ء کے ''مخزن'' اور ۱۱ جون ۱۹۰۲ء کے اخبار ''پنجۂ فولاد'' لاہور میں شائع ہوا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

خضر سے چھپ کے مر رہا ہوں میں
تشنہ کامِ مئے فنا ہوں میں

ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل
خامشی پر مٹا ہوا ہوں میں

کانپ اٹھتا ہوں ذکرِ مرہم پر
وہ دلِ درد آشنا ہوں میں

تنکے چن چن کے باغِ الفت کے
آشیانہ بنا رہا ہوں میں

گلِ پژمردۂ چمن ہوں مگر
رونقِ خانۂ صبا ہوں میں

کارواں سے نکل گیا آگے
مثلِ آوازۂ درا ہوں میں

دستِ واعظ سے آج بن کے نماز
کس ادا سے قضا ہوا ہوں میں

مجھ سے بیزار ہے دلِ زاہد
دیدۂ حور کی حیا ہوں میں

ہے زبانِ مائلِ ترانۂ شوق
سننے والے کو دیکھتا ہوں میں

میں نے مانا کہ بے عمل ہوں مگر
رمزِ وحدت سے آشنا ہوں میں

پردۂ سیم میں رہے کوئی
اس بھلاوے کو جانتا ہوں میں

سب کسی کا کرم ہے یہ ورنہ
کیا مرا شوق اور کیا ہوں میں

میں کسی کو بُرا کہوں توبہ!
ساری دنیا سے خود برا ہوں میں

جام ٹوٹا ہوا ہوں میں لیکن
مئے حق سے بھرا ہوا ہوں میں

ایک دانے پہ ہے نظر تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں

تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں

بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اُس عبادت کو کیا سراہوں میں

بت پرستی تو ایک مذہب ہے
کفر غفلت کو جانتا ہوں میں

مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں

میرے رونے پہ ہنس رہا ہے تُو
تیرے ہنسنے کو رو رہا ہوں میں

اس خط کے چالیس شعر تھے ۔ اقبال نے نظر ثانی میں ستائیس حذف کر دیے ۔ ''بانگِ درا'' میں صرف تیرہ باقی رکھے اور عنوان بھی بدل کر ''عقل و دل'' کر دیا ۔ اس نظم کو ہفت روزہ ''الحکم'' قادیان نے اپنی ۱۰ ، ۱۷ اور ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ع کی اشاعت میں نقل کرنے کے بعد اسی پرچے میں مرزا صاحب کے ایک مخلص مرید میر حامد سیالکوٹی کی طرف سے اس کا مندرجہ ذیل جواب بھی شائع کیا ۔ میر صاحب اقبال کے ہم محلہ ، دوست اور مولوی میر حسن شاہ صاحب کے عزیزوں میں سے تھے ۔ ہو سکتا ہے کہ اس قرب کی وجہ سے اُنھوں نے ہی اقبال کو مرزا صاحب کی بیعت کے لیے لکھا ہو اور اقبال کے جواب سے انھیں دکھ پہنچا ہو ۔ ان کے اشعار میں اسی صدمے کا رنگ جھلکتا ہے :

جانبِ حق سے حق نما ہوں میں
آ مرے پاس ، با خدا ہوں میں

خضر کی اب تلاش ہے بے سود
تشنہ کاموں کی اب پنا ہوں میں

زندگی بخش جام ہے میرا
ہے بقا جس میں وہ فنا ہوں میں

اے مقامِ فنا کے دل دادہ
مجھ میں آ ، منزلِ بقا ہوں میں

ہم کلامی میں لطفِ صحبت ہے
یار کی بات سن رہا ہوں میں

عاشقِ زار کے لیے سن لو
خامشی کہتی ہے بلا ہوں میں

جس سے بڑھ جائے اور لذتِ درد
زخم خوردہ ، وہی دوا ہوں میں

باغِ اُلفت کا وہ شجر میں ہوں
آشیانہ بنا کھڑا ہوں میں

مجھ سے رونق ہے باغِ احمد کی
گل کھلے جس سے وہ صبا ہوں میں

کارواں سے جدا ہو جو رہ رو
اس کو بڑھ کر پکارتا ہوں میں

بھولے بھٹکوں کو کارواں کی خبر
دے ، وہ آوازۂ درا ہوں میں

جس ادا سے نہ ہو نماز قضا
ہاں سکھاتا وہی ادا ہوں میں

دیدۂ حور کی حیا ایمان
ایسے سومن بنا رہا ہوں میں
طور کا وہ ترانہ ازلی
قادیاں میں سنا رہا ہوں میں
بے عمل قول ، قولِ بے جاں ہے
با عمل ہو کے کہہ رہا ہوں میں
میرے مولا کے ہیں نشاں مجھ میں
فضلِ مولا کی اک ندا ہوں میں
مجھ کو نسبت ہے ذاتِ واحد سے
سرِ وحدت سکھا رہا ہوں میں
مجھ کو بخشا گیا ہے صدقِ مقال
وہ بلائے تو بولتا ہوں میں
واقعی میں ہوں موردِ اکرام
آ مرے پاس ، دیکھ کیا ہوں میں
ایسی رندانہ توبہ سے حاصل
ایسے انداز جانتا ہوں میں
نری شعروں میں ہے یہ لفاظی
قولِ زور اس کو جانتا ہوں میں
سچ ہے لِیَہ فی قلوبہم مرض
اس یقیں سے بھرا ہوا ہوں میں
کبرَ مقتاً ہے خوف کا یہ مقام
جس سے اس وقت ڈانٹتا ہوں میں

بے شعوری کی زندگی غافل
باشعوری میں دیکھتا ہوں میں

آبِ انگور میں جو ڈوبے ہیں
ان کو ہر وقت تاڑتا ہوں میں

ٹوٹ جائیں خدا کرے یہ جام
یہ دعا حق سے مانگتا ہوں میں

حوضِ کوثر پہ ہوں ، مئے حق کے
جام بھر بھر پلا رہا ہوں میں

ہے مرے پاس دانۂ ایماں
ہر زمیں میں اگا رہا ہوں میں

ایسے دانے سے دیکھ دانا دل
کتنے خرمن بنا رہا ہوں میں

یار سے وصل جس سے ہو جائے
راہ سیدھی نکالتا ہوں میں

میں نہ ہوں غیر سے جدا کیونکر
یار کا وصل چاہتا ہوں میں

جس عبادت میں ہووے شرکتِ غیر
اس عبادت کو کیا سراہوں میں

بھائی چھوڑے نہ جب کہ الفتِ غیر
کب تلک اس سے پھر نباہوں میں

میں تو ہوں کل زمانے کا مصلح
اللہ اللہ بگاڑ چاہوں میں ؟

کفر غفلت سے مجھ کو کیا نسبت
تیری غفلت کو جانتا ہوں میں

میرا مذہب تو حق پرستی ہے
بت پرستی سے بھاگتا ہوں میں

میرا کعبہ بتوں سے صاف کیا
ماحیِ شرک پر فدا ہوں میں

مرگِ اغیارِ یار کے ہے لیے
یار چاہے تو کیوں نہ چاہوں میں

تجھ سے جاتی رہی ہے غیرتِ دیں
تجھ پہ آنسو بہا رہا ہوں میں

کفر کی موت پر قلق ہو تجھے
العجب! اس پہ ہنس رہا ہوں میں

عقدۂ عقل و دل کو مجھ سے پوچھ
اس کا حق سے گرہ کشا ہوں میں

گنجِ اسرار جس کا سینہ ہے
اس کا اب روپ بن گیا ہوں میں

احمدِ مجتبٰیؐ کا ہوں میں غلام
لطفِ احمد سے مجتبٰی ہوں میں

وحیِ قرآن پاک کی رُو سے
عقل اور دل کو جانچتا ہوں میں

ایسی عقلوں کا اعتبار ہی کیا
جن کو گمراہ دیکھتا ہوں میں

حق کا شاہد تمہیں خدا کا کلام
ژاژخا ان کو جانتا ہوں میں
مجھ کو بخشا گیا ہے پاک ادراک
وارثِ علمِ انبیاء ہوں میں
عقل ہے بے رفیق و درماندہ
وحیِ حق کا سخن سرا ہوں میں
عقل کی کیا مجال ہے اس کے
یہ کہے اس قدر رسا ہوں میں
دیدِ حق ہو نہ جس میں علم وہ کیا
ایسے علموں کو کیا سراہوں میں
چشمۂ علمِ پاک ہے قرآں
وہ ہدیٰ، تابعِ ہدیٰ ہوں میں
عقل کو جو کہ روشنی بخشے
اس کا دعویٰ ہے وہ ضیا ہوں میں
عقل بھولے تو رہنما ہے وہ
اس سے اس وقت آشنا ہوں میں
اس سے جو فیض یاب ہوں آ کر
ایسی عقلوں کو ڈھونڈتا ہوں میں
ہوں مفسّرِ علومِ قرآں کا
مہبطِ وحیِ کبریا ہوں میں
رہبری راہِ حق کی ہو جس سے
ہاں وہ مردِ خجستہ پا ہوں میں

مجھ کو کیا غم ، کرے کوئی تحقیر
مظہرِ شانِ ذوالعالیٰ ہوں میں

قطرۂ خون دل کو گرم کرے
رازِ ہستی کو پا گیا ہوں میں

جس کی دل کو تلاش رہتی ہے
اس کو آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں

رحمتِ عالمین تھا جو دم
پھر اسی دم کو دیکھتا ہوں میں

جس اندھیرے سے دل ہوئے تاریک
اُس اندھیرے کی چاندنا ہوں میں

جن مظاہر سے نورِ حق ہو پدید
ان کے باطن کو دیکھتا ہوں میں

علم حق سے ہے ، معرفت حق سے
وہ خدا ُجو ، خدا نما ہوں میں

علم ، جس کی ہے انتہا راحت
اب وہی علم دے رہا ہوں میں

جس کو حق نے کہا سراجِ منیر
بزم کا اُس کی اک دیا ہوں میں

دلِ احمدؐ ہے عرشِ ربِ جلیل
عشق میں اس کے بس فنا ہوں میں

گلشنِ احمدی کی مجھ سے بہار
اس کی کشتی کا ناخدا ہوں میں

میں زمان و مکاں سے ہوں آزاد
اس کے دامن سے بندھ گیا ہوں میں

جب کھلے گی تجھے حقیقتِ دل
خود کو سمجھے گا دہریا ہوں میں

میرا دل دیکھ ، اہلِ دل ہوں میں
حق سے اب خادم الوریٰ ہوں میں

ذوالفقارِ علی ہے میرا قلم
دیکھ اب شاہِ لافتیٰ ہوں میں

میرا پابوس کیوں نہ ہو اقبال
حامد نائبِ خدا ہوں میں[۱]

یہ باتیں ابھی لوگوں کے حافظے میں محفوظ تھیں - بہرحال چونکہ ڈاکٹر صاحب شادی شدہ بلکہ صاحبِ اولاد تھے ، اس لیے ان کے بعض رشتہ داروں کو تعجب بھی ہوا اور سخت صدمہ بھی پہنچا کہ ایک تو انھوں نے پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسرا نکاح کر لیا (گو اس سے تعلقات اچھے نہ تھے) ، پھر قادیان جا کر قادیانیوں سے رشتہ ناطہ جوڑ لیا ، جن کے عقائد کو ماننے سے وہ انکار کر چکے تھے - آخر ڈاکٹر صاحب کو اس خبر کی تردید چھپوانا پڑی - چنانچہ آپ نے ۱۰ ستمبر ۱۹۱۰ع کو ایک دستی چٹھی لکھی جو ۱۵ ستمبر کے روزنامہ "پیسہ اخبار" میں اس عنوان سے چھپی :

"وہ ڈاکٹر محمد اقبال اور ہوں گے -"

۱- "الحکم" ، قادیان ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ع -

اس میں اقبال نے لکھا :

''مخدوم و مکرم جناب ایڈیٹر صاحب ''پیسہ اخبار'' !

السلام علیکم - مہربانی کر کے مندرجہ ذیل سطور اپنے اخبار میں درج فرما کر مجھے ممنون و مشکور فرمائیں :

اخبار ''الحکم'' قادیان مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۱۰ع کے صفحہ ۱۳ پر مندرجہ ذیل خبر درج ہے :

''بعد نمازِ عصر آپ کی نواسی کا نکاح ہونے والا تھا مگر مفتی فضل الرحمٰن صاحب کی وقتی غیر حاضری کی وجہ سے بعد نماز مغرب پانچ سو روپیہ مہر پر ڈاکٹر محمد اقبال سے ہوا -''

اس عبارت سے میرے اکثر احباب کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے مجھ سے زبانی اور بذریعہ خطوط استفسار کیا ہے - سب حضرات کی آگاہی کے لیے بذریعہ آپ کے اخبار کے اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں ہے - جن ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کا ذکر ایڈیٹر صاحب ''الحکم'' نے کیا ہے وہ کوئی اور صاحب ہوں گے - والسلام ۱۰ ستمبر ۱۹۱۰ع -[1]

آپ کا خادم

محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لاء لاہور''

۱- روزنامہ پیسہ اخبار ، لاہور ، بابت ۱۵ ستمبر ۱۹۱۰ع - نیز اس موضوع

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

مولوی محبوب عالم نے ۱۸۹۸ء میں ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار ''دی سن'' (The Sun) جاری کیا جو دو سال بعد لوگوں کی ناقدری کا شکار ہو کر بند ہوگیا۔

۱۸۹۸ء ہی میں مولوی صاحب نے ہفتہ وار ''انتخاب لاجواب'' جاری کیا جو قیامِ پاکستان تک اپنی نوعیت کا ایک ہی اخبار تھا۔ اس میں دلچسپ لطیفے، عجائباتِ عالم، شمار و اعداد، حکمت کے موتی، معلومات کا نچوڑ، سائنس کی ایجادات، نامور لوگوں کے باتصویر حالات اور دیگر صدہا قسم کے مفید مضامین شائع ہوتے تھے۔

مولوی محبوب عالم کو تعلیمِ نسواں کا بھی ابتدا ہی سے خیال تھا۔ اس خیال کو عملی صورت دینے کے لیے آپ نے ایک ماہوار رسالہ ''شریف بی بی'' لاہور سے جاری کیا جو ہندوستان میں اپنی طرز کا پہلا رسالہ تھا۔ ۱۸۹۵ء میں آپ نے ''پیسہ اخبار'' کا بھی ایک خاص نمبر شائع کیا جس میں جدت یہ تھی کہ تمام مضامین عورتوں کے لکھے ہوئے تھے۔ بعد میں یہ مضامین ''ہندوستانی عورتوں کے مضامین'' کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوتے رہے۔

مولوی صاحب نے تعلیمِ نسواں کی تبلیغ ہی نہیں کی بلکہ اس پر خود بھی عمل کیا۔ آپ کی سب سے بڑی صاحبزادی فاطمہ بیگم نے تعلیم حاصل کی اور منشی فاضل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے اعزاز

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

پر میرا تفصیلی مضمون ''اقبال اور محمد اقبال'' ۲۲ اپریل ۱۹۵۳ء کے ''امروز'' لاہور میں ملاحظہ فرمائیے۔

کے ساتھ پاس کیا ۔ آپ غالباً پہلی مسلمان خاتون تھیں جنھوں نے یہ کڑی منزل طے کی اور طبقۂ نسواں کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا ۔ فاطمہ بیگم نے کئی سال ہفتہ وار ''خاتون'' کی ادارت کی اور تحریکِ پاکستان میں بڑے جوش اور سرگرمی سے حصہ لیا ۔ انھوں نے نواں کوٹ لاہور میں مسلمان لڑکیوں کے لیے فاطمہ جناح کالج قائم کیا جسے سیاسی مصروفیتوں کے سبب آپ پورا وقت نہ دے سکیں اور اسے ایک ٹرسٹ کی صورت دے کر ملت کے حوالے کر دیا گیا ۔

مولوی صاحب کی دوسری لڑکی زینب نے فارسی میں ایم ۔ اے کیا ۔ یہ غالباً دوسری مسلمان خاتون تھی جس نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم ۔ اے کی ڈگری حاصل کی ۔

مئی ۱۹۰۰ع میں مولوی محبوب عالم پیرس کی نمائش دیکھنے ، سیر و سیاحت کا لطف اٹھانے اور اخبار نویسی کا مطالعہ کرنے کے لیے یورپ روانہ ہوئے ۔ ۲۵ مئی ۱۹۰۰ع کو جمعہ کے روز ساڑھے پانچ بجے شام اسلامیہ کالج لاہور کے وسیع صحن میں آپ کے دوستوں نے ایک شاندار الوداعی دعوت دی جس میں اقبال اور دیگر بزرگوں کے علاوہ مندرجہ ذیل اصحاب خاص طور پر شریک ہوئے :

''خان بہادر محمد برکت علی خاں سیکریٹری انجمن اسلامیہ و وائس پریزیڈنٹ میونسپل کمیٹی ، نواب شیخ غلام محبوب سبحانی رئیسِ لاہور ، سردار رضا علی خاں قزلباش ، خان بہادر ڈاکٹر سید امیر شاہ ، فقیر سید افتخار الدین میر منشی گورنمنٹ پنجاب ، میاں کریم بخش میونسپل کمشنر ، مولوی محمد فضل الدین رئیس و پلیڈر و میونسپل کمشنر ، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی صدر انجمنِ حمایتِ اسلام ،

حاجی میر شمس الدین جنرل سیکریٹری انجمنِ حمایتِ اسلام، شیخ عمر بخش بیرسٹر ایٹ لاء، خان صاحب ڈاکٹر مہتاب شاہ پروفیسر وٹرنری کالج، سیّد ولی شاہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، مرزا نوازش علی ریڈر چیف کورٹ، سیّد احمد شاہ تحصیلدار، چودھری نبی بخش وکیل، ماسٹر شیر محمد (میو سکول آف آرٹس)، مولوی حاکم علی پرنسپل اسلامیہ کالج اور سیّد خورشید انور وغیرہ۔"[1]

شیخ عبدالقادر اُن دنوں انگریزی اخبار "آبزرور" کے ایڈیٹر تھے۔ اِن کی مختصر سی تقریر کے بعد خان احمد حسین خان (مدیرِ 'شباب اُردو' لاہور) نے الوداعی نظم پڑھی اور مولوی محبوب عالم کی جوابی تقریر کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ مگر جب چند مخصوص احباب باقی رہ گئے تو اقبال نے مندرجہ ذیل نظم پڑھ کر سنائی جو ان کے اپنے کسی مجموعۂ کلام میں تو شامل نہیں، البتہ مولوی محبوب عالم کے سفرنامۂ یورپ میں طبع ہو چکی ہے:

لیجیے حاضر ہے مطلعِ رنگیں
جس پہ صدقے ہوں شاہدِ تحسیں

سوئے یورپ ہوئے وہ راہ سپر
مفت میں ہو گیا ستم ہم پر

آنکھ اپنی ہے اشکِ خونیں سے
غیرتِ کاسۂ مئے احمر

۱۔ سفرنامہ یورپ و بلاد روم و شام و مصر، نوشتۂ مولوی محبوب عالم، ص ۹۔

فتحِ ملکِ ہنر کو جاتے ہیں
ہم رکابی کو آ رہی ہے ظفر

"تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے"
کھینچ کر لے چلا ہے ذوقِ نظر

فخر انساں کا ہے تلاشِ کمال
جستجو چاہیے مثالِ قمر

خوب تاڑا ہے سیر کا موقع
نکتہ بیں چاہیے نگاہِ بشر

سیر دریا میں ہیں ہزار مزے
جس کو دکھلائے خالقِ اکبر

وہ سرِ شام بحر کی موجیں
منہہ کا وہ خرام پانی پر

وہ سمندر بساط کی صورت
اور وہ موجوں کا کھیلنا چوسر

اور وہ چاندنی کہ بحر جیسے
اوڑھ لیتا ہے صورتِ چادر

دی خبر آپ نے یہ کیا ناگاہ
چپکے چپکے چبھو دیا نشتر

دوستوں کا فراق قاتل ہے
درد اٹھتا ہے صورتِ محشر

آنکھ میں ہیں نہیں رواں لیکن
اشک اپنے ہیں مثلِ آبِ گہر

جائیے اور پھر کے آئیے گا
صورتِ بوئے نافۂ اذفر

اس طرح آنکھ راہ دیکھے گی
جوں مؤذن کو انتظارِ سحر

بزمِ یاراں رہے گی یوں خاموش
جیسے چپ چاپ شام کے ہوں شجر

سرِ مژگاں پہ آ گئے آنسو
نکل آیا جو دل میں تھا مضمر

مدحِ احباب فرضِ انساں ہے
لاؤں اس کے لیے میں خامۂ زر

یاں خموشی گناہ ہے ایسی
جس طرح کفر ہجوِ پیغمبر

یہ حضر آپ کو مبارک ہو
یہ سفر آپ کو مبارک ہو

آپ ہیں محوِ سیرِ دریائی
چشمِ احباب غم سے بھر آئی

رقص موجوں کا جا کے دیکھیں گے
بھیج دی ہے جہاز کو سائی

لطف اخبار کا جب آتا ہے
بزمِ یورپ سے ہو شناسائی

دمِ رخصت وہ گرم جوشی ہے
آتشِ عشق جس سے شرمائی

کسی کونے میں تاکتی ہے اسے
گرمیٔ آفتابِ جولائی
لب سے نکلا کہ ''فی امان اللہ''
فخر کرتا ہے تابِ گویائی
نشۂ دوستی چڑھا ایسا
شعر میں بھی ہے رنگِ صہبائی
آب آئینے پر گراتے ہیں
''بسلامت روی و باز آئی''
عزمِ پنجاب ہو مگر جلدی
کہ نہیں طاقتِ شکیبائی
ہو نہ محبوب سے جدا کوئی
اے رگِ جانِ عالم آرائی[1]
الغیاث اے معلمِ ثالث[2]
دردِ فرقت سے جان گھبرائی
ایسی پڑیا کوئی عنایت ہو
دل سے آٹھے کہ وہ شفا پائی
آ گیا بحر چپ رہو اقبال
خامہ کرتا ہے عذرِ بے پائی

۱- اس شعر میں ''محبوب عالم'' نام لایا گیا ہے۔

۲- معلمِ ثالث بوعلی سینا جو مشہور فلسفی اور طبیب تھے - یہاں ان کی طبابت کی طرف اشارہ ہے۔ معلمِ اول ارسطو اور معلمِ ثانی ابونصر فارابی ہیں۔

توبہ کر لی ہے شعر گوئی سے
اس کی قیمت پڑی نہ اک پائی

شعر سے بھاگتا ہوں میں کوسوں
ہے یہ توحید اور میں عیسائی

''آں چہ دانا کند، کند ناداں
لیک بعد از ہزار رسوائی''

دوستوں کی رہے دعا حافظ
ہو سفر میں ترا خدا حافظ

(سفرنامۂ یورپ، صفحات ۱۷ - ۱۸)

مولوی محبوب عالم اٹلی، آسٹریا، جرمنی، بلجیم، فرانس، انگلستان، روم و شام اور مصر کی سیاحت کے بعد دسمبر ۱۹۰۰ء میں واپس تشریف لائے۔ آپ اردو زبان کے پہلے اخبار نویس ہیں جنھوں نے یورپ کے اخباری تجربات حاصل کر کے نہ صرف اپنے کاروبار کو توسیع و ترقی دی بلکہ ملک اور قوم کو بھی اس سے معتدبہ فائدہ پہنچایا۔ آپ کے کاروبار کی وسعت دیکھ کر محکمۂ ڈاک نے ۱۹۰۰ء میں ''پیسہ اخبار'' کے نام سے آپ کو الگ ڈاکخانہ دیا جو تقسیمِ ملک تک موجود تھا۔ واپسی پر آپ نے ''سفرنامۂ یورپ'' لکھا جو ملک میں بہت مقبول ہوا اور اس پر آپ کو محکمۂ تعلیم کی طرف سے چار سو روپیہ انعام بھی ملا۔

ولایت سے آ کر ۱۹۰۲ء میں آپ نے بچوں کی دلچسپی اور مطالعے کے لیے ایک ماہوار ''بچوں کا اخبار'' جاری کیا جو بہت پسند کیا گیا۔ اور اس جدت پر ایک خاص انعام بھی انھیں ملا۔

مولوی محبوب عالم اخبار نویس ہونے کے ساتھ ساتھ سینکڑوں کتابوں کے ناشر اور کئی کتابوں کے مصنّف ، مؤلف اور مترجم بھی تھے - آپ آردو ، فارسی ، عربی اور انگریزی کے علاوہ فرانسیسی ، ترکی اور روسی زبان بھی جانتے تھے - جرمن زبان سے بھی تھوڑی بہت شُدبُد تھی - مطالعے کا بے حد شوق تھا - انگریزی کے اخبار اور رسالے اکثر دیکھتے رہتے تھے اور جہاں انھیں کوئی بات دلچسپی بڑھانے والی نظر آتی تھی اسے اپنے اخبار میں شائع کر دیتے تھے - آپ کے ذاتی کتب خانے میں اخلاق ، تاریخ ، مذہب اور علم و ادب کی ہزاروں کتابیں تھیں جن میں بعض بہت نایاب اور قیمتی تھیں - بعض ایسی بھی تھیں جو انھوں نے خاص ولایت سے منگوائی تھیں - یہ کتب خانہ ۲۵ جنوری ۱۹۱۴ع کی رات کو کارخانہ پیسہ اخبار میں آگ لگ جانے کی وجہ سے ضائع ہو گیا - مولوی صاحب ان دنوں ولایت کے سفر پر تھے - وہ ۳۰ جنوری کو اس سفر سے واپس آئے تو دل تھام کر رہ گئے - ان کو اس المناک حادثے کا بڑا صدمہ ہوا - آپ نے فرمایا کہ یہ میری چالیس سال کی محنت کا نچوڑ تھا - اب ان کتابوں کا فراہم ہونا مشکل ہے - مگر ان کا شوقِ مطالعہ اور استقلال قابلِ داد تھا کہ آپ نے ایک دفعہ پھر کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر لیا جو آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے حوالے کر دیا -

منشی صاحب موزوں طبع بھی تھے - اگرچہ شعر کہنے کی انھیں نہ فرصت تھی نہ ضرورت مگر یہ خدا داد جوہر جب کبھی ظاہر ہونا چاہتا ہے تو کسی کے روکے نہیں رکتا - ایک دفعہ ان کے ایک

شکاری دوست نے چار تلیر تحفے کے طور پر بھیجے۔ آپ نے شکریے میں چار شعر قلم برداشتہ لکھ دیے جن میں سے دو یہ ہیں :

چار تلیر جو آپ نے بھیجے
ان سے بندہ ہوا بہت محظوظ

اے شکاری تجھے خدا رکھے
جملہ آفات سے سدا محفوظ

"پیسہ اخبار" کا دفتر ہمیشہ اخبار نویسی سکھانے کا دبستان رہا ہے اور مولوی محبوب عالم کو عموماً ایڈیٹر گر کہا جاتا ہے۔ جس اردو اخبار کو متحدہ ہندوستان میں سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ہونے کا فخر حاصل تھا، یعنی روزنامہ "ہندوستان"، اس کے ایڈیٹر بابو دینا ناتھ حافظ آبادی اسی "پیسہ اخبار" میں ملازم رہ کر کام سیکھ چکے تھے۔ مرزا علی حسین جو اخبار "فتح المبین" اور اخبار "وقت" کے مالک و ایڈیٹر تھے وہ بھی فنِ اخبار نویسی یہیں سیکھتے رہے۔ مولوی عبدالرؤف صاحب رافت بھوپالی جو "زبدۃ الاخبار" (مملوکہ حکیم غلام نبی زبدۃ الحکماء لاہور) کے ایڈیٹر تھے، وہ بھی کئی سال تک اسی اخبار میں کام کرتے رہے تھے۔ منشی منور خاں ساغر اکبر آبادی، جن کے خوانِ کرم سے ہندو اخبارات نعمت ہائے گوناگوں حاصل کرتے رہے، سب سے پہلے "پیسہ اخبار" ہی میں فنِ اخبارنویسی سیکھتے رہے۔ منشی احمد دین بی۔ اے مالک و ایڈیٹر اخبار "غم خوار عالم" بھی "پیسہ اخبار" ہی میں برسوں کام کرنے کے بعد اپنا ذاتی اخبار نکالنے کے قابل ہوئے۔ مولوی محمد عبداللہ منہاس، جو اخبار "وکیل" امرتسر، اخبار "حمایت اسلام" لاہور، روزنامہ "شہباز" پشاور اور کئی دوسرے

اخباروں کو کامیابی سے چلاتے رہے، وہ بھی ابتدا میں ''پیسہ اخبار'' ہی میں تھے۔ میر جالب دہلوی مدیرِ ''ہمّت'' لکھنؤ، منشی محمد الدین فوق مدیر ''اخبار کشمیری'' لاہور، منشی محمد دین خلیق (جو عرصہ تک اخبار ''ریلوے اینڈ انجنیئرنگ نیوز'' انگریزی و آردو میں لاہور سے نکالتے رہے) ابتدائی مشق اسی اخبار کے دفتر میں کرتے رہے۔ منشی انبا پرشاد صوفی مراد آبادی جو اپنی پرجوش تحریروں کے باعث خاص طور پر مشہور تھے، عرصے تک ''پیسہ اخبار'' میں کام کرنے کے بعد اپنا اخبار ''جامع العلوم'' نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ شیخ یعقوب علی تراب ایڈیٹر ''الحکم'' قادیان کو بھی اسی اخبار کے دفتر میں آمد و رفت رکھنے سے اخبار نویسی کا چسکا پڑا تھا۔

''پیسہ اخبار'' خاص التزام کے ساتھ نہ صرف عربی اور انگریزی بلکہ ہندی، مرہٹی، گجراتی اور گورمکھی اخبارات و رسائل کے ترجمے اور بعض مستقل کارآمد مضامین بھی شائع کرتا تھا۔ کئی اخباروں کا گزارہ ہی ان ترجموں پر تھا۔ مولوی شجاع اللہ خاں مدیر ''ملت'' لاہور، سیّد ظہور احمد وحشی شاہجہان پوری، پروفیسر محمد عباس ایم۔ اے مصنّف کتاب ''مشاہیر نسواں''، جنھیں پنجاب یونیورسٹی کانووکیشن کے موقع پر چھ مختلف تمغے اور ایک سو روپے نقد انعام ملا تھا، وقتاً فوقتاً ''پیسہ اخبار'' میں مدیر و مترجم کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

آج کل اکثر اخبارات اشتہاروں سے لبریز ہوتے ہیں مگر ایک زمانہ تھا کہ تاجر پیشہ لوگ صرف ''پیسہ اخبار'' ہی کو اشتہارات کے لیے پسند کرتے تھے۔ ''پیسہ اخبار'' نے اشتہارات کی آمدنی سے معقول

فائدہ اٹھایا۔

مولوی محبوب عالم بڑے وسیع الاخلاق اور منکسرالمزاج بزرگ تھے۔ ان کا فیض عام تھا۔ وہ اعتدال پسند تھے۔ پُر جوش، سنسنی خیز اور تہلکہ مچا دینے والے مضامین سے آپ کو نفرت تھی۔ سرکار دربار میں ان کی عزت تھی۔ ۱۹۰۳ء کے دہلی دربار میں جو لارڈ کرزن وائسرائے و گورنر جنرل کے عہد میں منعقد ہوا تھا، آپ شاہی مہمانوں میں بلائے گئے۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کے دربار دہلی میں بھی (جس میں خود شہنشاہ جارج پنجم تشریف لائے تھے) آپ مدعو تھے۔

پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں مولوی محبوب عالم کو سرکاری مہمان کی حیثیت سے پنجاب پریس کا نمایندہ منتخب کر کے ہندوستان کے آٹھ مدیرانِ اخبار کے وفد کے ہمراہ، جس میں چار انگریز اور چار ہندوستانی تھے، عراق عرب کی سیاحت کو بھیجا گیا جہاں آپ نے بصرہ، عمارہ اور بغداد کے عام حالات اور جنگی تیاریوں کا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس سفر کے لیے آپ ۱۷ مارچ کو روانہ ہوئے اور مئی ۱۹۱۷ء کے وسط میں واپس آئے۔ اپنے مشاہدات آپ نے نہایت تفصیل سے اردو میں قلم بند کیے جو ''سفرنامۂ بغداد'' کی صورت میں شائع ہوئے۔ یہ سفرنامہ پہلی بار بصورتِ کتاب ۱۹۲۱ء میں طبع ہوا۔

۱۹۱۸ء کے آخر میں انگلستان کی وزارتِ معلومات کی دعوت پر مدیرانِ وفد کے ہمراہ آپ پنجاب کی طرف سے پھر انگلستان گئے۔ وہاں منجملہ دیگر اعزازات کے آپ کو حضور ملک معظم نے شرفِ باریابی عطا کیا۔ اس سفر سے آپ ۱۷ جنوری ۱۹۱۹ء کو لاہور واپس

آئے جہاں آپ کا شاندار استقبال ہوا ۔ استقبال کرنے والوں میں وکیل ، بیرسٹر ، رؤسا ، وائسیریگل کونسل کے ممبر اور اخبارات کے ایڈیٹر شامل تھے ۔

مولوی محبوب عالم کو سیر و سیاحت طبعاً پسند تھی ۔ چنانچہ جب آپ بوڑھے ہو کر دور دراز سفر کے قابل نہ رہے تو ہر سال کشمیر جایا کرتے تھے اور وہاں بھی کسی نہ کسی رنگ میں ملّت کی خدمت کرتے رہتے تھے ۔

اب ''پیسہ اخبار'' اور ''انتخابِ لاجواب'' دونوں بند ہو چکے ہیں ۔ البتہ ''پیسہ اخبار'' کی عالی شان عمارات اب تک اس کا نام زندہ رکھنے کو موجود ہیں اور انارکلی کے جس حصے میں یہ واقع ہیں ، اس کا نام بھی ''پیسہ اخبار اسٹریٹ'' ہی ہے ۔

مولوی صاحب کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو ہوا اور آپ لاہور کے قبرستان میانی صاحب میں دفن کیے گئے ۔ آپ کے جنازے میں سر میاں محمد شفیع ، سر فضل حسین اور علامہ اقبال بھی شریک تھے ۔ اقبال نے تعلقِ خاطر کی بنا پر حسبِ ذیل قطعۂ تاریخ کہا جو آپ کے سنگِ مزار پر کندہ ہے :

سحرگاہاں بگورستاں رسیدم
دراں گورے پُر از انوار دیدم
ز ہاتف سال تاریخش شنیدم
معلّٰی تربتِ محبوب عالم

۱۳۵۱ھ

☆ ☆ ☆

۱۹

نواب سر ذوالفقار علی خاں

(۱۹۳۳ء)

اقبال کے نہایت ہی گہرے ، بے تکلّف ، عزیز اور مخلص دوستوں میں نواب سرذوالفقار علی خاں کا درجہ بہت ممتاز تھا ۔ وہ دُبلے پتلے ، متین و سنجیدہ ، خوش اخلاق اور ہنر پرور رئیس تھے اور ثروت و امارت کے باوجود نہایت سلجھا ہوا علمی اور ادبی ذوق رکھتے تھے ۔ اقبال کے تعلقات ان سے حقیقی بھائیوں جیسے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی تھے ۔ اپنے قلم کے ذریعے اقبال کو شاعر اور مفکّر کی حیثیت سے سب سے پہلے جس نے انگریزی خوانوں کے سامنے پیش کیا اور ان کے ذہنی اور دماغی جوہر دنیا جہان میں آشکارا کیے ، وہ نواب صاحب ہی تھے ۔ ان کی کتاب A Voice from the East (مشرق سے ایک آواز) اقبالیات میں کلاسیک کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور اب تک جتنی کتابیں اقبال کے فکر و فن پر لکھی گئی ہیں ، ان میں کئی لحاظ سے منفرد ہے ۔

نواب صاحب مالیر کوٹلہ کے حکمران خاندان کے چشم و چراغ تھے جس کی بنیاد لودھی سلاطین نے رکھی تھی ۔ ولادت ۱۸۷۳ء میں ہوئی ۔ آپ کے والد نواب غلام محمد خاں ، جنھیں اپنی جاگیر میں فوجداری کے اختیارات بھی حاصل تھے ، آپ کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے ، اس لیے جاگیر کا انتظام کورٹ آف وارڈس کے سپرد رہا ۔ آپ کی ابتدائی تعلیم چیفس کالج لاہور میں ہوئی جہاں سے ڈپلوما حاصل کر کے آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ ایف ۔ اے کا امتحان پاس کرتے ہی ۱۸۹۷ء میں بغرضِ تعلیم یورپ چلے گئے ۔ کچھ عرصہ پیرس میں تعلیم حاصل کی ۔ پھر انگلستان جا کر کیمبرج میں داخلہ لے لیا ۔ قریباً تین سال یورپ میں تعلیم و تربیت پائی ۔ ۱۹۰۰ء میں وطن واپس آئے لیکن مالیر کوٹلہ کی بجائے لاہور میں مستقل سکونت اختیار کی ۔ آپ کی شادی نواب سر امیر الدین خاں والیِ لوہارو کی حقیقی بھانجی سے ہوئی جس سے اولاد بھی ہوئی ۔

نواب صاحب کو عوام کی خدمت کرنے اور ملک کے سیاسی اور اقتصادی امور میں دلچسپی لینے کے بے شمار مواقع ملے ۔ ہندو مسلم اتحاد کے آپ ہمیشہ خواہش مند رہے مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا ۔ آپ نے بمبئی کے مشہور سیاستدان اور ادیب مسٹر مالاباری کے انگریزی رسالے ''ایسٹ اینڈ ویسٹ'' میں کئی مضامین لکھے ۔ مسٹر مالا باری کے انتقال کے بعد ''ایسٹ اینڈ ویسٹ'' کی عنانِ ادارت عملاً سردار امراؤ سنگھ ِ گل ، سردار جوگندر سنگھ اور نواب ذوالفقار علی خاں ہی کے ہاتھوں میں رہی ، جس کی بدولت علمی اور سیاسی حلقوں میں آپ کا خاصا رسوخ ہو گیا ۔ اسی سلسلے میں آپ

کی ملاقات علامہ اقبال سے ہوئی جو ذوق و مشرب کی یگانگت کے باعث بعد میں گہری اور مخلصانہ دوستی کی صورت اختیار کر گئی ۔

غرض چند ہی برسوں میں نواب صاحب کے اخلاص و مروّت اور اعلیٰ خاندانی اخلاق نے لاہور کے کئی لوگوں کو آپ کا گرویدہ بنا دیا ۔ کوئینز روڈ پر آپ کا دولت خانہ ، جس کا نام اقبال نے ''زر افشاں'' رکھا تھا ، لاہور کی اعلیٰ سوسائٹی کا مجلسی مرکز تھا جہاں اکثر معززینِ شہر اور اعلیٰ سرکاری حکام ٹینس کھیلنے اور چائے پینے کے لیے مدعو کیے جاتے تھے ۔ ہندو ، مسلمان ، سکھ اور عیسائی سبھی سے آپ کے پُرخلوص تعلقات تھے ، جن میں ڈاکٹر اقبال کے علاوہ سر جوگندر سنگھ ، سردار امراؤ سنگھ گل اور مرزا جلال الدین بیرسٹر ایٹ لاء بہت نمایاں تھے ۔ چودھری محمد حسین بڈی بریس برانچ کی ملازمت سے پہلے نواب صاحب ہی سے وابستہ تھے اور نہ صرف پنجاب چیفس ایسوسی ایشن کے کاروبار میں نواب صاحب کا ہاتھ بٹاتے تھے بلکہ ان کے صاحب زادوں رشید علی خاں اور خورشید علی خاں کے اتالیق بھی تھے ۔ چودھری صاحب کا ربط و ضبط ڈاکٹر اقبال سے یہیں بڑھا جو بعد میں روز افزوں ہوتا گیا ۔ اقبال نے اپنی وصیت میں جن لوگوں کو اپنی جائداد کا متولی مقرر کیا تھا ، ان میں ایک چودھری صاحب بھی تھے جو اس اعتماد کے ہر طرح اہل ثابت ہوئے ۔

۱۹۰۹ء میں نواب صاحب امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور پھر تمام عمر مجالسِ آئین ساز کے رکن رہے ۔ آپ عرصے تک پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی

کے صدر رہے ۔ کئی سال تک انجمن حمایت اسلام لاہور کی صدارت کے فرائض انجام دے ۔ اٹھارہ بیس برس تک پنجاب چیفس ایسوسی ایشن کے آنریری سیکریٹری کے عہدے پر فائز رہے ۔

۱۹۱۰ء میں آپ ریاست پٹیالہ کے وزیرِ اعظم مقرر ہوئے اور قریباً تین سال وہاں رہے ۔ اسی زمانے میں سردار جوگندر سنگھ بھی آپ کے ساتھ پٹیالہ کے ہوم منسٹر تھے ۔

جدید اصلاحات نافذ ہونے پر ۱۹۲۰ء میں آپ مشرقی پنجاب کے حلقے سے کونسل آف سٹیٹ کے رکن منتخب ہوئے اور مسلمانوں کے مسلّمہ رہنما تسلیم کیے جانے لگے ۔ ۱۹۲۶ء میں کونسل آف سٹیٹ کی رکنیت چھوڑ کر آپ پنجاب کے مشرقی وسطی مسلم حلقے کی طرف سے لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ۔ دوسری بار اسمبلی کے انتخاب کے وقت آپ ولایت تشریف لے جا رہے تھے ، اس لیے مقابلے کے لیے کھڑے نہ ہوئے مگر حکومت نے آپ کو اس ایوانِ عالیہ کا ممبر نامزد کر دیا ۔ اسمبلی میں آپ مدت دراز تک مرکزی مسلم پارٹی کے صدر رہے ۔

۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کے ساتھ کام کرنے کے لیے جو سنٹرل کمیٹی مقرر ہوئی تھی اس میں بھی آپ شریک کیے گئے بلکہ اسی سلسلے میں آپ ۱۹۲۹ء میں لندن بھی تشریف لے گئے ۔

۱۹۳۱ء میں آپ انڈین فرنچائز کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے ۔ مسلم لیگ اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے آپ ہمیشہ سرگرم رکن رہے ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ لاہور میں آپ مجلس استقبالیہ کے صدر تھے ۔ ۱۹۳۰ء میں آپ ہندوستان کی طرف سے مجلسِ اقوام میں

ڈیلی گیٹ منتخب ہو کر تشریف لے گئے اور عرصے تک ہندوستانی وفد کی صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے -

ان گوناگوں سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کے باوصف نواب صاحب نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں سوانح عمری مہاراجہ رنجیت سنگھ اُردو میں اور شیر شاہ سوری انگریزی میں اب تک بڑے شوق اور قدر سے پڑھی جاتی ہیں اور کتبِ حوالہ کا کام دیتی ہیں - علامہ ڈاکٹر اقبال کے کمالاتِ شاعری پر آپ کی قابلِ قدر انگریزی کتاب ''اے وائس فرام دی ایسٹ'' (مشرق سے ایک آواز) اقبالیات میں اوّلین پیشکش کہی جا سکتی ہے - یہ کتاب ۱۹۲۲ع میں اشاعت پذیر ہوئی - اس سے پیشتر اگرچہ اقبال کے متعلق مضامین کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا مگر اردو یا انگریزی میں کوئی مستقل کتاب نہ لکھی گئی تھی - ''سرگزشتِ الفاظ'' کے مصنّف مولوی احمد دین کی اردو میں لکھی ہوئی کتاب کا پہلا ایڈیشن یقیناً ہراول ثابت ہوتا مگر اقبال کے نزدیک اس میں کلام کا انتخاب معیاری نہ تھا کیونکہ اقبال اس وقت تک ''بانگِ درا'' ترتیب نہ دے پائے تھے ، اس لیے یہ بازار میں لانے سے قبل تلف کر دیا گیا اور اس کا دوسرا ایڈیشن حکّ و ترمیم کے ساتھ ''بانگِ درا'' کی اشاعت کے بعد شائع ہوا - پروفیسر نکلسن کے انگریزی ترجمۂ ''اسرارِ خودی'' نے ، جو نواب صاحب کی کتاب کی اشاعت سے دو سال قبل ۱۹۲۰ع میں طبع ہوا تھا ، اقبال کو یورپ اور امریکہ میں روشناس تو کر دیا تھا مگر اس ترجمے پر انگریز نقادوں کے جو تبصرے شائع ہوئے ، ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اقبال کے پیغام کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے - چنانچہ اقبال کو خود

ایک طویل خط کے ذریعے پروفیسر نکلسن اور دوسرے لوگوں کو اپنا مطلب و مفہوم واضح کر کے ان کے شکوک و شبہات رفع کرنے پڑے ۔ مگر نواب صاحب کو اقبال سے جو تعلق خاطر اور قرب قریبی حاصل تھا اور افہام و تفہیم کے جو مواقع میسر تھے ، ان کے سبب وہ اقبال کے پیغام کی روح تک پہنچ گئے تھے ۔ ان کی کتاب نے انگریز مصنّفوں کی غلط فہمیاں دور کرنے اور اقبال کی آواز لوگوں تک پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا ۔

یہ کتاب اوّل تو اقبال کی زندگی میں لکھی گئی تھی اور پھر ایک ایسے شخص نے لکھی تھی جس کے ہاں اقبال کی اکثر نشست و برخاست رہتی تھی ۔ ظاہر ہے کہ نواب صاحب نے اس کام کو اقبال سے پوشیدہ نہ رکھا ہوگا بلکہ اغلب یہ ہے کہ انھوں نے بعض مسائل کی پیچیدگیوں کے حل اور بعض نکات کی لطافتوں کو سمجھنے میں اقبال سے مشورہ کیا ہوگا ، کیونکہ وہ بے تکلفی سے ایسا کر سکتے تھے ۔ وہ خود بھی دانشور اور باذوق آدمی تھے ، مشرق و مغرب کے علوم سے بہرۂ وافی رکھتے تھے ۔ وہ اقبال کے عہد آفریں شعری کارناموں سے حد درجہ متاثر تھے اور خوب سمجھتے تھے کہ اقبال کے حیات افروز کلام نے ملک و ملّت کی نوجوان نسل کو کس طرح بیدار کیا ہے ۔ انھوں نے کتاب کے ابتدائیہ ہی میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے :

> ”اگر ایران کو تختِ طاؤس پر فخر ہے اور تاجِ برطانیہ کوہِ نور پر ناز کر سکتا ہے تو اقبال یقیناً ملکِ سخن کے دربار کی زینت ہے ۔“

یہ کوئی جھوٹی تعلّی یا خیالی بات نہیں ، جو یونہی جذبات کی رَو میں بہہ کر کہہ دی گئی ہو بلکہ یہ اقبال کے کلام کے گہرے مطالعے کے بعد اُن تاثرات کا حقیقی عکس ہے جو شاعر نے مصنّف کے دل پر چھوڑے تھے -

اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اُردو ، فارسی کے جتنے اشعار زیرِ بحث آئے ہیں ، ان کا ترجمہ نواب صاحب کے ایما پر سردار امراؤ سنگھ شیرِ گل نے کیا ہے - وہ ایک منجھے ہوئے صحافی ، انگریزی زبان کے ایک مشہور رسالے کے ایڈیٹر اور اقبال کے نہایت مخلص دوست اور مدّاح تھے - ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے - ہر زبان کی اپنی خصوصیات ، اپنا مزاج ، اپنی تراکیب ، اپنے محاورے ، اپنا روزمرہ ، اپنی تشبیہات ، اپنے استعارے اپنی تلمیحات اور اپنے صنائع بدائع ہوتے ہیں ، جن سے پوری طرح لطف اندوز ہونا غیر زبان والوں کے بس کی بات نہیں ہوتی - یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ترجمہ کرنے والی چیز اقبال جیسے عظیم شاعر کی کوئی شعری تخلیق ہو ، جو حسین و لطیف جذبات ، جوش و سرمستی سے لبریز تخیّلات ، نازک افکار اور ولولہ انگیز پیغام کی حامل ہو اور مترنم بحور و قوافی میں لپٹی ہوئی ہو - سردار امراؤ سنگھ کا ان مشکلات سے کامیابی کے ساتھ گزر جانا واقعی قابلِ تعریف کارنامہ ہے - ان کے ترجمے نے کتاب کی قدر و قیمت کو چارچاند لگا دیے ہیں - ''مشرق کی یہ آواز'' آج بھی فضا میں گونج رہی ہے اور کانوں میں رس گھول رہی ہے -

سردار اُمراؤ سنگھ ہی نے برگساں سے پیرس میں علامہ اقبال

سے ملاقات کا انتظام کیا تھا اور علامہ کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا :

''اقبال کا کلام 'بھگوت گیتا' سے کم نہیں۔ اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ انسانی جماعت کی بقا اور ترقی کے لیے اس مذہبی فلسفے سے کام لینا چاہیے جس سے علیحدہ ہو کر اور جس کو نظرانداز کر کے سوسائٹی یکسر برباد اور تباہ ہو جاتی ہے۔ . . . اپنے دوست سر ذوالفقار کے مکان پر میں نے اقبال کو ایسی خوشگوار اور دلکش فضا میں اکثر لیٹے ہوئے دیکھا ہے جس کے محسوس کرنے کے لیے تخیّل کی ضرورت نہیں۔ ایسے لمحات میں ان کے نغمہ ہائے شیریں کے شروع ہونے سے پہلے گفتگو خودبخود بند ہو جایا کرتی تھی۔ ممکن ہے کہ بعض ایسے لوگ بھی ہوں جو ان کے ترانوں سے وجد میں نہ آتے ہوں لیکن میرے خیال میں کوئی ایسا فردِ بشر نہ ہوگا۔ وہاں تو یہ کیفیت ہوتی تھی کہ عالمِ بالا کی خالص اور چمکتی ہوئی شرابِ طہور کا مزہ آتا تھا اور پیا پے جام کی طلب ہوتی تھی۔''

(نقشِ اقبال ، صفحات ۷۵-۷۶ ، بحوالۂ کلیاتِ اقبال)

اقبال عام طور پر گھر سے کم ہی نکلتے تھے۔ ضرورت کے سوا زیادہ تر خانہ نشیں رہتے تھے لیکن نواب صاحب کے ہاں اکثر جایا کرتے تھے بلکہ بعض اوقات تو نواب صاحب خود ہی موٹر بھیج کر انہیں بلا لیتے تھے۔ پہروں نشست و برخاست رہتی تھی۔ افسوس کہ ان صحبتوں میں شریک ہونے والے ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت

ہوگئے ورنہ ان سے دریافت کیا جاتا کہ وہاں کس قسم کی باتیں ہوتی تھیں۔ حکمت کے کیسے کیسے انمول موتی رولے جاتے تھے اور کیسی کیسی گل افشانیوں میں وقت گزرتا تھا۔ ذیل کے ایک واقعے کو ان خوش گوار صحبتوں کی پرچھائیں ہی کہا جا سکتا ہے۔

نواب صاحب کی کوٹھی ''زر افشاں'' میں یوکلپٹس کے بہت سے درخت تھے، جن سے گوند نکلا کرتی تھی۔ نواب زادہ خورشید علی خاں کی عمر ان دنوں کوئی نو دس برس ہوگی۔ وہ دن بھر درختوں سے گوند کھرچ کھرچ کر ڈبوں میں بھرا کرتے تھے۔ یہی ان کا مرغوب کھیل تھا۔ نواب زادہ صاحب بیان کرتے تھے[1] کہ علامہ بہاری موٹرکار میں آتے اور اترتے ہی پیار سے مجھے بلاتے:

''چھوٹے میاں کیا کر رہے ہو؟''

میں کہتا ''گوند نکال رہا ہوں۔'' اقبال فرماتے:

''چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے''

میں کہتا ''بس آپ کی شاعری ایک ہی مصرع پر ختم ہوگئی؟'' فرماتے: ''ہاں بھئی! ابھی تو ایک ہی مصرع ہوا ہے۔'' میں روز یہی شکایت کرتا تھا کہ آپ کیسے شاعر ہیں، دوسرا مصرع ہی نہیں کہہ سکتے؟ ایک دن تشریف لائے تو فرمایا:

''لو چھوٹے میاں! آج ہم نے دوسرا مصرع بھی کہہ لیا:

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے
اور ہوگی ان کی شادی کسی نیک بخت سے''

۱- ذکر اقبال، صفحات ۲۶۵ - ۲۶۶ -

یہ چھوٹے میاں تو ۱۹۶۴ء میں انتقال کر گئے تھے ۔ بڑے نواب زادہ رشید علی خاں ۱۵ جولائی ۱۹۷۴ء کو دل کا دورہ پڑنے سے ۶۹ برس کی عمر میں اب فوت ہوئے ہیں ۔

علامہ اقبال نے ایک دفعہ فرمایا کہ میں عمر بھر کرائے کے مکانوں میں رہا ہوں ۔ "جاوید منزل" بھی جاوید کی ملکیت ہے ۔ میں جاوید کا کرایہ دار ہوں اور اس کو پچاس روپے ماہوار کرایہ دیتا ہوں ۔ ایک دفعہ سر ذوالفقار علی خاں نے مجھ سے کہا کہ اپنا مکان کیوں نہیں بنواتے ؟ میں نے کہا آپ جیسے سرمایہ داروں نے چار چار پانچ پانچ مکانوں پر قبضہ کر رکھا ہے ۔ ہم جیسوں کے حصے میں اپنا مکان کیسے آ سکتا ہے[1] ؟

علامہ اقبال جب کبھی انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کے لیے آتے تھے تو نواب سر ذوالفقار علی خاں کی موٹر ہی میں ان کے ہمراہ ان کو دیکھا جاتا تھا ۔ "بانگِ درا" کے یہ اشعار بھی شاید اسی موٹر کی یادگار ہیں :

کیسی پتے کی بات جگندر[2] نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش

ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرامِ ناز
مانندِ برق تیز ، مثالِ ہوا خموش

۱- ملفوظاتِ اقبال ، ص ۱۱۵ ۔
۲- سردار جوگندر سنگھ ۔

میں نے کہا، نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر
ہے جادۂ حیات میں ہر تیزپا خموش

ہے پا شکستہ شیوۂ فریاد سے جرس
نکہت کا کارواں ہے مثالِ صبا خموش

مینا مدام شورشِ قلقل سے پا بگل
لیکن مزاج جام خرام آشنا خموش

شاعر کے فکر کو پرِ پرواز خامشی
سرمایہ دار گرمئی آواز خامشی

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ نواب صاحب کی طبیعت شاید علیل تھی یا اور کوئی وجہ ہوگئی تھی کہ انھوں نے اجلاس میں آنے سے معذوری ظاہر کی ۔ اقبال نے بھی کہلا بھیجا کہ نواب صاحب کی عدم موجودگی میں نظم پڑھنے کا کوئی مزہ نہیں ۔ آخر اراکینِ انجمن کے اصرار سے مجبور ہو کر نواب صاحب اور ان کے ہمراہ علامہ اقبال جلسہ گاہ میں تشریف لائے ۔ یہ ۱۹۱٦ء کے سالانہ اجلاس کی بات ہے ۔ اقبال کے دوست منشی محمدالدین فوق مدیر "اخبار کشمیری" لاہور کے چچا منشی غلام محمد خادم بھی اس اجلاس میں موجود تھے ۔ انھوں نے حسبِ حال فی البدیہہ فرمایا :

اقبال و ذوالفقار کا ہو کیوں نہ احترام
تخت اور تاج دونوں انھی کے تو ہیں غلام
اقبال ذوالفقار سے آتا ہے ہاتھ میں
وابستہ ذوالفقار ہے اقبال سے مدام

۱۹۲۱ء میں نواب صاحب نے لدھیانہ میں مسافروں کے آرام و آسائش کی خاطر ایک سرائے بنوائی ۔ اس کا نام ''ذوالفقار گنج'' رکھا ۔ اقبال نے اس کی تاریخِ تعمیر کہی جو سرائے کے بڑے دروازے پر کندہ کرائی گئی ۔ میں نے تقسیمِ ملک سے پہلے اسے خود دیکھا تھا ۔ اب پتا نہیں اس عمارت کا کیا حشر ہوا ؟ خیر جو کچھ بھی ہو ، عمارت رہے یا نہ رہے ، البتہ اقبال کی کہی ہوئی تاریخ جریدۂ عالم پر ہمیشہ ثبت رہے گی اور اس عمارت کے ساتھ نواب صاحب کی فیاضی کی یاد تازہ کراتی رہے گی :

بانیِ ایں خوش بنا سر ذوالفقار
سالِ تعمیرش ز ہاتف خواستند

از فلک تاریخ چوں شبنم چکید
بر زمیں خلدِ بریں آراستند

۱۹۲۱ء

[یہاں ''آراستند'' میں الفِ ممدودہ کا ایک عدد محسوب ہوا ہے اور اقبال فارسی کی ہر تاریخ میں الفِ ممدودہ کا ایک ہی عدد لیتے تھے] ۔

اقبال کے حاسد ہمیشہ حکّام اعلیٰ کو اقبال سے بدظن کرتے رہتے تھے ۔ لیکن ان تمام فتنہ انگیزیوں کا سد باب نواب ذوالفقار علی خاں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح اقبال عدالتِ عالیہ کے جج یا

کوئی اور ایسے ہی اونچے عہدہ دار بن جائیں لیکن خدا جانے آخری عمر میں کیا پیچ پڑا کہ بعض خود غرض افراد کی در اندازیوں کی وجہ سے ان کے درمیان بھی بعض غلط فہمیاں حائل ہوگئیں ۔ یہاں تک کہ ان دنوں علامہ اقبال شملہ گئے تو خلافِ معمول نواب صاحب کے بجائے ملک فیروز خاں نون کے ہاں ٹھہرے حالانکہ اس سے قبل جب کبھی شملہ جاتے تھے تو نواب صاحب ہی کی کوٹھی ''نو بہار'' میں قیام فرمایا کرتے تھے ۔ میں نے بھی ۱۹۲۳ء میں حضرت علامہ کے نیاز پہلی مرتبہ شملہ کی اسی کوٹھی میں حاصل کیے تھے ۔ نواب صاحب کو علامہ کے شملہ آنے کا علم ہوا تو بہت روئے اور کہا کہ میرے اقبال کا کسی دوسری جگہ قیام کرنا میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا ۔

مرزا جلال الدین بیرسٹر ایٹ لاء نے ، جو ان دونوں کے مشترک دوست تھے، ان کے درمیان مصالحت کرانے کی سعی کی ۔ دونوں کو اپنی اپنی جگہ ہموار کیا اور ایک تاریخ مقرر کر کے چائے پر مدعو کرنے کا پروگرام بنایا لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس تاریخ سے قبل ہی نواب صاحب اچانک بیمار ہو گئے اور پیشتر اس کے کہ یہ دونوں دوست آپس میں بغل گیر ہوتے ، نواب صاحب ۲٦ مئی ۱۹۳۳ء کی صبح کو ڈیرہ دون میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ۔ نعش مالیر کوٹلہ لائی گئی ۔ حضرتِ علامہ اور مرزا جلال الدین دونوں کو اس مخلصِ دیرینہ کے یوں ناگوار حالات میں بچھڑ جانے پر شدید صدمہ ہوا ۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ کم از کم نواب صاحب کی نماز جنازہ میں تو شریک ہو جائیں اور آخری دیدار کر لیں ۔ چنانچہ دونوں موٹر میں

سوار ہو کر مارا مار مالیر کوٹلہ پہنچے لیکن میّت ان کے پہنچنے سے پہلے ہی سپردِ خاک کی جا چکی تھی۔ ناچار بادلِ حسرت زدہ فاتحہ پڑھ کر واپس آ گئے۔"[1]

☆ ☆ ☆

۱۔ ذکرِ اقبال، صفحات ۱۸۵ - ۱۸۶ - ملفوظاتِ اقبال، ص ۸۳ -

۲۰

اصغر گونڈوی

(۱۹۳۶ع)

مولانا اصغر حسین اصغر گونڈوی کے آبا و اجداد گورکھپور کے رہنے والے تھے ۔ لیکن ان کے والد منشی تفضّل حسین نے بسلسلۂ ملازمت گونڈہ میں سکونت اختیار کر لی تھی ۔ اصغر ۱۸۸۴ع میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی ۔ ذاتی مطالعے سے ادب اور فنِ شاعری میں دستگاہ حاصل کی ۔ خود ہی انگریزی کا مطالعہ کیا ۔ شاعری میں جلیل احمد بلگرامی اور امیراللہ تسلیم کی شاگردی اختیار کی ۔ اصغر نہایت متقی ، درویش صفت ، پُروقار اور صوفی منش بزرگ تھے ۔ کسبِ معاش کے لیے عینک سازی کا کام کرتے تھے ۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ ان کے کلام میں متانت اور سنجیدگی کا عنصر نمایاں ہوتا تھا ۔ نادر خیالات کی تلاش انھیں ہمیشہ رہتی ۔ ان کے اندازِ بیان میں شگفتگی اور رنگینی پائی جاتی تھی ۔

مولانا تاجور نجیب آبادی نے جب ایک ہندو ناشر عطر چند کپور کے اشتراک سے لاہور میں اردو مرکز قائم کیا تو مولانا اصغر

کو یہاں بلا لیا ۔ انھوں نے لاہور کی علم ریز فضا میں رہ کر کچھ عرصہ ادبی خدمات انجام دیں ۔ پھر ہندوستانی اکیڈمی کے رسالے کے مدیر مقرر ہو کر الہٰ آباد چلے گئے اور چند برس سر تیج بہادر سپرو اور سر سلیمان کی سرپرستی میں کام کیا ۔ وہیں ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو بعارضۂ فالج انتقال کیا ۔ ''نشاطِ روح'' اور ''سرودِ زندگی'' ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔ مولانا ابوالکلام آزاد ''نشاطِ روح'' کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ۲۸ جون ۱۹۳۴ء کو کلکتہ سے فرماتے ہیں :

''میری نگاہ نکتہ چینی میں کمی نہیں کرتی ۔ میں معیار کی پستی پر کسی طرح اپنے آپ کو راضی نہیں کر سکتا ۔ اہلِ فن کو مجھ سے خوش گمانی کی نہیں ، بدگمانی کی شکایت ہے ۔ تاہم میں محسوس کرتا ہوں کہ جس شاعر کے کلام میں حسبِ ذیل اشعار موجود ہوں ، اس کی شاعری کی وقعت بحث و اثبات کی محتاج نہیں ہو سکتی :

قہر ہے تھوڑی سی بھی غفلت طریقِ عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

پہلے ہستی کی جستجو ہے ضرور
پھر جو گم ہو تو جستجو نہ کرے

نہ یہ شیشہ ، نہ یہ ساغر ، نہ یہ پیمانہ بنے
جانِ میخانہ ، تری نرگسِ مستانہ بنے
کار فرما ہے فقط حسن کا نیرنگ کہاں
چاہے وہ شمع بنے ، چاہے وہ پروانہ بنے
رند جو ظرف اُٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں ، وہی میخانہ بنے
پرتوِ رُخ کے کرشمے تھے سرِ راہ گزر
ذرّے جو خاک سے اُٹھے وہ صنم خانہ بنے

رودادِ چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

قیدِ قفس میں طاقتِ پرواز اب کہاں
رعشہ سا کچھ ضرور ابھی بال و پر میں ہے

قلب پر اب تک تڑپتی ہے شعاعِ برقِ طور
خون کے قطروں میں اب تک رقصِ منصوری بھی ہے

بہائے درد و الم درد و غم کی لذت ہے
وہ ننگِ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لیے

پردۂ دھر کچھ نہیں ، اک ادائے شوخ ہے
خاک اٹھا کے ڈال دی دیدۂ امتیاز میں

شعاعِ مہر خود بےتاب ہے جذبِ محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

حل کر لیا مجاز و حقیقت کے راز کو
پائی ہے میں نے خواب میں تعبیر خواب کی"

مولانا ابوالکلام آزاد کے نزدیک اصغر کے دوسرے مجموعے یعنی "سرودِ زندگی" کا بھی یہی عالم ہے ۔ اصحابِ ذوق تسلیم کریں گے کہ یہ اشعار معیار میں ڈھلے ہوئے اور نقد و نظر سے بے پروا ہیں :

عالم پہ ہے اک سکونِ بےتاب
یا عکس ہے میری خامشی کا
ہاں سینہ گلوں کی طرح کر چاک
دے تم کے ثبوت زندگی کا

تو بہت سمجھا تو کہہ گزرا فریبِ رنگ و بُو
یہ چمن لیکن اسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے
گوشہ گوشہ علم و حکمت کا ہے سب دیکھا ہوا
یہ غنیمت ہے درِ میخانہ اب تک باز ہے

عام ہے وہ جلوہ لیکن اپنا اپنا طرز دید
میری آنکھیں بند ہیں اور چشمِ انجم باز ہے

کیوں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں
اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

تیری ہزار برتری ، تیری ہزار مصلحت !
میری ہراک شکست میں ، میرے ہراک قصور میں

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

آدمی نہیں سنتا ، آدمی کی باتوں کو
پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا
قطرۂ تنک مایہ بحرِ بےکراں ہے تو
اپنی ابتدا ہوکر ، اپنی انتہا ہو جا

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرۃً آزاد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں، وہیں صیّاد ہوتا ہے

یہ مجھ سے سن لے تو رازِ پنہاں، سلامتی خود ہے دشمنِ جاں
کہاں سے رہرو میں زندگی ہو کہ راہ جب پُرخطر نہیں ہے[1]

سر تیج بہادر سپرو فرماتے ہیں کہ:

''میرے نزدیک اعلیٰ درجے کی شاعری کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ کس طرح کے لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔ آج کل حیدرآباد، جامعۂ ملّیہ دہلی، لاہور اور علی گڑھ یونیورسٹی کا درجہ اعلیٰ اور سنجیدہ ادب کے لحاظ سے بہت ہی ممتاز ہے۔ حیدرآباد نے ''جدید شاعری'' میں جناب اصغر کا تذکرہ بہت شاندار طریقے سے کیا ہے۔ جامعہ ملّیہ نے اصغر کے سو شعروں کا انتخاب شائع کیا ہے۔ لاہور کے ادبی رسائل ان کا کلام ممتاز حیثیت سے شائع کرتے ہیں۔ علامہ سر اقبال نے اپنی پرائیویٹ چٹھیوں میں ان کے کلام کی تعریف کی ہے، اس میں ''جدّت و تاثر'' کے قائل ہیں اور اسے آردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ فرمایا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے ان کے کلام کو یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کیا ہے۔ بہرصورت ان تمام مقامات سے کسی نہ کسی صورت میں ان کی شاعری کا اعتراف کیا گیا ہے۔''

۱- سرودِ زندگی، صفحات ۱۷ - ۲٦ -

علامہ اقبال کے خط تو ہمیں دستیاب نہیں ہو سکے جن سے معلوم ہو سکتا کہ وہ اصغر کے کلام میں ''جدت و تاثر'' کے کس حد تک قائل تھے اورکس پہلو سے ان کے کلام کی تعریف کرتے تھے ، البتہ ڈاکٹر تاثیر مرحوم کے ایک مضمون ''اسماء الرجال اقبال'' کی مندرجہ ذیل سطور اس پر کچھ روشنی ڈالتی ہیں :

''ایک دن اصغر گونڈوی مجھے لے کر علامہ اقبال کی خدمت میں پہنچے ۔ اس سے قبل اصغر صاحب نے اپنا کلام نقل کروا کر مجھے علی گڑھ سے بھجوایا اور چاہا کہ میں اقبال سے اس کے متعلق رائے طلب کروں ۔ اسی اثنا میں اصغر ملازمت کے سلسلے میں لاہور آ گئے اور علامہ سے ملاقات ہوئی ۔ انھوں نے حضرت علامہ سے کہا کہ اپنی رائے لکھ دیجیے ۔ علامہ نے فرمایا کہ تاثیر صاحب جو لکھ دیں گے ، میں اس پر دستخط کردوں گا ۔ یہ ان کا خاص انداز تھا ۔ مدعا یہ تھا کہ ڈرافٹ کوئی تیار کر دے ، وہ کاٹ چھانٹ کر دستخط کر دیں گے ، اور یہ وہ جب کہتے تھے کہ رائے دینے میں باک نہ ہو ۔ مگر اصغر گونڈوی ناواقف تھے ، انھیں غلط فہمی ہو گئی ۔ سمجھے کہ علامہ اقبال نے ان کے کلام کو ذاتی توجہ کے قابل نہیں سمجھا ۔ یہ ایک طرح درست بھی تھا ۔ علامہ اقبال اصغر کو اچھا مشاق خوش گو سمجھتے تھے اور بس ، اور اصغر تھے بھی یہی ، مگر ان دنوں رشید احمد صدیقی اور علی گڑھ گروپ اصغر کو بہت اچھال رہے تھے ۔ اس لیے غالباً اصغر ذرا زیادہ حساس ہو گئے تھے ۔

مگر اصغر کی خودداری کا یہ پہلو مجھے بہت پسند آیا ۔ انھوں نے دوبارہ رائے طلب نہ کی ۔"[1]

"سرودِ زندگی" کے صفحہ ۱۲۳ و ۱۲۴ پر اصغر کی ایک فارسی غزل موجود ہے جس کے چند شعر حسبِ ذیل ہیں :

در حریمش امتیازِ ایں و آں بے سود بود
جانِ مشتاقاں بہ سیرِ بود و ہم نابود بود

ما بہر طرزے کہ می رفتیم ، شایانش نہ بود
او بہر رنگے کہ می آید ، ہماں مقصود بود

آرزو پیکر تراش و شوقِ من جاں آفرید
شب معاذ اللہ ہمیں مخلوقِ من معبود بود

من ہم از دیر و حرم صد بہرۂ می داشتم
لیک در میخانہ ہر راہے بمن مسدود بود

در حریمِ عشق ایں رمزِ حیات آموختند
بے زیاں سودے کہ من می خواستم بے سود بود

من نوائے خویش را آوردم از جائے دگر
در چمن ہنگامۂ محدود و نامحدود بود

اے کہ تو دریائے خوبی ، وائے توئی بحرِ وجود
لافِ منصوری کہ می زد قطرۂ بے بود بود

۱۔ "اسماء الرجال اقبال" از ڈاکٹر محمد دین تاثیر ، مندرجۂ ماہنامہ "کریسنٹ ، یادگار نمبر" ، فروری ۔ اپریل ۱۹۵۱ع ، صفحات ۱۵۴ ۔ ۱۵۶ ۔

شورشِ عشق و نوائے آتشیں حسنِ بُتاں
زندگی جائے کہ می دیدم ہموں موجود بُود
تو بہر شغلے کہ می باشد ہماں معبود تست
آں شکست و ریخت ہم بت خانۂ محمود بُود

اس غزل کے نیچے یہ شذرہ درج ہے:

"یہ غزل قیامِ لاہور کے زمانے (۱۹۲۷ع) میں لکھی گئی تھی۔ علامہ سر اقبالؒ نے اسے سن کر بہت پسند فرمایا اور خود بھی دو شعر اسی وقت موزوں کر کے دیے اور ہدایت فرمائی کہ انھیں بھی اپنی غزل کے ساتھ رکھنا۔"

چشمِ آدم آں سوی افلاک نورش ہم نہ یافت
از خیالِ مہر و مہ اندیشہ گرد آلود بُود
من درونِ سینۂ خود سومناتے ساختم
آستانِ کعبہ را دیدم جبیں فرسود بُود

اصغرگونڈوی کی منتخب کی ہوئی زمین میں علامہ نے دو شعر عطا کر کے اپنی پسندیدگی کا ثبوت دیا ہے اور ان کے کلام کو فروغ دے کر بلند تر کر دیا ہے۔

☆ ☆ ☆

۲۱

عبدالقوی فانی

(۱۹۳۶ء)

پروفیسر عبدالقوی فانی لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی اور فارسی کے استاد تھے ۔ وہ لکھنؤ کے مشہور محلہ منصور نگر میں رہتے اور اس دور کے اساتذہ کی طرح نہایت کریم النفس اور حلیم الطبع انسان تھے ۔ صوفیانہ خیالات سے انھیں خاص لگاؤ تھا ۔ ان کا رنگ گندمی اور بدن دوہرا تھا ۔ ڈاڑھی بالکل ایسی تھی جیسی ایڈورڈ ہفتم کی تصویروں میں نظر آتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ شوخ طلباء انھیں اسی لقب سے یاد کرتے تھے ۔ ان کے برادر بزرگ شمس العلماء ڈاکٹر عبدالغنی ایم ۔ اے ۔ ایم لٹ ناگپور یونیورسٹی میں شعبۂ السنۂ مشرقیہ کے صدر تھے ۔ ان کی کتاب ''لسان و ادبیاتِ فارسی — مغل دربار میں'' (بزبانِ انگریزی) تین جلدوں پر مشتمل ہے ۔

فانی صاحب نے نظام حیدر آباد کی شان میں چند قصیدے فارسی زبان میں کہے جن کے مجموعے کا نام انھوں نے ''گلزار عثمانی'' رکھا ۔ یہ سب قصیدے اساتذۂ سلف کی زمینوں میں ہیں ۔ ان قصائد پر مشاہیر

کی رائیں ایک الگ رسالے میں شائع ہوئی ہیں ۔ اس میں علامہ اقبال کی رائے یوں درج ہے :

''جناب والا ! مجھے آپ کے کلام کے مجموعے کی ایک کاپی مل گئی ، جس کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں ۔ میں نے اس کا سرسری مطالعہ کیا ہے اور میں نے قصیدوں کو بے حد پسند کیا ہے ، حالانکہ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس قسم کی شاعری پر پورا عبور حاصل نہیں ۔ ان دنوں میں ، جب کہ ہندوستان میں فارسی ادب پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی ، آپ کے قصیدے ایک زبردست کارنامہ اور قابلِ قدر کوشش ہے ۔[1]

آپ کا

محمد اقبال''

۱۹۳۶ع میں فانی صاحب پر فالج کا تیسرا حملہ ہوا اور وہ کم و بیش پانچ سات مہینے صاحبِ فراش رہنے کے بعد دارالبقا کو سدھارے ۔

☆ ☆ ☆

۱۔ انوارِ اقبال ، مرتبہ بشیر احمد ڈار ، صفحات ۱۵ - ۱۶ ۔

۲۲

سیّد راس مسعود

(۱۹۳۷ع)

سر سیّد احمد خاں کے پوتے اور جسٹس سیّد محمود کے بیٹے سر سیّد راس مسعود اپنے باپ اور دادا کی اعلیٰ صفات کا بڑا شگفتہ مجموعہ تھے ۔ بنیادی صفات تو بزرگوں کی تھیں ، شگفتگی کا عنصر آکسفورڈ کے ماحول اور جدید علوم کی آمیزش نے شامل کر دیا تھا۔ ذہانت ، طبّاعی ، بذلہ سنجی ، نکتہ رسی ، خودداری اور وجیہ شخصیت انھیں اپنے فاضل باپ جسٹس سیّد محمود سے ورثے میں ملی تھی ۔ حب الوطنی ، بلند نظری ، خلوصِ نیّت اور حصولِ مقصد کی سچی لگن ، نیز وسیع القلبی ، حق گوئی و حق شناسی ، برد باری اور خود اعتمادی کی صفاتِ عالیہ سرسیّد سے ان کو پہنچیں ۔ اس لحاظ سے ان میں باپ سے زیادہ دادا کی شخصیت کی چھاپ بہت نمایاں تھی ۔

بچپن سرسیّد کی آغوشِ شفقت میں گزرا ، لڑکپن میں سر تھیوڈور ماریسن اور ان کی شفیق بیگم کی نگرانی میں رہے ، جس نے ان

کی ذات میں مشرقی اور مغربی دونوں تہذیبوں کی روح سمو دی - ان سے ملنے والا ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ دونوں تہذیبوں کا پورا رنگ ان کی شخصیت میں بڑے متوازن انداز میں رچا ہوا ہے اور وہ اس کا ایک نادر نمونہ ہیں - انھوں نے کئی زبانیں سیکھیں - عربی ، فارسی ، انگریزی ، فرانسیسی اور اطالوی کے علاوہ مشرقی اور مغربی ادب کے وسیع مطالعے اور مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کے دوران میں مشاہدات کی گہرائی نے انھیں اپنے دور کی ایک اہم اور پُرکشش شخصیت بنا دیا تھا -

راس مسعود ۱۸۸۹ع میں بمقام علی گڑھ پیدا ہوئے - ۱۸۹۳ع میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ کے یادگار موقعے پر ان کی رسمِ تسمیہ خوانی ہوئی - چنانچہ مہمانوں کو دھوم دھام کی دعوت دینے کی بجائے اس خوشی میں سرسیّد نے پانچ سو روپے نقد کالج کو چندہ دیا - ان کی دیکھا دیکھی دوسرے مسلمانوں نے بھی گراں قدر عطیات کالج فنڈ میں عطا کیے -

رسمِ بسم اللہ کے بعد علی گڑھ کے مشہور حافظ بخشا سے قرآن مجید ناظرہ پڑھا اور اردو نوشت و خواند کی مشق کی - وقتاً فوقتاً سرسیّد خود بھی ان کے لکھنے پڑھنے کی نگرانی کرتے تھے - اس کے بعد وہ علی گڑھ کالجیئیٹ سکول میں داخل ہوئے - ۱۸۹۸ع میں سرسیّد کا انتقال ہو گیا ، مگر کالج کے پرنسپل سرتھیوڈور ماریسن کی نگرانی میں ان کی تعلیم جاری رہی - ۱۹۰۵ع میں میٹرک پاس کیا اور سرکاری وظیفے پر اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور نیو کالج آکسفوڈر سے ۱۹۱۰ع میں سندِ فضیلت (بی - اے آنرز کی ڈگری) حاصل کی -

لندن سے بیرسٹری کی سند لے کر ہندوستان واپس آئے اور غالباً ۱۹۱۲ء میں پٹنہ ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کی ۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ اس نے انھیں اس پیشے سے متنفّر کر دیا ۔ ایک مقدمے کی پیروی کر کے انھوں نے ایک شخص کو سزا دلوا دی مگر بعد میں انھیں احساس ہوا کہ وہ شخص بے گناہ تھا اور اسے سزا دلا کر انھوں نے اس کے اہل و عیال پر ظلم کیا ہے ۔ اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وکالت کا پیشہ بظاہر تو ایک معزّز پیشہ ہے ، لیکن کوئی شخص حساس ضمیر کے ساتھ اس پیشے میں کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ اس کے بعد جب کبھی لوگ وکالت کے پیشے کا ذکر ان کے سامنے کرتے تو وہ اسے ”دماغی بدکاری کا پیشہ“ کہا کرتے ۔

بیرسٹری چھوڑ کر وہ سرتھیوڈور ماریسن کے مشورے سے انڈین ایجوکیشنل سروس میں شامل ہوئے اور کالجیئیٹ اسکول پٹنہ کے پرنسپل مقرر کیے گئے ۔ ۱۹۱۵ء میں ان کا تقرر گورنمنٹ کالج کٹک میں تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے ہوا ۔ وہ کچھ عرصہ اس کالج کے وائس پرنسپل بھی رہے ۔

کٹک کالج کی ملازمت کو ابھی دو سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ نظامِ دکن کو محکمۂ تعلیم کی نظامت کے لیے ایک موزوں شخص کی ضرورت پیش آئی ۔ نظرِ انتخاب ان پر پڑی اور ۱۹۱۶ء کے اواخر میں ان کی خدمات حکومتِ ہند سے حیدر آباد کے لیے مستعار لے لی گئیں ۔ حیدر آباد میں نظامتِ تعلیمات پر نواب عماد الملک ، ڈاکٹر سراج الحسن اور الہا لطیفی جیسے قابل اور ماہرینِ تعلیم بزرگ

مامور رہ چکے تھے ۔ راس مسعود کی عمر اُس وقت صرف انتیس برس تھی جب وہ اس اہم عہدے پر فائز ہوئے ۔ ان کے بارہ سالہ دور نظامت میں ابتدائی اور تحتانیہ تعلیم کو جو وسعت ہوئی اور اعلیٰ تعلیم نے جو ترقی کی ، وہ حیدر آباد دکن کی تعلیمی تاریخ کا ایک زریں باب ہے ۔ چند سال کے عرصے ہی میں ہر قسم کے تعلیمی اداروں کی تعداد چوگنی ہو گئی ۔ ۱۹۱۵ع میں مدارس کی تعداد ۱۲۵۴ اور طلبہ کی تعداد ۹۳۲۸۹ تھی ، لیکن ۱۹۲۸ع میں جب وہ اس خدمت سے سبکدوش ہوئے تو مدارس کی تعداد ۴۱۸۸ اور طلبہ کی تعداد ۲۷۱۸۴۱ ہو چکی تھی ۔

حیدر آباد دکن میں ان کے دور نظامت کا ایک مہتم بالشان کارنامہ دارالترجمہ کا قیام اور جامعۂ عثمانیہ کی تاسیس ہے ۔ ۱۹۱۷ع کے آغاز میں خسروِ دکن نے جامعۂ عثمانیہ کے قیام کا فرمان صادر کیا ۔ اسی سال جامعۂ عثمانیہ کا دارالترجمہ بھی قائم ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فارسی اور عربی ، انگریزی کی مشہور اور مستند تصانیف کی ایک کثیر تعداد اُردو میں منتقل ہوگئی ۔ جامعہ عثمانیہ کا باقاعدہ افتتاح ۲۸ اگست ۱۹۱۹ع کو ہوا ۔ اور جب تک کسی مستقل صدرِ جامعہ کا تقرر عمل میں نہ آیا ، سر راس مسعود ہی اپنی مستقل ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ جامعہ کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ۔ ۱۹۲۰ع میں جب نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر برطانوی ہند میں چند ماہ کے لیے اپنی خدمت پر واپس گئے تو ان کی جگہ نواب مسعود جنگ (راس مسعود) کا منصرمانہ تقرر معتمدی تعلیمات پر ہوا اور وہ اس خدمت کو تقریباً چھ ماہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے ۔ ۱۹۲۱ع میں

آپ نے مدارسِ فوقانیہ انگریزی کے علاوہ مدارس فوقانیہ عثمانیہ بھی قائم کیے جن میں ذریعۂ تعلیم اُردو زبان قرار دی گئی - ۱۹۲۳ء میں آپ نے ایک ٹیکنیکل ادارہ ''عثمانیہ ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ'' کے نام سے دارالضرب حیدرآباد میں قائم کیا جس کا مقصد معمولی نصاب کے ساتھ صنعتی تعلیم کو فروغ دینا تھا -

۱۹۲۴ء میں آپ سرکار کی جانب سے جاپان کی تعلیم کے نظم و نسق کا مطالعہ کرنے کے لیے جاپان گئے اور بھرپور مطالعہ کر کے حیدر آباد واپس آئے اور اپنے اس تجربے کا نچوڑ ''جاپان کا تعلیمی نظم و نسق'' کے نام سے کتابی شکل میں پیش کیا - ۱۹۲۵ء میں رخصت لے کر پھر جاپان ، کوریا اور چین تشریف لے گئے اور اب کی دفعہ کوریا اور چین کی تعلیمی حالت کا غائر مطالعہ کیا -

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک آپ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے - اسی زمانے میں (۱۹۳۳ء میں) آپ نادر شاہ بادشاہِ افغانستان کی دعوت پر علامہ اقبال اور سیّد سلیمان ندوی کے ہمراہ کابل گئے اور وہاں کی تعلیمی اصلاحات کے سلسلے میں مفید مشورے دیے -

علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ سے مستعفی ہونے کے بعد نواب حمید اللہ خاں والیِ بھوپال کے اصرار پر آپ ناظمِ اعلیٰ تعلیمات و امورِ مذہبی مقرر ہوئے اور ۱۹۳۴ء سے جولائی ۱۹۳۷ء یعنی اپنی وفات تک بھوپال میں رہے - علامہ اقبال کی ذات سے ان کی اور نواب صاحب بھوپال کی والہانہ عقیدت اقبال کو اکثر بھوپال آنے کی دعوت دیتی رہتی تھی اور وہ کئی کئی دن سر راس مسعود

کے پاس رہتے تھے۔ مسعود کے پاس قیام کے دنوں میں اقبال پر اکثر بلند پایہ فکر اور خیال کا الہام ہوتا تھا۔ ''ضربِ کلیم'' کی بہت سی نظمیں بھوپال ہی میں کہی گئیں۔ ڈاکٹر ظہیرالدین احمد الجامعی صدر شعبۂ مذہب و ثقافت جامعہ عثمانیہ کا بیان ہے:

''ایک مرتبہ لاہور جاتے ہوئے، میں راس مسعود سے ملنے کے لیے بھوپال اتر گیا۔ اتفاق سے اقبال بھی مسعود کے مکان پر فروکش تھے، لیکن بیماری کا ان پر غلبہ تھا۔ تقریباً فریش تھے۔ معراج کی شب تھی۔ مسعود کا مدارالمہامِ امور مذہبی کی حیثیت سے مسجد شاہجہانی میں منعقدہ تقریب میں شریک ہونا شاید ضروری تھا۔ تقریبِ معراج میں جاتے ہوئے مسعود نے مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔

منبر پر فروکش ایک مولانا وعظ فرما رہے تھے۔ انھوں نے وحی اور نبوّت کے اسرار جس عامیانہ انداز میں پیش کیے اور جس دریدہ دہنی کے ساتھ اس موقع پر اقبال کے کلام سے استفادہ کیا، راس مسعود کو اس جہل و جرأت نے بہت دکھ پہنچایا۔ وہ ان مہملات کو سننے کی تاب نہ لا سکے۔ زیادہ دیر تک وہاں نہ ٹھہر سکے اور جلد ہی لوٹ آئے۔

گھر پہنچے تو اقبال جاگ رہے تھے اور قلبی دورے کی وجہ سے کسی قدر بے چین تھے۔ مسعود، جس کی سحر بیانی، خوش کلامی، ادیبانہ اندازِ گفتگو، فطری ظرافت

اور خوش طبعی اقبال کے لیے ہزاروں دواؤں کی ایک دوا ہوا کرتی تھی ، وہ اقبال کی مزاج پُرسی کے لیے ان کے کمرے میں چلے گئے اور ان کا دل بہلانے کی خاطر نہایت ہی دلچسپ اور شیریں انداز میں مولانا کی اس ہرزہ سرائی کا ذکر کیا ، جس سے خود مسعود تو بُردل ہوئے تھے لیکن اقبال کو خوش دل کر دیا ۔ اس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے مسعود کی گفتگو نے تریاق کا کام کیا ہے ۔ یکبارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہوئے ۔ اقبال کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی اور انھوں نے بڑے ہی ظریف لیکن متین انداز میں کہا :

"اگر مولانا نے میرے کلام کو اپنے حسبِ منشا استعمال کیا ہے ، تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟[1]"

اس موقع پر اقبال نے امام غزالیؒ کا ایک واقعہ بھی بیان کیا ۔ فرمایا کہ طویل سفر کی مشقتیں برداشت کرنے کے بعد غزالی دمشق پہنچے ۔ جمعہ کا دن تھا ۔ جمعہ پڑھنے کے لیے جامعۂ امویہ کا قصد کیا ۔ مسجد بھری ہوئی تھی ۔ سیڑھیوں کے قریب جوتیوں کے پاس جگہ پائی ۔ صفیں چیر کر آگے بڑھنے کی بجائے درویشانہ انداز میں وہیں بیٹھ گئے ۔ نماز کے بعد ایک واعظ نے اپنی چرب زبانی کے

۱۔ اقبال کی کہانی کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی ، ص ۵۵ ۔

جوہر دکھانے شروع کیے ۔ ایک موقع پر اپنے کسی قول کی تائید میں اُس نے امام غزالیؒ کا نام استعمال کیا ۔ غزالی چونکے ۔ بہت حیران ہوئے اور انھوں نے اپنی نیک نفسی سے واعظ کے متعلق بدگمان ہونے کی بجائے یہ خیال کیا کہ کسی غلط روایت پر اعتماد کرکے میری جانب یہ قول منسوب کردیا ہے ۔

آدابِ فقر و درویشی نے امام غزالی کو فوراً واعظ کی اس غلطی کی تصحیح کی اجازت نہ دی مگر جب وعظ ختم ہوگیا اور مجمع چھٹ گیا تو انتہائی تواضع اور انکساری کے ساتھ آگے بڑھے اور واعظ سے تخلیے میں کچھ کہنے کی درخواست کی ۔ غزالی عمر میں واعظ کے باپ ہو سکتے تھے مگر واعظ نے ان کو ''بچہ'' کہہ کر مخاطب کیا اور کہا : ''میاں ! ہم سے تخلیہ کیا ، جو چاہو کہہ دو ۔'' غزالی نے جب واعظ کو اس غلط انتساب پر متنبّہ کیا ، تو وہ ایک دم طیش میں آگئے اور کہا : ''کچھ دماغ میں خلل تو نہیں ہوا ہے کہ خود کو غزالی سمجھنے لگا ۔ ارے ! تیرے باپ نے تیرا نام اگر غزالی رکھ دیا ہے تو کیا تو امام غزالی ہوگیا ؟'' امام غزالی اس کا جواب تو کیا دیتے ، صبر کیا اور خاموشی کے ساتھ لوٹ آئے ۔ یہ واقعہ سنانے کے بعد اقبال نے مسکراتے ہوئے فرمایا :

''اگر میں ان مولانا سے یہ کہتا کہ میرا یہ منشا ہرگز

نہیں تھا ، جس کا اظہار آپ فرما رہے ہیں ، تو شاید
غزالی سے کچھ بہتر سلوک میرے ساتھ نہ کیا جاتا ۔"
مسعود سے اس تھوڑی سی گفتگو کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اقبال بالکل تندرست ہو چکے ہیں ۔ لیکن مسعود نے زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور ان کو آرام کی نیند سونے کے لیے خدا حافظ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے ۔

اقبال کے لیے "ملا" جی کی اس ہرزہ سرائی نے سہمیز کا کام کیا اور بہترین الہام کا سامان مہیا کر دیا ۔ ڈاکٹر ظہیر فرماتے ہیں کہ صبح ہم جب اقبال کے ساتھ چائے پی رہے تھے ، تو اقبال نے کہا کہ رات "حقیقتِ وحی" کے متعلق بے ساختہ ایک خیال نظم ہوگیا ہے ۔ مسعود ، جن کے لیے اقبال کا ہر لفظ الہام کا درجہ رکھتا تھا ، اس نئے الہام کے سننے کے لیے سراپا اشتیاق اور مجسم گوش دکھائی دینے لگے ۔ اقبال نے حسبِ معمول اپنے پُرتمکین اور باوقار لہجے میں فرمایا :

عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات
فکر بے نور ترا ، جذبِ عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات
خوب و ناخوبِ عمل کی ہو گرہ وا کیونکر
گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

(ضربِ کلیم)

''حقیقتِ وحی'' کے متعلق اس اظہارِ خیال کو اور خود اقبال کی زبانی سن کر ایک عجیب وجد اور سرشاری کی کیفیت تھی جو صرف محسوس ہی کی جا سکتی ہے، الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ مسعود تو تقریباً جھوم رہے تھے اور مزے لے لے کر اس قطعے کو دہرا رہے تھے۔ اس نادر تخیّل نے وحی کے متعلق تمام پردے ہٹا دیے۔ اجنبیت کے ہر گونہ احساس کو یک لخت دور کر کے یہ محسوس کرا دیا کہ وحی باہر سے مسلّط کیا ہوا کوئی اجنبی حکم نہیں بلکہ خود انسانی ضمیر کی گہرائیوں سے ابلا ہوا چشمہ ہے۔ پیغمبرؑ کا ضمیر انسانیت کے لیے مجلاّ اور شفاف آئینے کا کام دیتا ہے۔ اس میں ہر فردِ انسانی کے ضمیر اور زندگی کی فطری احتیاجات کا انعکاس ہوتا ہے۔ پیاسی فطرت کی آبیاری کے لیے اس کے ضمیر کی گہرائیوں سے علم و عرفان کے چشمے ابل پڑتے ہیں جو پوری انسانیت کے ضمیر کی نمایندگی کرتے ہیں۔

وحی کی یہ کتنی جاذبِ توجہ، معقول اور دل‌نشیں تعبیر ہے کہ ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے زندگی خود کو گوناگوں پیچیدگیوں، نت نئے ہنگاموں اور گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں مبتلا کر لیتی ہے۔ انسانی عقل، جو حواس کے تابع ہے اور صرف ظن و تخمین اور شک و شبہ کا فائدہ دے سکتی اور عمل کے حسن و قبح کے لیے کوئی آخری، قطعی اور یقینی معیار نہیں پیش کر سکتی، جب خود کو ان گتھیوں کے سلجھانے سے قاصر پاتی ہے، تو بلا استعانتِ حواس اپنے

اسرار آپ کھولتی اور خوب و ناخوبِ عمل کی گرہ کشائی کے لیے آخری ، قطعی اور یقینی راہ اختیار کر لیتی ہے - حلِ مشکلات کے اسی طریقے کو اقبال وحی کہتے ہیں - چنانچہ فرماتے ہیں :

''اسلام کی پیدائش گویا اخذِ نتائج کی قابلیت کی پیدائش ہے - اسلام میں وحی نے خود اپنے خاتمے کی ضرورت کو محسوس کیا - یہ بات اس اہم حقیقت کا پتا دیتی ہے کہ قدرتِ کاملہ نے انسان کو مکمل شعور حاصل کرنے کے لیے اپنی ذاتی قابلیتوں پر ہی بھروسہ کرنے کے لیے مجبور کیا ہے - قرآن مجید کا پیشوائیت اور بادشاہت کو ختم کرنا اور عقل و تجربے پر زیادہ زور دینا بھی اسی منشائے ایزدی کے اشارے ہیں -''[۱]

اسی طرح شریعت ، جس کا سرچشمہ وحی ہے ، انسان پر ٹھپا ہوا کوئی اجنبی حکم نہیں بلکہ اعماقِ حیات سے نکلے ہوئے احکام کا مجموعہ ہے ، جس کی طرف اقبال نے یوں اشارہ کیا ہے :

فاش می خواہی اگر اسرار دیں
جز باعماقِ ضمیرِ خود مبیں

گویا :

حقیقت را بہ رندے فاش کردند
کہ ''ملا'' کم شناسد رازِ دیں را

۱- تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ ، ص ۱۲۰ -

بہرحال ''ضربِ کلیم'' جب شائع ہوئی تو اقبال نے اسے نواب حمیداللہ خاں کی خدمت میں ان الفاظ کے ساتھ پیش کیا :

بگیر این ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

راس مسعود سے تو اقبال کو ایک طرح کا عشق تھا ۔ وہ ان کی قابلیت ، دل نوازی ، بلند نظری اور سیرچشمی کے بے حد مدّاح تھے اور ان کو اپنے باپ دادا کے تمام اوصافِ حسنہ کا جامع سمجھتے تھے ۔ لیڈی مسعود کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

''اس نے (راس مسعود نے) قدرت سے دادا کا دل اور باپ کا دماغ پایا تھا اور جب تک جیا اس دل و دماغ سے ملک و ملّت کی خدمت کرتا رہا ۔''[1]

یکم مارچ ۱۹۳۷ع کو سر راس مسعود کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ۔ اس کا نام نادرہ مسعود رکھا گیا ۔ اقبال نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ[2] کہا :

راس مسعودِ جلیل القدر کو
جو کہ اصل و نسل میں محمود ہے
یادگارِ سیّدِ والا گہر
نورِ چشمِ سیّد محمود ہے
راحتِ جان و جگر دختر ملی
شکرِ خالق ، منّتِ معبود ہے

۱- اقبال نامہ ، جلد اول ، ص ۲۹۳ -
۲- باقیاتِ اقبال ، ص ۲۹۶ -

خاندان میں ایک لڑکی کا وجود
باعثِ برکاتِ لامحدود ہے
کس قدر برجستہ ہے تاریخ بھی
با سعادت دخترِ مسعود ہے

۱۹۳۷ع

۱۵ اگست ۱۹۳۷ع کو مسعود کی وفات پر اقبال نے انسانی بے بسی کا ماتم کرتے ہوئے اپنے دلی رنج و الم کا اظہار اس طرح کیا[۱] :

رہی نہ آہ! زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود
زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود
مجھے رُلاتی ہے اہلِ جہاں کی بے دردی
فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غم دوست
نہ کہہ کہ صبر معمّائے موت کی ہے کشود
"دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
ز عشق تا بہ صبوری ھزار فرسنگ است"

(سعدی)

اس کے بعد مسعود کے سنگِ مزار کے لیے علامہ نے یہ رباعی تجویز کی جو انھوں نے اپنی لوحِ مزار کے لیے لکھی تھی کہ اس رباعی کا

۱- ارمغانِ حجاز۔

مضمون سر راس مسعود کی زندگی اور موت پر صادق آتا تھا :

نہ پیوستم دریں بستان سرا دل
ز بند این و آں آزادہ رفتم
چو بادِ صبح گردیدم دم چند
گلاں را رنگ و آبے دادہ رفتم

اور ممنون حسن کو لکھا کہ اگر صرف ایک ہی مطلع ان کے سنگِ مزار پر کندہ کرانا ہو تو مندرجہ ذیل شعر موزوں رہے گا :

اے برادر ! من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگ سبک داں مرگ را خوابِ گراں

سر راس مسعود اور لیڈی مسعود کے نام اقبال کے محبت بھرے خطوط ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ کی جلد اول میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

۲۳

منشی سراج الدین احمد

(۱۹۴۰ء)

خان صاحب منشی سراج الدین احمد کشمیر کی ڈار برادری سے تعلق رکھتے تھے ۔ آپ لاہور کے مشہور وکیل منشی محمد اسمٰعیل کے سب سے بڑے فرزند تھے ۔ آپ کا دادا رمضان ڈار کشمیر سے ترکِ وطن کر کے پنجاب آیا اور لاہور میں آباد ہوا ، جہاں آپ کا کنبہ اب تک پھیلا ہوا ہے ۔

منشی سراج الدین احمد کی ولادت یکم اکتوبر ۱۸۷۶ء کو ہوئی ۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول جہلم سے حاصل کی ۔ فورمن کرسچن کالج لاہور سے بی ۔ اے کا امتحان پاس کیا ۔ فارسی کے مضمون سے آپ کو خاص لگاؤ تھا اور اس میں اچھا خاصا مذاق رکھتے تھے ۔ کالج سے فارغ ہوتے ہی انجمن حمایت اسلام لاہور کے منتظمین نے آپ کی خدمات اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ گیٹ کے لیے حاصل کر لیں جہاں کچھ عرصہ آپ انگریزی اور فارسی پڑھاتے رہے ۔ جن لوگوں

کو آپ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے وہ اعتراف کرتے ہیں کہ منشی صاحب اپنے مضامین پر اتنا حاوی ہوتے تھے کہ طلبا کی توجہ ادھر اُدھر نہ ہونے دیتے تھے۔

۱۸۹۹ء میں آپ ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے کشمیر ریذیڈنسی میں ملازم ہوئے اور ۱۹۰۷ء میں ترقی کر کے لیہ ایجنسی (Leh Agency) میں ہیڈ کلرک ہو گئے۔ ۱۹۱۳ء میں پھر کشمیر ریذیڈنسی میں واپس آئے اور میر منشی کے عہدے پر فائز ہوئے، جہاں آخر دم تک رہے۔ ۱۹۱۷ء میں آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت نے آپ کو ''خان صاحب'' کا خطاب عطا کیا۔[1]

ادب و شعر میں آپ کا مذاق بہت سلجھا ہوا تھا۔ آپ فارسی کے فاضل مانے جاتے تھے۔ زبان اور اصنافِ سخن کی باریکیوں کو آپ خوب سمجھتے تھے اور یہی بات آپ کی شہرت کا باعث تھی۔ آپ کشمیر کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کی روح و رواں تھے۔ آپ کے بغیر کوئی مجلس مکمل نہ سمجھی جاتی تھی۔ آپ کی بذلہ سنجی، نکتہ آفرینی اور شگفتہ مزاجی سے محفل کا رنگ دوبالا ہو جاتا تھا۔ آپ کو قدیم شعرائے فارسی اور اردو کے ہزاروں شعر زبانی یاد تھے، جنہیں آپ خیالات کا تطابق یا تفاوت دکھانے کے لیے موقع بموقع پیش کیا کرتے تھے اور ان کا ذخیرہ کبھی ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ بعض اشعار کے کیف میں وہ اتنا ڈوب جاتے تھے کہ بے خود ہو کر

۱۔ فہرست فرماں روایان، رؤسا اور مشاہیرِ جمّوں و کشمیر، مطبوعہ گورنمنٹ آف انڈیا سنٹرل پبلی کیشن برانچ کلکتہ ۱۹۲۵ء۔

بھری محفل میں گانے اور ناچنے لگتے تھے ۔ خود شعر کی تصویر بن جاتے تھے اور اس کے سرور سے سننے والوں کو مسحور کر دیتے تھے ۔ آپ کے چست فقرے اتنے برمحل اور پُرلطف ہوتے تھے کہ جس مشاعرے میں آپ شریک نہ ہوتے ، لوگ پوچھتے کہ :

یارو ! وہ بلبلِ چمنستاں کدھر گیا ؟
ہر نغمہ جس کا حسنِ تمنائے گوش تھا

نو مشق شعرا آپ کی صدارت میں شعر پڑھتے ہوئے ڈرتے اور کہنہ مشق آپ کی تحسینِ سخن شناس سے خوش ہوتے تھے ۔

ملازمت سے اعزاز کے ساتھ سبکدوش ہونے کے بعد سری نگر کے محلہ نوہورہ میں اپنا مکان بنا لیا تھا جس میں کتب خانے کے لیے ایک کمرہ خاص اہتمام سے تیار کرایا تھا ۔ وہیں بیٹھ کر آپ مطالعہ کیا کرتے تھے ۔ آپ کو مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھنے اور جمع کرنے کا بھی شوق تھا ۔ کتابوں کی جلد بندی اپنے ہاتھ سے کرتے تھے اور کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ کر اپنے اطاقِ ادب کی زینت بناتے تھے ۔ ریذیڈنسی سے جو انگریز ولایت واپس جاتا تھا ، آپ کا شوقِ مطالعہ دیکھ کر اپنا ذخیرۂ کتب بھی انھی کو دے جاتا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ ہزارہا نادر و کمیاب کتابیں آپ کے کتب خانے میں موجود تھیں اور یہی آپ کی عمر بھر کی کمائی تھی ۔ آپ کی تنخواہ کا بیشتر حصہ اسی جنسِ گراں مایہ کی تزئین و حفاظت میں صرف ہو جاتا تھا ۔ افسوس کہ ۱۹۳۰ء میں سرینگر میں آپ کا انتقال ہو گیا ۔ تقسیمِ ملک کے بعد آپ کا سارا قیمتی کتب خانہ کشمیر یونیورسٹی نے اپنی تحویل میں لے کر تباہ ہونے سے بچا لیا ۔

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال سے آپ کے مراسم بہت گہرے اور پرانے تھے ۔ آپ حضرت علامہ کی فطرت کے میلان اور پسند کے رجحان کو خوب سمجھتے تھے ۔ اکثر ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں اور خط و کتابت بھی رہتی تھی ۔ اقبال اپنی بعض غزلیں اور نظمیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر ان کی خدمت میں بھیج کر ان کی رائے معلوم کیا کرتے تھے ۔ ''پرندے کی فریاد'' اور کئی دوسری نظمیں اور غزلیں بھی ان کے کاغذات میں موجود تھیں ، مگر افسوس کہ صرف چار خطوں کے سوا کچھ دستیاب نہیں ہو سکا ، ورنہ آپ دیکھتے کہ خلوت کی بعض سرگوشیاں جلوت کے آراستہ خیالات سے کہیں زیادہ پُرلطف ہوتی ہیں ۔

ان چار خطوں میں سے ایک خط ۱۹۰۲ء کا ، ایک ۱۹۰۳ء کا اور دو ۱۹۱۵ء کے ہیں ۔ پہلے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی صاحب نے علامہ اقبال کو کشمیر سے تحفے کے طور پر چند منقش انگوٹھیاں بھیجی تھیں ، جس کا منظوم شکریہ ادا کیا گیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال پر منشی صاحب کے الطاف و عنایات کا گہرا اثر تھا ۔ حضرت علامہ کی طبیعت میں استغنا کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ۔ وہ امیروں کی مدح و توصیف میں بہت ہی کم زبان کھولتے تھے ۔ منشی صاحب تو کوئی امیر بھی نہ تھے ، محض سفید پوش تھے ۔ بس یوں سمجھیے کہ برابر والوں سے ذرا نظر نیچی نہ ہوتی تھی ۔ ان کی دوستی محض اخلاص و محبت پر مبنی تھی ۔ علامہ اقبال اس اخلاص و مروّت کے معترف تھے اور سپاس کے طور پر اس کا اظہار ضروری خیال کرتے تھے ، جیسا کہ اس خط سے ظاہر

ہوتا ہے:

"۱۹۰۲ع

ڈیر سراج!

دو تین روز سے طبیعت بہ سبب دورۂ نقرس علیل ہے۔ یہ چند شعر قلم برداشتہ آپ کے شکریے میں عرض کرتا ہوں۔ میرا ارمغان یہی ہے۔ اس کو قبول کر کے مجھے مشکور کیجیے۔ چاہیں تو پیشانی پر چند عدد سطور لکھ کر "مخزن" میں بھیج دیجیے۔ والسلام

آپ کا اقبال، از لاہور"

آپ نے بھیجی جو مجھ کو ارمغاں انگشتری
دے رہی ہے مہر و الفت کا نشاں انگشتری

زینتِ دستِ حنا مالیدۂ جاناں ہوئی
ہے مثالِ عاشقاں آتش بجاں انگشتری

تو سراپا آیتے از سورۂ قرآنِ فیض
وقفِ مطلق اے سراجِ مہرباں انگشتری

میرے ہاتھوں سے اگر پہنے اسے وہ دلربا
ہو رموزِ بے دلی کی ترجماں انگشتری

ہو نہ برق افگن کہیں اے طائرِ رنگِ حنا
تاکتی رہتی ہے تیرا آشیاں انگشتری

ساغرِ مے میں پڑا انگشتِ ساقی کا جو عکس
بن گئی گردابۂ آبِ رواں انگشتری

ہوں بہ تبدیلِ قوافی فارسی میں نغمہ خواں
ہند سے جاتی ہے سوئے اصفہاں انگشتری

یارم از کشمر[1] فرستاد است چار انگشری
چار در صورت ، بمعنی صد ہزار انگشتری

چار را گر صد ہزار آوردہ ام اینک دلیل
شد قبولِ دستِ یارم ہر چہار انگشتری

داغ داغ موج و میناکاری‌اش جوشِ بہار
می دہد چوں غنچۂ گل بوئے یار انگشتری

در لہانور[2] آمد و چشمِ تماشا شد تمام
برد در کشمیر چشمِ انتظار انگشتری

یار را ساغر بکف انگشتری در دستِ یار
حلقہ اش خمیازہ و مست خمار انگشتری

۱- کشمیر کو 'کشمر' اور 'کاشمر' بھی کہتے ہیں ۔

۲- لاہور کا پرانا نام 'لہانور' ہے ، جسے حضرت امیر خسرو دہلوی نے کتاب ''قران السعدین'' میں بھی استعمال کیا ہے ۔ پیر مراد شاہ لاہوری متوفی ۱۸۰۰ء نے بھی اپنی مثنوی ''مراد المحبیّن'' (قصۂ چہار درویش) اور ''نامۂ مراد'' میں یہی نام استعمال کیا ہے :

بسالِ غریب و بماہِ صیام
۱۲۱۲ھ
بشہرِ لہانور عالی مقام

وہی لاہور ہے شہر لہانور
جو دارالسلطنت کر کے ہے مشہور

ما اسیرِ حلقہ‌اش او خود اسیرِ دستِ دوست
الله الله ! دام و صیّاد و شکار انگشتری

خاتم دست سلیماں حلقہ درگوش دلے است
اے عجب انگشتری را جاں نثار انگشتری

وہ چہ بکشاید بدست آں نگار سیم تن
ماند گر زیں پیشتر سربستۂ کار انگشتری

من دلِ گم‌گشتۂ خود را کجا جویم سراغ
دزدیِ دزدِ حنا را پردہ دار انگشتری

رازدار دزد هم دزد است در بازارِ حسن
چشمکِ دزدِ حنا را رازدار انگشتری

هر دو باهم ساختند و نقدِ دل ها می برند
پختہ مغز انگشتِ جاناں ، پختہ کار انگشتری

نوبہارِ دلفریب انگشتری در دستِ یار
برگِ گل انگشت و آغوشِ بہار انگشتری

من خورم خونِ جگر از حسرت پابوس دوست
بوسہ بر دستش زند لیل و نہار انگشتری

بوالہوس ز انگشتری طرز اطاعت بادگیر
می نہد سر بر خطِ فرمانِ یار انگشتری

ماہِ نو قالب تہی کرد است از حسرت بہ چرخ
جلوہ فرما شد چو در انگشت یار انگشتری

ارمغانم سلک گوہر هاست یعنی ایں غزل
کز سراجم نورها آمد چہار انگشتری

گشت اے اقبال مقبولِ امیر[1] ملک حسن
کردہ وا سارا گرہ آخر ز کار انگشتری

دوسرے خط میں اپنا تازہ کلام بھیج کر مجموعۂ کلام کی ترتیب میں منشی صاحب کے مفید مشوروں سے فائدہ اٹھانے کی تمنّا ظاہر کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۲۴ع میں ''بانگِ درا'' کی صورت میں مرتّب ہوا:

''از لاہور ۔ بھاٹی دروازہ

۱۱ مارچ ۱۹۰۳ع

برادر مکرّم! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ۔ الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ آج عید کا دن ہے اور بارش ہو رہی ہے۔ گرامی صاحب تشریف رکھتے ہیں اور شعر و سخن کی محفل گرم ہے۔ شیخ عبدالقادر ابھی اٹھ کر کسی کام کو گئے ہیں۔ سیّد بشیر حیدر بیٹھے ہیں اور ابرِ گہربار کی اصل علّت کی آمد آمد ہے۔ یہ

۱۔ اسی امیر کے بارے میں اقبال نے اپنے ہم راز دوست سیّد تقی شاہ کو ایک خط میں لکھا تھا:

''امیر کہاں ہے؟ خدا کے لیے وہاں ضرور جایا کریں۔ مجھے بہت اضطراب ہے۔ خدا جانے اس میں کیا راز ہے۔ جتنا دور ہو رہا ہوں، اتنا ہی میں اس سے قریب ہو رہا ہوں۔''

(اقبال نامہ، حصہ دوم، ص ۲۹۹)

جملہ شاید آپ کو بے معنی معلوم ہوگا مگر کبھی وقتِ ملاقات آپ پر اس کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔

آپ کے خط نے ایک بڑے فکر سے مجھے نجات دی۔ مجھے دو تین دن سے اس بات کی کاوش تھی کہ نظم کہیں سے ملے تو آپ کو ارسال کروں۔ الحمد للہ کہ آپ کو مل گئی۔ آپ کی داد کا مشکور ہوں اور اس کو کبھی تصنّع نہیں سمجھتا۔ آپ کو کس بات سے یہ اندیشہ پیدا ہوا ؟ ترتیبِ اشعار کی خود مجھے بھی فکر ہو رہی ہے مگر یہ خیال ہے کہ ابھی کلام کی مقدار تھوڑی ہے۔ بہرحال جب یہ کام ہوگا تو آپ کے صلاح و مشورے کے بغیر نہ ہوگا۔ مطمئن رہیں۔

ملٹن کی تقلید میں مدت سے کچھ لکھنے کا ارادہ ہے اور اب وہ وقت قریب معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان دنوں وقت کا کوئی لحظہ خالی نہیں جاتا جس میں اس کی فکر نہ ہو۔ پانچ چھ سال سے اس آرزو کی دل میں پرورش کر رہا ہوں مگر جتنی کاوش آج کل محسوس ہوتی ہے، اس قدر کبھی نہیں ہوئی۔ فکرِ روزگار سے نجات ملتی ہے تو اس کام کو باقاعدہ شروع کروں گا۔

"ابرِ گہربار" شروع کرنے سے پیشتر کہ کوئی وہابی اس کے بعض اشعار پر فتویٰ نہ دے دے، چند باتیں تمہید میں بھی کی تھیں اور ایک غزل بھی کہی تھی، جو

ارسالِ خدمت کرتا ہوں! :

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

جلوہ دکھا کے آپ تو پردے میں ہو رہے
اور کہہ گئے نگاہ کو ڈھونڈا کرے کوئی

ہم جانتے ہیں میم کے پردے میں کون ہے
ہاں بھیدیوں سے منہ نہ چھپایا کرے کوئی

سو سو امید بندھتی ہے اک اک نگہ پر
مجھ کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی

صبحِ ازل یہ دردِ محبت نے دی صدا
مجھ کو بھی ساتھ حسن کے پیدا کرے کوئی

مدت کے بعد دل نے بھی کی بات ہوش کی
اس رہگذر سے روز نہ گزرا کرے کوئی

محفل ہو، شغلِ مے ہو، شبِ ماہتاب ہو
اور میں گروں تو مجھ کو سنبھالا کرے کوئی

بولے بھی سن کے قصۂ ہجراں تو یہ کہا
کی دل لگی تو یہ بھی گوارا کرے کوئی

۱- اقبال نے اس خط میں اپنے قلم سے سترہ شعر لکھے ہیں، حالانکہ ''بانگ درا'' میں اس غزل کے فقط نو شعر درج ہیں۔ اس لیے ''بانگ درا'' کے مطبوعہ اشعار کو چھوڑ کر یہاں صرف وہی اشعار نقل کیے گئے ہیں جن کو اقبال نے نظرِ ثانی کے وقت قلم زد کر دیا تھا۔

اقبال عشق نے مرے سب بل دیے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

اس کے بعد اقبال نے اپنی نظم ''بلبل کی فریاد'' درج کی ہے اور آخر میں لکھا ہے:

''کاغذ ختم ہو گیا ہے۔ دل بھی آکتا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں میں نے بڑی ہمت کی کہ اپنے اشعار نقل کر لیے اور آپ کو خط بھی لکھ دیا۔ الحمد للہ علٰی ذالک۔ مندرجہ بالا نظم کی بندش ملاحظہ فرمائیے۔ چونکہ بچوں کے لیے ہے، اس واسطے اضافات اور دقتِ مضمون سے خالی ہے۔ علاوہ ازیں فریاد کرنے والا آخر پرندہ ہے۔ والسلام صادق علی خاں[1] صاحب بخیر باد اور دیگر احباب کی خدمت میں سلام عرض کریں۔

آپکا صادق محمد اقبال''

اس خط میں جس نظم ''ابرِ گہربار'' کا ذکر آیا ہے، وہ اقبال نے انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے اٹھارھویں سالانہ اجلاس میں یکم مارچ ۱۹۰۳ع کو ظہر اور عصر کے درمیان خان بہادر غلام احمد خان مشیرِ مال ریاست جموں و کشمیر کی صدارت میں (تخیلاً بآستانۂ سرور کائنات خلاصۂ موجودات) عاشقانہ فریاد کے رنگ میں پڑھ کر سنائی تھی۔ بارہ بند کی اس طویل نظم کے صرف ایک بند کے سوا

۱۔ صادق علی خاں صاحب سرینگر کشمیر کے کسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اور ''مخزن'' کے مضمون نگار۔

اقبال نے بعض وجوہ کی بنا پر اسے "بانگِ درا" میں شامل نہیں کیا ۔ البتہ ۱۹۱۳ع میں یہ "فریادِ اُمّت" کے نام سے الگ شائع ہو گئی تھی ۔ اس کی ابتد اس طرح ہوتی ہے :

دل میں جو کچھ ہے نہ لب پر اسے لاؤں کیونکر
ہو چھپانے کی نہ جو بات ، چھپاؤں کیونکر

دوسرے بند کے یہ دو شعر ملاحظہ ہیں :

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں
دیکھ اے چشم عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

تیسرا بند[1] :

قصّۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل
التجائے ارنی سرخیٔ افسانۂ دل

چوتھا بند :

آتی ہے اپنی سمجھ اور پہ مایل ہو کر
آنکھ کھل جاتی ہے انسان کی بے دل ہو کر

پانچواں بند :

لاکھ سامان ہے اک بے سر و ساماں ہونا
مجھ کو جمعیّتِ خاطر ہے پریشاں ہونا

۱۔ صرف اس بند کے گیارہ میں سے نو شعر "بانگِ درا" میں دیے گئے ہیں اور عنوان "دل" رکھا گیا ہے ۔

چھٹا بند:

حشر میں ابر شفاعت کا گہربار آیا
دیکھ اے جنسِ عمل تیرا خریدار آیا

ساتواں بند:

لے چلا بحرِ محبّت کا تلاطم مجھ کو
کشتیٔ نوح ہے ہر موجۂ قلزم مجھ کو

آٹھواں بند:

امرا جو ہیں وہ سنتے نہیں اپنا کہنا
سامنے تیرے پڑا ہے مجھے کیا کیا کہنا

نواں بند:

اے کہ تھا نوح[۴] کو طوفاں میں سہارا تیرا
اور براہیم[۴] کو آتش میں بھروسا تیرا

دسواں بند:

قوم کو جس سے شفا ہو وہ دوا کون سی ہے
یہ چمن جس سے ہرا ہو وہ صبا کون سی ہے

گیارھواں بند:

حالِ اُمّت کا بُرا ہے کہ بھلا کہتے ہیں
صفتِ آئنہ جو کچھ ہے، صفا کہتے ہیں

بارھواں بند:

اس مصیبت میں ہے اک تُو ہی سہارا اپنا
تنگ آکر لبِ فریاد ہوا وا اپنا

داستاں درد کی لمبی ہے کہیں کیا تجھ سے
ہے ضعیفوں کو سہارے کی تمنّا تجھ سے

تیسرے خط میں مثنوی ''اسرارِ خودی'' پر منشی صاحب کی بے لاگ تنقید اور ان کے شستہ مذاق کی تعریف کی گئی ہے اور مثنوی کے دوسرے حصے کے مندرجات پر روشنی ڈالی گئی ہے :

''لاہور - ۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء

مخدومی - السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ملا - پڑھ کر مجھے بڑی مسرت حاصل ہوئی - الحمد للہ کہ آپ کو مثنوی پسند آئی - آپ ہندوستان کے اُن چند لوگوں میں سے ہیں جن کو شاعری سے طبعی مناسبت ہے - اور اگر نیچر ذرا فیاضی سے کام لیتی تو آپ کو زمرۂ شعرا میں پیدا کرتی -[1] بہرحال شعر کا صحیح ذوق شاعری سے کم نہیں بلکہ کم از کم ایک اعتبار سے اس سے بہتر ہے - محض ذوقِ شعر رکھنے والا شعر کا ویسا ہی لطف اُٹھا لیتا ہے جیسا کہ خود شاعر، اور تصنیف کی شدید تکلیف اسے اُٹھانی نہیں پڑتی -

---

۱- منشی صاحب شعر تو کہتے تھے مگر ان کی نوعیت کچھ اور ہوتی تھی - وہ اپنے کلام کو افکارِ ہنگامی کہا کرتے تھے - یہ بڑی دلچسپیوں کا حامل ہوتا تھا - اس میں دوستوں کے سہرے، ان کی ترقیوں پر تہنیت نامے اور پیدائش اور اموات کی تاریخیں وغیرہ ہوتی تھیں - غزل بھی کہتے تھے مگر ان کے جوہر زیادہ تر چھیڑ چھاڑ میں کھلتے تھے -

یہ مثنوی گزشتہ دو سال کے عرصے میں لکھی گئی ، مگر اس طرح کہ کئی کئی ماہ کے وقفوں کے بعد طبیعت سائل ہوتی رہی - چند اتوار کے دنوں اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے - موجودہ مشاغل وقت نہیں چھوڑتے اور جوں جوں اس میں زمانہ زیادہ ہوتا جاتا ہے ، کام بڑھتا جاتا ہے - لٹریری مشاغل کے امکانات کم ہوتے جا رہے ہیں - اگر مجھے پوری فرصت ہوتی ، تو غالباً اپنی موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی -

اس کا دوسرا حصہ بھی ہوگا جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں - مجھے یقین ہے کہ وہ حصہ اس حصے سے زیادہ لطیف ہوگا ؛ کم از کم مطالب کے اعتبار سے ، گو زبان اور تخیّل کے اعتبار سے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہوگا - یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے ، جو اپنے اختیار کی بات نہیں -

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں - ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں - ان کا لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہے اور سوشل نصب العین بھی ایرانی - میں چاہتا ہوں کہ مثنوی میں اس حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے ہوئی - صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے - انشاءاللہ

دوسرے حصے میں دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے اور کہاں سے آیا اور صحابہ کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جن کا تصوف حامی ہے ۔

والسلام

امید کہ آپ کا مزاج بہ خیر ہوگا ۔

آپ کا خادم محمد اقبال"

آخری خط میں ان کی تنقید کے غلطی سے روزنامہ "زمیندار" میں چھپ جانے پر ندامت کا اظہار کیا ہے ۔ علامہ مرحوم اعتقادات اور زبان کی فضول بحثوں میں الجھنا پسند نہیں کرتے تھے ۔ ان کی فطرت اتنی سعید تھی کہ جو مشورہ معقول ہوتا تھا اسے قبول کرتے تھے اور اس کے مطابق اپنے کلام پر نظرثانی فرما لیتے تھے ۔ لیکن محض عیب چینی اور غلط قسم کی تنقید ناگوار خاطر ہوتی تھی ۔ البتہ منشی سراج الدین صاحب کی تنقید جو خالص علمی تنقید ہوتی تھی اور جس میں محاسن و معائب دونوں دکھائے جاتے تھے ، آپ ہمیشہ پسند فرماتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی اشاعت کو چنداں برا خیال نہ کیا اور اس پر چیں بہ جبیں نہ ہوئے ۔ یہ منشی صاحب کی نیک نیتی اور سخن شناسی کی دلیل ہے :

"لاہور - ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۵ع

مخدومی ــــ السلام علیکم

آپ کا والا نامہ ملا ۔ الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں ۔

''زمیندار'' میں آپ کا خط چھپ جانے کا ذمہ دار کسی حد تک میں خود اور زیادہ تر دفتر ''زمیندار'' ہے ۔ میں نے وہ خط مولوی عمادی صاحب کی خدمت میں اس واسطے ارسال کیا تھا کہ وہ اپنے ریویو میں اس تحریر سے مدد لیں ۔ مولوی عمادی ایڈیٹر ''زمیندار'' خود ایک ریویو لکھ رہے ہیں جو ہنوز ناتمام ہے ۔ مقصد اشاعت نہ تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ غلطی سے وہ تحریر ہی چھاپ دی گئی ۔ مجھے اس غلطی کے لیے سخت افسوس ہے ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ، میں نے ان کو یہی لکھا تھا کہ یہ ریویو ایک پرائیویٹ خط ہے ۔ اس میں بعض باتیں پتے کی تھیں اور میرا خیال تھا کہ مولوی صاحب کو ان کے پڑھنے سے مدد ملے گی مگر اس تحریر کی اشاعت کا ذمہ دار غالباً اسسٹنٹ ایڈیٹر ہے جسے معلوم نہ تھا کہ یہ پرائیویٹ خط دفتر میں کیوں بھیجا گیا ہے ۔

بہرحال اس ندامت کا بوجھ مجھ پر ہے ۔ میں مولوی صاحب سے ضرور استفسار کرتا مگر اس وجہ سے کہ محض لٹریری تنقید ہے اور چھپ چکی ہے ، جس کا علاج اب محال ہے ، اس واسطے میں نے ان سے استفسار نہ کیا ۔ اگر کوئی چارۂ کار ہو تو تحریر فرمائیے کہ اس کا علاج کیا جائے ۔

والسلام

آپ کا محمد اقبال''

اس بات کی طرف اشارہ شاید بے محل نہ ہوگا کہ پہلے خط میں اقبال نے منشی صاحب کو ''ڈیئر سراج'' کہہ کر مخاطب کیا لیکن بعد کے خطوں میں "برادرم" اور ''مخدومی'' لکھنا شروع کر دیا ۔ اس ذرا سی بات سے اُس خلوص اور بے پایاں محبت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے جو ایک کے متعلق دوسرے کے دل میں پرورش پاتی رہی۔

☆ ☆ ☆

۲۴

پنڈت امر ناتھ ساحر دہلوی

(۱۹۴۲ع)

پنڈت امر ناتھ ساحر، دلّی کے قابلِ فخر لوگوں میں سے تھے۔ وہ رئیس زادے تھے، رائے بہادر پنڈت جانکی ناتھ مدن کے خلفِ اکبر، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مشہور دیوان راجہ دینا ناتھ کے خاندان کے چشم و چراغ اور غالب کے عزیز شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ ۲۹ مارچ ۱۸۶۳ع کو بمقام بانس بریلی پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں پنڈت پرشاد راہ رازداں کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے اور اردو فارسی کی تعلیم حاصل کرتے ہی فارسی میں شعر کہنے لگے۔ مولانا عبدالحلیم عاصم کاشانی سے، جو فارسی کے زبردست ادیب اور شاعر تھے، فارسی میں مزید مہارت حاصل کی۔ ۲۲ برس کی عمر میں اجمیر تشریف لے گئے اور وہاں ریختہ پر توجہ فرمائی۔ پھر دہلی آ کر پنڈت جواہر ناتھ ساقی اور منشی رام رچپال سنگھ شیدا سے صحبت گرم رہی اور شعر و سخن کا مشغلہ ترقی کرتا گیا۔ شملہ جیسے پُر فضا مقام پر قدرت کے رنگا رنگ نظاروں

نے آپ کے شاعرانہ جذبات کو ابھارنے میں بہت مدد دی ۔ بقول صادق الخیری ''ان کا فارسی کلام اردو سے بہتر تھا اور اردو میں غزل کے موتی رولتے تھے ۔''[1]

مدتوں پنجاب میں تحصیل دار رہے ۔ تقریباً ۷۹ برس کی عمر پا کر ۱۹۶۲ع میں عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے ۔ ان کی رفتار و گفتار میں ایک عجیب دبدبہ اور انوکھا طنطنہ تھا ۔ پرانے بزرگوں کی طرح ان کی صورت بڑی بارعب تھی ۔ چہرے سے جلال ٹپکتا تھا ۔ ان کی وجاہت ان کی سفید لمبی ڈاڑھی کی وجہ سے اور بھی جاذب نظر ہو گئی تھی ۔ آواز میں گونج گرج تھی ۔ شعر خوب پڑھتے تھے ۔ تعصّب نام کو بھی نہ تھا ۔ چلن مسلمانوں کا سا تھا ۔ دل میں کشادگی اور نظر میں وسعت تھی ۔ ہر شخص ان کی عزت و تکریم کرتا تھا ۔

ساحر شاعری کے عاشق زار تھے ۔ پہلے پہل فارسی میں شعر کہتے تھے ، بعد ازاں اردو میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے ۔ مگر اتنے گہرے روحانی اور ادق عرفانی مضامین باندھتے تھے کہ عام آدمیوں کے پلے کچھ نہ پڑتا تھا ۔ حقیقت میں ان کی شاعری دماغ کی شاعری تھی جس میں فلسفیانہ باریکیاں اور تصوّف و ویدانت کے نکات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوتے تھے ۔ ہر شعر میں کچھ نہ کچھ غور و فکر کا سامان موجود ہوتا تھا ۔ غیب و شہود ، مکان و لامکان ، ذات و

۱۔ مضمون صادق الخیری دہلوی ، مطبوعہ روزنامہ ''حریّت'' کراچی ، ۱۱ دسمبر ۱۹۷۲ع ۔

صفات ، بقا و فنا ، روح و جسم ، حیات و ممات ، حدوث و قدم وغیرہ مسائل اور دیگر حقائقِ کائنات کے انکشاف کا کوئی نہ کوئی پہلو ہر وقت ان کے مدِ نظر رہتا تھا ۔ انداز متین اور استوار تھا ۔ کبھی کبھی پیچ و خم سے بات کہتے جو بادی النظر میں ناہموار معلوم ہوتی ۔[۱] دراصل بات یہ تھی کہ ہندو فلسفہ ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا اور وہ خود بھی دریائے معرفت کے حقیقی شناور تھے ۔ آخری عمر میں تو اللہ والے ہوگئے تھے ۔

ان کے والد پنڈت جانکی ناتھ مدن نے ''فلسفۂ الوہیت'' کے نام سے ''بھگوت گیتا'' کا نثر میں ایسا ترجمہ کیا کہ آج تک اس سے بہتر ترجمہ شائع نہیں ہوا ۔ ساحر کے چھوٹے بھائی پنڈت دینا ناتھ معجز نے ''بھگوت گیتا'' کا منظوم ترجمہ ''مخزنِ اسرار'' کے نام سے ، ''ادھوت گیتا'' کا ترجمہ ''ترانۂ مجذوب'' کے نام سے اور ''دشٹابکر گیتا'' کا ترجمہ ''پیامِ سالک'' کے نام سے کیا ۔ خود پنڈت امر ناتھ ساحر نے مندرجہ ذیل تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں جو طبع ہو چکی ہیں :

(۱) فلسفۂ توحید ــ ''وشنو پران'' کے مکمل چھ حصوں کا ترجمہ ۔

(۲) اسرارِ حقیقت (رموزِ معرفت) ــ سوامی شنکر اچارج کے ''تتو بدھ'' اور ''اتم بدھ'' کا ترجمہ ۔

(۳) جلوۂ جہاں نما ــ ''بھگوت گیتا'' کے گیارھویں ادھیائے کا منظوم ترجمہ ۔

۱۔ یادِ رفتگاں ، از جگر بریلوی ، صفحات ۳۰۳ - ۳۰۴ ۔

(۴) رازِ معرفت ــ علامہ فیضی کا کیا ہوا نثرِ فارسی میں ترجمہ ، جس میں ساحر کی تنقید بھی شامل ہے ۔

(۵) کفرِ عشق ــ اردو کلام کا مجموعہ جو ۱۹۳۷ء میں طبع ہوا ۔

(٦) چراغِ معرفت ــ ساحر کی فارسی غزلوں کا دیوان جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا ۔ اس کے سرورق پر جو دو شعر درج ہیں ، ان سے ساحر کے رنگِ سخن کا پتا چلتا ہے :

حیاتم نقش بندِ صورتِ موج است آب آسا
وجودم در نظر ہنگامۂ وہم است خواب آسا

(یعنی میری زندگی موج کی طرح پانی کی تصویر کش ہے ۔ میرا وجود نظروں میں خواب کی طرح وہم کا ہنگامہ ہے)

از تپِ عشق ہرکجا ، نیست فروغِ داغِ دل
باد سفید چشم بد ، ساحرِ سینہ چاکِ ما

(یعنی عشق کے تپ سے کہیں بھی دل کے داغوں میں روشنی نہیں رہی ۔ ساحر ! ہمارا سینہ چاک ہے اور نظرِ بد کی وجہ سے اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں) ۔

ساحر جب تحصیل داری سے وظیفہ پر سبکدوش ہو کر دہلی آئے تو انھوں نے اپنی لال حویلی میں مشاعرے کی طرح ڈالی ، جس میں ہر مذہب و ملت کے شاعر شریک ہوتے تھے ۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے دہلی تشریف لانے والے ادیب اور شاعر شاید ہی کبھی حضرت ساحر کی آستاں بوسی کے بغیر گئے ہوں ۔ وہ بہت خلیق اور

متواضع بزرگ تھے - ان کی مہمان نوازی مشہور تھی - جب کوئی برگزیدہ شاعر یا ادیب دہلی آتا اور ساحر کو معلوم ہو جاتا تو اس کو ضرور دعوت دیتے یا اس کی آمد کے سلسلے میں ایک مختصر سی بزمِ سخن منعقد کر لیتے - یوں بھی ہر مہینے کے آخری ہفتے میں ان کی حویلی میں مشاعرے ہوتے تھے -

پنڈت جی کی وضعداری کے بارے میں شاہد احمد دہلوی مرحوم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ چند لڑکے رات کے گیارہ بجے ان کے گھر پہنچے - کنڈی کھڑکی تو پنڈت جی ہاتھ میں لالٹین لیے زینے سے آترے - پوچھا : ''کیسے زحمت فرمائی؟'' لڑکوں نے کہا : ''ہمیں آپ کا کلام سننے کا بہت اشتیاق ہے - صبح کی گاڑی سے ہمیں واپس جانا ہے - اسی لیے بے وقت تکلیف دے رہے ہیں -'' پنڈت جی نے فرمایا : ''کیا مضائقہ ہے -'' پھر نہایت خندہ پیشانی سے سب کو اپنے ساتھ اوپر لے گئے - کمرہ کھول کر آرام سے بٹھایا ، جل پانی پیش کیا اور اپنا کلام سنا کر انہیں رخصت کرنے نیچے تک آئے -

سکول اور کالج کے طالب علم جب چاہتے پنڈت جی کو صدارت کے لیے لے جاتے - بعض بدتہذیب پنڈت جی سے بدتمیزی کر جاتے تو پنڈت جی ناراض ہوتے مگر فوراً مان بھی جاتے - کسی کالج کے مشاعرے میں ایک صاحبزادے نے پنڈت جی کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا :

یہ کہنا جا کے بیٹا اپنی ماں سے
کہ تم روٹھی ہو کیوں ابّا میاں سے

پنڈت جی کی آنکھیں اُبل پڑیں - بولے ”کیا مضائقہ ہے - صاحبزادے! تمھارے باپ سے شکایت کروں گا -“ دوسرے لڑکوں نے کہا: ”پنڈت جی! اس گستاخ کو معاف کر دیجیے، ہاتھ جوڑتا ہے -“ پنڈت جی مسکرا دیے اور بولے: ”اِدھر لاؤ اِسے، میں اس کے کان کھینچوں گا -“ پھر محبّت سے کان کھینچ کر بولے: ”کیا مضائقہ ہے - باادب بانصیب بے ادب بے نصیب - جاؤ -“

ایک دفعہ بلند شہر میں مشاعرہ تھا، پنڈت جی کی وساطت سے بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی کو بھی دعوت نامہ ملا - جب دہلی سے وہ بلند شہر روانہ ہونے لگے تو پنڈت جی نے منوّر سے فرمایا: ”بھائی دیکھنا، تم دہلی والوں کی طرف سے مشاعرے میں جا رہے ہو، دہلی کا خیال رکھنا -“ اتفاق سے منوّر لکھنوی کا مقطع نادانستہ طور پر یہ ہو گیا:

سخن میں مجھ کو نسبت لکھنؤ سے ہے کہ دلّی سے
منوّر فیصلہ اس بات کا اہلِ زباں کر لیں

مشاعرے کی صدارت ساحر صاحب ہی نے فرمائی - جب منوّر لکھنوی کے پڑھنے کی باری آئی اور اُنھوں نے مقطع پڑھا تو پنڈت جی نے چمکتی آنکھوں سے ان کی طرف گھور کر دیکھا اور فرمایا: ”کیوں صاحب! یہ بات ہے؟ کیا مضائقہ ہے!“

ایک دفعہ کسی کالج کے لڑکوں نے بھرے مشاعرے میں پنڈت جی کو مشورہ دیا کہ ڈاڑھی بہت لمبی ہو گئی ہے، اس میں ایک دو گرہیں دے لیجیے - اس بدتہذیبی سے دل برداشتہ ہو گئے اور

پھر کبھی مشاعرے میں شرکت نہیں کی ۔[۱]

ساحر کفر اور عشق کے امتزاج کے اس قدر دلدادہ تھے کہ انھوں نے اپنے اکثر اشعار میں ان دونوں مضمونوں کو یکجا کیا ہے :

حرمِ دائرۂ حسن ہے محور اپنا
مرکزِ عشق و فنا ہے دلِ کافر اپنا

میں لامذہب ہوں ، کفرِ عشق کا دلدادہ ہوں ساحر
مرا مشرب جدا ہے مشربِ شیخ و برہمن سے

ہے کافرِ عشقِ ازلی ساحرِ بےخود
ایمان کی ہے بات کہ پابندِ وفا ہے

ساحر تصوف کے ساتھ تغزل کا دامن بہت کم ہاتھ سے چھوڑتے تھے :

نوز پیکر ہے سراپا بتِ کافر اپنا
حسن ہے اپنا خدا ، عشق پیمبر اپنا

یہ شعر دراصل شاہجہانی عہد کے مشہور شاعر ملاؔ شیدا کے اس مطلع سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے :

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفّا جوہرے
حسن را پروردگارے ، عشق را پیغمبرے

۱- از مضمون صادق الخیری دہلوی ، مطبوعہ روزنامہ "حریّت" کراچی ، بابت ۱۱ دسمبر ۱۹۷۲ع ۔

چند اشعار اَور ملاحظہ ہوں :۔

گویا زبانِ حال تھی، ساحر خموش تھا
یہ سعیِ ضبط تھی ، وہ تقاضائے جوش تھا
بےحرف و صوت تھا مرا نظّارہ و کلام
رازِ و نیاز بےاثرِ چشم و گوش تھا

دُور جب دل سے حجابِ شبِ عصیاں ہوگا
چہرۂ شاہدِ مقصود نمایاں ہوگا
دلِ مضطر نہ تڑپ ، وصل کا ساماں ہوگا
چشمِ حیراں نہ جھپک ، جلوۂ جاناں ہوگا
ابھی دل ہے ،ابھی خوں ہے ،ابھی دریا ،ابھی ابر
ابھی قطرہ، ابھی دریا ، ابھی طوفاں ہوگا

عشّاق کا ضمیر ہے جامِ جہاں نما
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

لبِ منصور سے دی کس نے اناالحق کی صدا
تو اگر پردۂ پندار میں پنہاں نہ ہوا
دل مٹا پر نہ مٹا حرفِ محبّت دل سے
کفر اسلام ہوا ، مرکزِ ایماں نہ ہوا
دل ہے بت خانۂ اصنامِ خیالی ساحر
تو وہ کافر ہے کہ بھولے سے مسلماں نہ ہوا

دل کی تسکین کو کافی ہے پریشاں ہونا
ہے توکّل بخدا بے سر و ساماں ہونا
کور دیدہ ہے جسے دعویٔ بینائی ہے
شرطِ اوّل ہے یہاں دیدۂ حیراں ہونا
اے پری رُو ترے دیوانے کا ایماں کیا ہے؟
اک نگاہِ غلط انداز پہ قرباں ہونا
یوں تو ہر دین میں ہے صاحبِ ایماں ہونا
ہم کو اک بُت نے سکھایا ہے مسلماں ہونا

مگر مولانا شبلی فرماتے ہیں:

بُتانِ ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو
عطیّہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

مکاں کہیں تو مقرر ہو لامکاں کے لیے
نشاں کوئی تو معیّن ہو بے نشاں کے لیے
ملا ہے جسم ہمیں امتیازِ جاں کے لیے
بشر وجود میں آیا ہے امتحاں کے لیے
ہمارے دل میں یقیں کو ملی ہے گنجائش
کہ بس ہے وسعت کون و مکاں گماں کے لیے
چلی جو ساحلِ عمرِ رواں سے کشتیٔ تن
نفس سے کام مشیّت نے بادباں کے لیے

زندگی میں ہے موت کا نقشہ
جس کو ہم انتظار کہتے ہیں

آبِ رواں ہے ، کشتیٔ مے اور جامِ زر
سبزہ ہے ، گل ہے ، ابر ہے ، بادِ بہار ہے
موجِ طرب ہے ، جوش طبیعی ہے ، رنگِ شوق
سب کچھ ہے صرف ایک ترا انتظار ہے

مری دیوانگی روزِ قیامت میرے کام آئی
قلم رحمت کا کھنچا اس نے آخر میرے عصیاں پر

کیفِ مستی میں عجب جلوۂ یکتائی تھا
تو ہی تو تھا ، نہ تماشا نہ تماشائی تھا

ساحر کا دیوان ''کفرِ عشق'' جب پہلی مرتبہ جون ۱۹۳۷ء میں امپیریل پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپ کر چودھری محمد حسین کی وساطت سے اقبال تک پہنچا تو آپ نے ۲۶ ستمبر ۱۹۳۷ء کو اس کی رسید دیتے ہوئے پنڈت ساحر کو لکھا :

''آپ کا کلام تصوف اور ویدانت کے نکات سے لبریز ہے اور ہر پہلو سے آپ کے شایانِ شان ہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ دہلی ابھی تک اہلِ کمال سے خالی نہیں ۔

افسوس ! کہ ضعفِ بصارت کی وجہ سے ڈاکٹروں نے لکھنے

پڑھنے سے منع کر دیا ہے ، اس لیے یہ خط اپنے ہاتھ سے نہیں لکھ سکا ۔ اپنے لڑکے جاوید سے لکھوایا ہے ۔ معاف کیجیے گا ۔ دیوان کے بہت سے اشعار ایک دوست نے پڑھ کر سنائے ہیں ۔''[۱]

☆ ☆ ☆

۱۔ انوارِ اقبال ، مرتبہ بشیر احمد ڈار ، ص ۲۹۴ ۔
دیگر ماخذ ، (۱) یادِ رفتگاں ، از جگر بریلوی ، صفحات ۳۰۳ - ۳۰۴ ۔
(۲) چند منتخب ہندو شعرا : عبدالشکور ایم ۔ اے ، ص ۸۸ ۔
(۳) ہندوؤں میں اُردو ، حصہ اوّل ، دربارۂ نظم ، مرتبہ سیّد رفیق مارہروی ، صفحات ۳۲۷ - ۳۳۰ ۔
(۴) بہارِ گلشنِ کشمیر ، جلد اول ، صفحات ۳۷۷ - ۳۹۵ ۔

۲۵

شاطر مدراسی

(۱۹۴۳ء)

شمس العلما ابوالمعانی محمد عبدالرحمٰن شاطر ، مدراس کے رہنے والے تھے - آپ مولوی عبدالغنی خاں امیر کے فرزند اور سکندر جنگ بہادر اوّل پرنس آف ارکاٹ کے پوتے تھے - آپ کی دادی صاحبہ نواب انور الدین خاں شہید کے فرزند نواب والا جاہ فرمانروائے کرناٹک کی نواسی تھیں جو بڑی عالمہ اور زاہدہ خاتون تھیں - شعر بھی خوب کہتی تھیں - گیارہ حج کیے تھے - نظم و نثر میں پانچ ضخیم تصانیف ان کی یادگار ہیں - چھ ہزار بیت کی ایک قابلِ قدر مثنوی لکھی تھی جس کا جواب برِصغیر پاک و ہند میں شاید کوئی خاتون آج بھی پیش نہ کر سکے -

شاطر کے والد مولوی عبدالغنی خاں امیر نے پندرھویں برس میں ''قصہٗ یوسف زلیخا'' فارسی میں نظم کیا تھا اور سترہ سال کی عمر میں ایک طولانی قصیدہ عربی زبان میں لکھا تھا - یہ صنعتِ عاطلہ میں

(یعنی بے نقط) تھا اور بے حد مقبول و مشہور ہوا تھا ۔

اس لحاظ سے شاطر کو ماں کا دل اور باپ کا دماغ ورثے میں ملا تھا اور شاعری کا ملکہ خمیر میں داخل تھا ۔ نو دس برس کے سن ہی میں شعر کہنے شروع کر دیے تھے ۔ اردو ، عربی ، فارسی اور انگریزی زبانوں سے واقف تھے ۔ نواب صاحب ارکاٹ کے سیکریٹری بھی تھے اور مدراس ہائی کورٹ میں مترجم بھی رہے ۔ ''کارنامۂ دانش'' ان کی نظموں کا مجموعہ ہے ، جو فلسفۂ جدید اور مغربی سائنس کے دقیق اور معرکہ آرا مباحث پر مبنی ہے ۔ اس میں مذہب کے اہم مسائل پر محققانہ اور مجتہدانہ بحثیں کی گئی ہیں ۔ مولانا شبلی مرحوم نے اس کی نسبت لکھا ہے :

''علمی مضامین کو نظم میں اس طرح ادا کرنا بڑی استادی کا کام ہے ۔''

''اعجازِ عشق'' شاطر کی ایک اَور فلسفیانہ نظم ہے ۔ یہ ایک طویل رائیہ قصیدہ ہے جس میں قدیم و جدید فلسفیانہ مسائل و آراء سے الٰہیاتِ اسلامیہ کی تفسیر و تشریح کی گئی ہے ۔ اس کے بارے میں اس زمانے کے تقریباً سبھی مشاہیرِ شعر و ادب نے نہایت اچھی آراء کا اظہار کیا ہے ۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں :

حکیم سیّد ضامن علی جلال لکھنوی ، خان بہادر سیّد علی محمد شاد عظیم آبادی ، شمس العلماء مولوی الطاف حسین حالی پانی پتی ، شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد دہلوی ، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی ، لسان العصر سیّد اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی ، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ دہلوی ، مولوی سیّد وحید الدین سلیم پانی پتی ،

راقم الدولہ سیّد ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی ، علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، خان بہادر مرزا سلطان احمد ، پروفیسر سیّد عبدالغفور شہباز ، مولوی عزیز مرزا ، مولوی مرزا مہدی خاں کوکب ، مولوی سید امجد علی اشہری ، مولوی سیّد علی حیدر نظم طباطبائی لکھنوی ، شمس العلماء نواب عزیز جنگ بہادر ولا ، لسان العشق مولوی شیخ غلام قادر گرامی شاعرِ خاص حضور نظام ، نواب شمشیر بہادر اخگر رئیسِ اعظم اجے گڑھ ، رائٹ آنریبل ڈاکٹر سیّد امیر علی ، مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی ، مولوی نواب علی پروفیسر بڑودہ کالج ، سیّد کاظم حسین محشر لکھنوی ، مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی ، مولوی حکیم نور الدین ، چودھری خوشی محمد ناظر علیٰ ھذا القیاس۔

یہ نظم پہلی بار ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) میں شائع ہوئی اور اس کے بعد ترمیم اور اضافوں کے ساتھ کئی مرتبہ اشاعت پذیر ہوتی رہی ۔ ۱۹۰۹ء میں یہ مطبع نافع الاسلام میں چھپ کر مدراس یونیورسٹی کے میٹرک کے نصاب میں داخل ہوئی ۔ اقبال نے اس نظم پر جو تقریظ لکھی تھی ، وہ حسبِ ذیل ہے :

”اس قصیدے کا کچھ حصہ (رسالہ) ’مخزن‘ (لاہور) میں شائع ہو چکا ہے اور پنجاب میں عموماً پسندیدگی اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ ہمارے ایک کرم فرما جالندھر میں ہیں ۔ سنا ہے کہ وہ اس کو نہایت پسند کرتے ہیں اور اس کے اشعار کو انھوں نے اتنی دفعہ پڑھا ہے کہ اب ان کو وہ تمام حصہ ، جو ’مخزن‘ میں شائع ہو چکا ہے ، از بر ہے ۔ اکثر اشعار نہایت بلند پایہ و معنی خیز ہیں ۔ بندشیں

صاف اور ستھری ہیں اور اشعار کا اندرونی درد مصنّف کے چوٹ کھائے ہوئے دل کو نہایت نمایاں کر کے دکھا رہا ہے۔ آپ کا اسلوب واقعی نرالا ہے اور آپ کی صفائیِ زبان آپ کے ہم وطنوں کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ آپ اصل میں ہندوستان کے رہنے والے ہوں گے مگر یہ معلوم کر کے کہ آپ کی پرورش بچپن سے مدراس میں ہوئی، مجھے تعجب ہوا۔

محمد اقبال

۲۲ فروری ۱۹۰۵ء"

مولانا حالی نے تو حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اس نظم کے متعلق یہاں تک لکھ دیا تھا کہ:

"نہایت تعجب ہوا کہ احاطۂ مدراس میں ایسی صاف اور فصیح اردو، ایسی پاکیزہ نظم و نثر، ایسا لطیف اور صحیح مذاق کیونکر پیدا ہوا اور کہاں سے آیا؟ آپ کے اشعار میں یقیناً میں وہ چیز پاتا ہوں جو ترقی کر کے کمالِ شاعری کے درجے تک پہنچ سکتی ہے۔ بلامبالغہ و بلا تصنّع آپ کے بعض شعروں کو دیکھ کر رشک ہوتا ہے کہ کیوں یہ پیرایۂ بیان ہمارے ہاتھ نہ لگا۔ علی الخصوص اس شعر کی تو تعریف نہیں ہو سکتی:

بے محل اٹھتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم
کوئی ہے تجھ پر سوار اے ابلقِ لیل و نہار

یہی ایک شعر اعلیٰ درجے کی قابلیتِ شاعری پر دلالت

کرنے کے لیے کافی ہے۔"

(پانی پت، ۱۱ نومبر ۱۹۰۴ء)

اسی حوالے سے اقبال نے اپنی پہلی تحریر کے چند سال بعد پھر لکھا:

" 'اعجازِ عشق' کے چند صفحے تو میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ باقی اشعار بھی ماشاء اللہ نہایت بلند پایہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دولتِ شرافت کے ساتھ دولتِ کمال سے بھی مالامال کیا ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ آپ کے کلام میں ایک خاص رنگ ہے۔ اور شعراء میں بہت شاذ پایا جاتا ہے۔ مولانا حالی، شبلی، شاد جیسے قادر الکلام بزرگوں سے دادِ سخن گوئی لینا ہر کسی کا کام نہیں۔

محمد اقبال"

(سیالکوٹ، ۲۹ اگست ۱۹۰۸ء)

سرزمینِ مدراس کا یہ بلبلِ شیریں نوا وسط اپریل ۱۹۴۳ء میں ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ عمر ستّر کے قریب ہوگی۔[۱]

☆ ☆ ☆

۱۔ یادِ رفتگاں، از سیّد سلیمان ندوی، ص ۲۷۹۔

۲۶

منشی محمد الدین فوق

(۱۸۷۶ء — ۱۴ اگست ۱۹۴۵ء)

منشی محمد الدین فوق مدیر ''اخبار کشمیری'' لاہور، اقبال کے دوستوں اور ہم عصروں میں درجۂ اختصاص رکھتے تھے۔ وہ ادیب بھی تھے اور شاعر بھی، اخبار نویس بھی تھے اور مورخ بھی۔ اقبال کی طرح ان کا خمیر بھی محبّت کے ضامن سے اُٹھایا گیا تھا۔ دونوں کے آبا و اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں آباد ہوئے تھے۔ شاعری میں داغ دہلوی کے شاگرد ہونے کے ناتے سے بھی دونوں ایک ہی سلک میں منسلک تھے۔ دونوں کی دوستی لاہور میں پروان چڑھی اور دونوں اسی خاک میں آسودۂ خواب ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میں ان دونوں کے تعلقات پر مراسلات کے حوالے سے ایک تفصیلی مضمون لکھ چکا ہوں جو مجلہ ''اقبال'' لاہور کے اپریل ۱۹۶۰ء کے شمارے اور کتاب ''مطالعۂ اقبال'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اقبال بی۔ اے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو چکے تھے کہ فوق صاحب ۳۱ جنوری ۱۸۹۶ع کو گھڑتل (ضلع سیالکوٹ) سے ملازمت کی تلاش میں لاہور آئے۔ وہ بھاٹی دروازہ ، بازار حکیماں کی انجمنِ اتحاد کے مشاعروں کی دھوم سن کر وہاں پہنچے اور ان میں شریک ہوکر دادِ سخن دینے لگے۔ ایک مشاعرے میں ، جس کے لیے یہ طرح تجویز کی گئی تھی : ع

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا

اقبال نے وہ غزل پڑھی جس کے مقطع میں داغ کی شاگردی پر یوں فخر کا اظہار کیا ہے :

نسیم[1] و تشنہ[2] ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

اس میں فوق صاحب نے جو غزل پڑھی ، اس کے چند شعر یہ ہیں :

دیا ہرچند میں نے واسطہ گیسوے جاناں کا
نہ چھوڑا تار کوئی دستِ وحشت نے گریباں کا
بہائے آنکھ نے شرمِ گنہ سے اس قدر آنسو
کہ ہر اشکِ ندامت نے دکھایا جوش طوفاں کا
کلیجہ بھی ہے زخمی ، دل بھی ہے مجروح سینے میں
مزہ ہم نے اٹھایا ہے تمھارے تیر و پیکاں کا

---

۱ ، ۲- نسیم بھرت پوری اور تشنہ بلند شہری داغ کے ارشد تلامذہ تھے اور اپنے استاد ہی کے رنگ میں لکھتے تھے ، (تاریخِ اقوامِ کشمیر ، جلد ۳ ، ص ۲۶۳) -

''تصویر باغِ جانفزا'' کے اعداد ۱۸۵۱ ہیں ۔ ان میں ''سرِ نازش'' یعنی حرفِ نون کے ۵۰ عدد شامل کرنے سے کتاب کا سنہ طباعت ۱۹۰۱ع برآمد ہوتا ہے ۔

۱۹۰۴ع میں فوق صاحب نے لاہور کے ہندو و مسلمان صوفیوں اور بزرگوں کا تذکرہ ''یادِ رفتگاں'' کے نام سے شائع کیا ۔ اقبال نے یہ کتاب دیکھی تو فوق صاحب کو لکھا :

''اہل اللہ کے حالات نے ، جو آپ نے بنام ''یادِ رفتگاں'' تحریر فرمائے ہیں ، مجھ پر بڑا اثر کیا اور بعض بعض باتوں نے ، جو آپ نے اس چھوٹی سی کتاب میں درج کی ہیں ، مجھے اتنا رلایا کہ میں بے خود ہو گیا ۔ خدا کرے آپ کی توجہ اس طرف لگی رہے ۔ زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ ان لوگوں کے حیرت ناک تذکروں کو زندہ کیا جائے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے زوال کی اصل علّت حسنِ ظن کا دور ہو جانا ہے ۔ بھائی فوق ! خود بھی اس گوہرِ نایاب کی تلاش میں رہو جو بادشاہوں کے خزانوں میں نہیں مل سکتا بلکہ کسی خرقہ پوش کے پاؤں کی خاک میں اتفاقیہ مل جاتا ہے ۔''

(۷ اکتوبر ۱۹۰۴ع)

اسی کتاب سے متاثر ہو کر اقبال نے وہ غزل کہی جس کے چند شعر یہ ہیں :

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں ، زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی ! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں
تمنّا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انھی خلوت گزینوں میں

فوق صاحب کے کلام کے دو مجموعے — ''کلامِ فوق'' اور ''نغمہ و گلزار'' — چھپ چکے ہیں۔ ستمبر ۱۹۰۹ء میں پہلا مجموعہ

۱۳۵۹ھ

شائع ہوا ۔ اقبال نے اس کے مضامین کی تازگی اور زبان کی خوبیوں کا اعتراف ان اشعار میں کیا :

جب چھپ گیا مطبع میں یہ مجموعۂ اشعار
معلوم ہوا مجھ کو بھی حالِ نضر فوق
شستہ ہے زباں ، جملہ مضامین ہیں عالی
تعریف کے قابل ہے خیالِ نضرِ فوق
تاریخ کی مجھ کو جو تمنّا ہوئی اقبال
ہاتف نے کہا لکھ دے کمالِ نضرِ فوق

۱۳۲۷ھ

یہاں ''نضر'' بفتحِ نون ترو تازگی اور زیبائی وغیرہ کے معنوں میں

استعمال ہوا ہے۔[1] ''نظر'' استعمال کرنے سے سو عدد بڑھ جاتے ہیں اور تاریخ غلط ہو جاتی ہے۔

مئی ۱۹۱۷ء میں فوق صاحب کی کتاب ''راہنمائے کشمیر'' شائع ہوئی۔ اقبال نے اس کے محاسن کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

''کشمیر اور اہلِ کشمیر پر مختلف کتابیں لکھ کر آپ نے مسلمانوں پر اور ان کے لٹریچر پر احسان کیا ہے۔ البتہ کشامرہ کی قبرپرستی ایک ایسا مضمون ہے جس پر، جہاں تک مجھے معلوم ہے، آپ نے اب تک کچھ نہیں لکھا۔ اس طرف سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

رسالہ ''راہنمائے کشمیر'' جو حال میں آپ کے قلم سے نکلا ہے، نہایت مفید اور دلچسپ ہے۔ طرزِ بیان بھی دلکش ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ عام لوگوں کے لیے نہایت مفید ہوگا۔ افسوس ہے میں آج تک کشمیر کی سیر نہیں کر سکا لیکن امسال ممکن ہے کہ آپ کا رسالہ مجھے بھی ادھر کھینچ لے۔''

چنانچہ اس سال تو نہیں البتہ ۱۹۲۱ء میں اقبال کشمیر گئے اور انھوں نے کشمیریوں کی قبر پرستی کے متعلق یہ شعر کہا:

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ

بتے می تراشد ز سنگِ مزارے

۱۔ دیکھیے فرہنگ انندراج، جلد سوم، ص ۵۸۲۔ نیز تسہیل العربیہ، ص ۸۵۸۔ لغاتِ کشوری، ص ۵۹۹، حرفِ نون مع ضاد۔

۱۹۲۰ء میں فوق صاحب نے کتاب "تاریخ حریت ِ اسلام" شائع کی جسے اقبال نے فوق صاحب کی بہترین تصنیف قرار دیا اور اس کے بارے میں لکھا :

"فوق صاحب کو اسلامیات سے ہمیشہ شغف رہا ہے ۔ اس سے پہلے آپ کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں لیکن حق یہ ہے کہ "تاریخ ِ حریت ِ اسلام" آپ کی بہترین تصنیف ہے ۔ دلیری اور بے باکی سے اعلان ِ حق کرنا گزشتہ مسلمانوں کی سیرت کا ایک نمایاں پہلو تھا مگر افسوس کہ عصر ِ حاضر کے عام مسلمان تاریخ ِ اسلام سے بالکل بے بہرہ ہیں ۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ بھی موٹے موٹے واقعات سے بے خبر ہیں ۔ ان حالات میں فوق صاحب کی تصنیف پنجاب کے اسلامی لٹریچر میں ایک قابل ِ قدر اضافہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ کوئی مسلمان خاندان اس بیش بہا کتاب کے مطالعے سے محروم نہ رہے گا ۔ اسلامی اسکولوں اور کالجوں کے کتب خانے خاص طور پر اس کے مطالعے کی طرف توجہ کریں ۔ اس زمانے میں جب کہ جمہوریت کی روح ہندوستان میں نشو و نما پا رہی ہے ، دیگر اہل ِ ملک کے لیے بھی یہ کتاب سبق آموز ہوگی ۔"

اقبال کا یہ شعر اسی کتاب کا خلاصہ معلوم ہوتا ہے :

آئین ِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

۱۹ دسمبر ۱۹۲۲ء کو اقبال نے فوق صاحب کو مشورہ دیا :

''شبابِ کشمیر' ضرور لکھیے۔ بہت مفید کتاب ہوگی۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کشمیر کے لوگوں میں خود داری کی روح پیدا کی جائے۔ میں نے بھی ایک نظم اس مضمون پر لکھی ہے جو عنقریب فارسی مجموعہ (پیامِ مشرق) میں شامل ہوگی۔ افسوس ہے کہ مجھے تاریخِ کشمیر سے بہت کم آگاہی ہے۔''

چنانچہ ۱۹۲۸ء میں جب فوق صاحب نے کتاب ''شباب کشمیر'' شائع کی جس میں اسلامی عہد ــــ بالخصوص سلطان زین العابدین عرف بڈ شاہ بادشاہِ کشمیر کے عہد ــــ کی علمی ، ادبی ، سیاسی ، روحانی ، صنعتی ، تجارتی ، معاشرتی اور تمدنی ترقیوں کی پوری کیفیت سامنے آ جاتی ہے ، تو اقبال نے فرمایا :

''آپ کی کتاب "شبابِ کشمیر" کشمیر کی تاریخ میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عام لوگ بالخصوص اہالیِ کشمیر اسے شوق سے پڑھیں گے۔ اس سے پہلے بھی جو لٹریچر آپ نے کشمیر کے متعلق پیدا کیا ہے ، میرے نزدیک بہت مفید اور آپ کے علمی ذوق اور حُبِ وطن پر شاہدِ عادل ہے۔''

فوق صاحب کی انھی خدماتِ کشمیر سے متاثر ہو کر اقبال انھیں ''مجددِ کشامرہ'' کہا کرتے تھے۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ اقبال ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اولیاے کرام اور صوفیاے عظام سے دلی عقیدت و ارادت

رکھتے تھے ۔ اس کے باوجود وہ ایسے صوفیوں اور پیروں سے سخت متنفّر تھے جو روحانیت میں ترقی کرنے کی بجائے اپنا پیشہ گرداوری بلکہ گداگری بنا لیتے ہیں اور اپنے مریدوں پر سالانہ ٹیکس لگا کر ان کا خون چوستے ہیں ۔ وہ دوسروں کو تو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ دنیا مردار ہے ، کافروں کے لیے ہے ، مومنوں کو عیش و راحت بہشت میں ملے گی ، لیکن خود دنیا طلبی میں مبتلا ہو کر محل کھڑے کرتے ہیں ، عالی شان عمارتیں بنواتے ہیں اور جائدادیں خریدتے ہیں ۔ چنانچہ ان کے کلام میں جابجا اس قسم کے اشارے پائے جاتے ہیں :

ہم کو تو میسّر نہیں مٹّی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

یا پھر :

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی ، نہ محبت ، نہ معرفت ، نہ نگاہ

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ :

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال
مُلاّ کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مُردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست ، نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

''شرابِ الست'' بے عملی کا بہانہ بنی اور مسلمان یہ کہہ کر کہ ''قسمت کا لکھا ہی ایسا تھا'' زندگی کی کشمکش سے بھاگ کھڑا ہوا ۔ چنانچہ

جمود و خمود نے اس کے قوائے عمل پر اپنا تسلّط جما لیا :

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی "شرابِ الست"
فقیہہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

نتیجہ یہ ہوا کہ جس قرآنِ پاک کی تعلیم نے مسلمانوں کو مہ و پروین کا امین بنا دیا تھا، اب اسی سے ترکِ جہان کی تعلیم اخذ کی جانے لگی :

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیں
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

غرض اقبال کی نظر میں مسلمان خود اپنے کو اور اپنے خدا کو فریب دے رہا ہے :

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں، بنا کے تقدیر کا بہانہ

خیر یہ باتیں تو محض اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔ مقصدِ بیان یہ ہے کہ حضرت علامہ اقبال نے اپنے دوست منشی محمدالدین فوق سے کئی دفعہ

کہا کہ اس قسم کا کوئی رسالہ جاری کریں جس سے فرقۂ صوفیا کی اصلاح ہو سکے ۔ ان کی غلط تعلیم نے مسلمانوں کو مُردہ دل بنا دیا ہے ۔ وہ مسلمانوں کے سامنے ایسا اسلام پیش کرتے ہیں جس پر صدہا غلاف چڑھے ہوئے ہیں ۔ جب یہ خود ہی اسلام کی روح سے واقف نہیں تو اپنے مریدوں کو خاک تعلیم دیتے ہوں گے ۔ ان کو راہِ راست پر لانے اور ان میں عشقِ الٰہی کی گرمی پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے ۔ آخر گفتار کے غازی نے کردار کے غازی کو قائل کر ہی لیا اور اگست ۱۹۱۴ع میں فوق صاحب نے رسالہ ''طریقت'' جاری کر دیا ۔ پہلے پرچے میں ابوالاعجاز حضرت احسان شاہجہانپوری ، خواجہ حسن نظامی دہلوی ، لسان العصر اکبر الہ آبادی ، خان احمد حسین خان مدیرِ ''شبابِ اردو'' ، مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد ، خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی جیسے نامور بزرگوں کے مضامینِ نظم و نثر کے علاوہ ایک دلچسپ مکالمہ بھی شائع ہوا جو اقبال اور فوق کے درمیان ہے ۔ فوق صاحب کے اپنے ادارتی مضمون سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے پرچہ نکالنے سے قبل حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر صوفیائے کرام ، تصوّف ، مراسمِ عرس ، ضرورتِ مرشد اور زیارتِ قبور وغیرہ کے متعلق ان کے خیالات دریافت کیے ۔ اقبال نے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ انھوں نے لکھ لیا اور ان کی نظر ثانی کے بعد رسالے میں درج کر دیا ۔ اقبال نے اپنے ان جوابات میں حقائق و معارف کے دریا بہائے ہیں ۔ یہ سب باتیں میرے مضمون ''اقبال اور طریقت'' میں دیکھی جا سکتی ہیں جو مجلۂ 'اقبال ریویو' کراچی میں شائع ہو چکا ہے ۔

رسالۂ ''طریقت'' کی علمی سطح بہت بلند تھی اس لیے ملک کے گوشے گوشے میں اس کی پذیرائی ہوئی ۔ اقبال اپنے لگائے ہوئے پودے کو پھلتا پھولتا دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ فوق صاحب کاروبار میں زیادہ مصروف رہنے کے باعث کچھ عرصہ ان کی ملاقات کو نہ جا سکے ۔ اس پر اقبال نے لکھا ''. . . آپ کبھی ملتے ہی نہیں ۔ اب تو آپ پیرِ طریقت بھی بن گئے ۔''[1]

خواجہ حسن نظامی دہلوی کا مدت سے یہ دستور تھا کہ وہ روحانی یادگار کے طور پر ہر سال بعض آدمیوں کو کسی علمی کارگزاری ، انسانی خدمت یا خلوصِ قلب کے صلے میں خطابات دیا کرتے تھے ۔ جنوری ۱۹۱۵ء (۱۳۳۳ھ) کے ''طریقت'' سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال انھوں نے اقبال کو ''سرّالوصال'' کا اور فوق صاحب کو ''وحدتی'' کا لقب عطا کیا ۔ یہ انھی خدمات کے اعتراف میں تھا جو وہ ''طریقت'' کے ذریعے اسلام ، تصوف اور صوفیوں کی کر رہے تھے ۔

چار پانچ سال تک یہ رسالہ بڑی شان سے نکلتا رہا ۔ فوق صاحب خود بھی صوفیا کی مجلسوں میں بلائے جاتے رہے ۔ آپ نے تصوف کے متعلق کئی مفید کتابیں لکھیں جن میں ''تذکرۃ الصالحین'' ، ''تذکرۂ علمائے لاہور'' ، ''حیاتِ گنج بخشؒ'' ، ''ناصحِ مشفق'' ، ''لمعہ عارفہ'' اور ''وجدانی نشتر'' وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں ۔ ''وجدانی نشتر'' کا نام اقبال نے ''سوز و گداز'' تجویز کیا اور اسے بہت

۱۔ رسالۂ نقوش ، مکاتیب نمبر ، جلد اوّل ، ص ۲۹۴ ۔

پسند کیا ۔ اس کی نسبت اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا :

''مولوی محمدالدین فوق ایک صاحبِ ذوق آدمی ہیں ۔ ان کی جدّت پسند طبیعت ہمیشہ انوکھی باتوں کی تلاش میں رہتی ہے ۔ حال ہی میں انھوں نے ایک کتاب موسوم بہ ''وجدانی نشتر'' لکھی ہے جس میں ایسے عربی ، فارسی ، اردو ، پنجابی اشعار جمع کر دیے ہیں جو تاریخی اعتبار سے ایک خاص اثر اور سوز وگداز کا باعث ہوئے ہیں ۔ اس کتاب کی تالیف میں ان کو محنت کرنی پڑی ہوگی ، مگر مولوی محمدالدین محنت سے گھبرانے والے نہیں ۔ کتاب نہایت اچھی ہے اور دلچسپ ۔ فوق کی تلاش قابلِ داد ہے اور انسانی قلب کی گوناگوں کیفیات پر نظر ڈالتی ہے ۔''

(۲۳ دسمبر ۱۹۱۵ء)

اسی اثنا میں اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' شائع ہوئی ، جس میں انھوں نے مسلمانوں کو عرفانِ نفس ، تعیّنِ ذات اور قوّتِ عمل کا احساس دلاتے ہوئے فلسفۂ اشراق ، عجمی تصوّف اور صوفیانہ شاعری پر تنقید کی کہ انھی چیزوں کے اثر سے مسلمانوں کی پوری قوم قوّتِ عمل سے یکسر محروم ہوگئی ہے ۔ چونکہ یونان میں فلسفۂ اشراق پھیلا اور ایران میں تصوّف ، اس لیے حکیم افلاطون یونانی اور حافظ شیرازی کا ذکر بھی آیا : اور یہ ذکر کسی حد تک ناگزیر بھی تھا ۔ چنانچہ اقبال نے تصوّف کے بعض معتقدات سے اختلاف کرتے ہوئے انھیں بُز اور گوسفند قرار دیا ۔ اس پر طبقۂ صوفیا بھڑک اٹھا اور ہر طرف سے اس مثنوی کی مخالفت میں مضامین شائع ہونے لگے ۔

اقبال نے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے بہت سے مضامین خود بھی لکھے۔[1]

اقبال کے گہرے دوست ہونے کی وجہ سے اہلِ طریقت فوق صاحب سے بھی بدظن ہوگئے اور انھوں نے رسالے کا مقاطعہ شروع کر دیا۔ آخر یہ رسالہ کسی طرح سنبھل نہ سکا اور جتنی جلدی یہ ترقی کی طرف بڑھا تھا اتنی ہی جلدی بند ہوگیا۔

اس کے بند ہوتے ہی فوق صاحب نے اسی طرز کا ایک اور رسالہ ''نظام'' جاری کر دیا مگر اقبال کو ''طریقت'' کے بند ہونے کا افسوس ہی رہا۔ فروری ۱۹۱۹ء میں رسالۂ ''نظام'' کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ اس میں ''مکافاتِ عمل'' کے عنوان سے اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار درج تھے جو اقبال کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں:

ہر عمل کے لیے ہے ردِ عمل
دہر میں نیش کا جواب ہے نیش

شیر سے آسمان لیتا ہے
انتقامِ غزال و اشتر و میش

سرگذشتِ جہاں کا سرِ خفی
کہہ گیا ہے کوئی نکو اندیش

''شمع پروانہ را بسوخت ولے
زود بریاں شود بروغنِ خویش''

۱۔ اس سلسلے میں میرا مضمون ''معرکۂ اسرارِ خودی'' مجلہ 'اقبال' لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ع کو، اقبال کی وفات کے روز، فوق صاحب سخت بیمار تھے۔ انھیں نہایت تیز بخار تھا مگر اس کے باوجود اسلامیہ کالج گراؤنڈ تک چلے گئے، جہاں تمام لوگ جمع تھے۔ وہاں سے جنازے کے ہمراہ بادشاہی مسجد تک گئے اور جب تک انھیں سپردِ خاک نہ کر دیا گیا وہاں سے نہ ہلے۔ اس کے بعد جب تک زندہ رہے، اپنے دوست کا ماتم کرتے اور ان کی یاد کو سینے سے لگائے رہے۔ دیکھیے ایک غزل میں ان کی مفارقت کا ذکر کس حسرت سے کرتے ہیں:

اجل اس مردِ حق آگاہ کو بھی لے گئی یا رب!
حقیقت کا جسے بھیجا بنا کر ترجماں تو نے
ہوئے جس مے سے اسرارِ خودی و بے خودی ظاہر
نہ پلوائی کبھی وہ مے مجھے پیرِ مغاں تو نے

ایک اور غزل میں فرماتے ہیں:

قوم سے جاتا رہا وہ قوم کا اقبال بھی
فطرتِ حق کا جسے کچھ رازداں سمجھا تھا میں
یا اسے سمجھا تھا میں "پیغمبرِ دینِ خودی"

۱۹۳۸ع

یا چراغِ "محفلِ ہندوستاں" سمجھا تھا میں

۱۹۳۸ع

۱۳ اگست ۱۹۴۵ع کو فوق صاحب خود بھی اپنے حبیب سے جا ملے۔

☆ ☆ ☆

۲۷

مولانا عبداللہ عمادی

(۱۹۴۷ء)

مولانا عبداللہ عمادی بڑے فاضل اور جامع کمالات بزرگ تھے۔ وہ جونپور کے ایک گاؤں امرتھوا کے رہنے والے تھے اور اپنے صاحبِ فضل و کمال مورثِ اعلیٰ شیخ عماد الدین سے نسبی تعلق رکھنے کی وجہ سے ''عمادی'' کہلاتے تھے۔ کہیں کہیں اخفائے نام کی غرض سے عبداللہ کا فارسی ترجمہ ''خدا بندہ'' بھی لکھا ہے۔ اس خاندان کے لوگ تقریباً ساڑھے چار سو برس سے افادۂ علوم میں مشغول چلے آتے ہیں۔

عمادی صاحب نے علمی شیفتگی کے اسی ماحول میں آنکھ کھولی۔ گھر میں عربی بولی جاتی تھی۔ قرآن و حدیث اور صرف و نحو کی ابتدائی تعلیم دادی، دادا اور اپنے والد سے حاصل کی۔ درسیات کا دور مولوی ہدایت اللہ خاں رامپوری کے ہاں ختم کیا اور فنونِ ادب محمد طیب (م: ۱۹۱۶ء) سے رامپور میں جا کر حاصل کیے۔ پھر طب کی مشہور کتاب ''القانون'' دلی جا کر حکیم عبدالمجید خاں سے پڑھی اور

لکھنؤ میں مولوی عبدالحئی فرنگی محلی کے ممتاز شاگرد مولوی عبدالعلی آسی کے دامنِ تربیت میں فکر و نظر کی مزید وسعتیں حاصل کیں ۔ آسی صاحب ادب و شعر اور تاریخ گوئی میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے ۔ ان کی صحبت میں مولانا عمادی کو شعر و سخن اور ادب و تاریخ کا فیض حاصل ہوا ۔ مولانا آسی نے لکھنؤ کے محلہ محمود نگر میں ایک پریس قائم کیا تھا ، جس کا نام اصح المطابع تھا ۔ اس مطبع میں عربی فارسی کی بہت سی کتابیں طبع ہوئیں ۔ مولانا آسی کو کتابوں کی تصحیح میں کمال حاصل تھا ۔ انھوں نے اپنے شاگرد کو بھی اس کام میں طاق کر دیا ۔ اس طرح وہ اردو ، فارسی اور عربی کی نثر و نظم اور لغات گویا گھول کر پی گئے ۔ حافظہ بلا کا تھا ۔ کتاب کوئی بھی ہو ، ایک دفعہ نظر سے گزر جائے ، پھر کیا مجال کہ اس کے مضامین ذہن سے اتر جائیں ۔ بلکہ بعض خاص جملے اور فقرے تو لفظ بہ لفظ یاد رہتے ۔ سیّد سلیمان ندوی سے ایک دفعہ انھوں نے خود فرمایا تھا :

> ''وہ عربی کی الف لیلہ سمجھتے نہیں تھے مگر پھر بھی اس کو دیکھا کرتے اور جو کچھ سمجھ جاتے اس پر خوش ہوتے اور جو نہ سمجھتے اس کو لغت سے حل کرتے یا شاید مولانا آسی سے دریافت کرتے ۔ اس طرح ان کو عربی انشا پردازی کا ذوق پیدا ہوا اور عربی میں مضمون نویسی کی قدرت حاصل ہوئی ۔''[1]

یہ اس زمانے میں غیر معمولی بات تھی ۔ چنانچہ مکتبی علما

۱- یادِ رفتگاں ، از سیّد سلیمان ندوی ، ص ۲۹۸ ۔

میں مولانا عمادی پہلے شخص تھے جنھوں نے بیرونِ ہند کی صحافت سے ناطہ جوڑا اور مصر و بیروت کے رسالوں اور اخباروں میں مضامین لکھے ۔ مولانا آسی نے گھر میں گنگا بہتی دیکھ کر یہ مناسب سمجھا کہ یہ ابرِ کرم ، جو باہر برستا ہے ، گھر ہی میں کیوں نہ برسے ۔ انھوں نے پہلے ''الریاض'' نام کا ایک عربی ماہنامہ جاری کیا ، پھر عبدالوالی صاحب کے اہتمام سے ''البیان'' جاری کر دیا ۔ اس کے ایک حصے میں ہندوستان کی تاریخ و رجال اور حالاتِ حاضرہ پر عربی میں مضامین ہوتے تھے ، دوسرے میں عرب اہلِ قلم کے مضامین بالترجمہ درج ہوتے تھے اور تیسرے حصے میں اسلامی ملکوں کے حالات اور خبریں ہوتی تھیں ۔ ہندوستان سے زیادہ مصر ، بیروت ، شمالی افریقہ ، ٹیونس ، الجزائر اور مراکش میں اس رسالے کی مانگ ہوئی ۔ چنانچہ سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں :

''بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں آسی کی رہبری اور ان کی ایڈیٹری میں ''البیان'' نام ایک اردو عربی ماہنامہ مطبع اصح المطابع لکھنؤ سے نکلنے لگا ۔ اس کے ہر صفحے میں دو کالم ہوتے تھے ۔ ایک میں عربی اور دوسرے میں اس کا اردو ترجمہ ہوتا تھا اور آخر میں چند صفحے عربی ممالک کی خبروں اور مضمونوں کے ہوتے تھے ۔ اس رسالے کا مبادلہ مصر و شام اور ٹیونس کے عربی اخباروں سے ہوتا تھا ۔ یہ اخبارات ان کے ہاں آتے تھے اور وہ ان کو پڑھا کرتے تھے اور اس کی بدولت جدید عربی کے نئے الفاظ سے ان کو پوری واقفیت ہوتی رہتی تھی اور وہ ان کو اردو

میں رواج دینے کی کوشش کرتے تھے - چنانچہ ان کے بعض
الفاظ رواج بھی پاگئے -"۱

یہیں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی مدرسِ دارالعلوم ندوہ اور ان کے شاگردِ رشید مولانا شبلی نعمانی سے راہ و رسم پیدا ہوئی - ندوہ کا علمی رسالہ "الندوہ" جو پہلے شاہجہان پور سے شائع ہوتا اور آگرہ میں چھپتا تھا ، اب اصح المطابع میں چھپنے لگا - ۱۹۰۶ء میں مولانا شبلی نے اس کی سب ایڈیٹری کا کام مولانا ابوالکلام آزاد کے سپرد کیا - چند ماہ کے بعد جب وہ اخبار "وکیل" امرتسر میں چلے گئے تو مولانا عمادی صاحب کو اس کا سب ایڈیٹر مقرر کر دیا - اس زمانے میں انھوں نے اعجاز القرآن ، جابر بن حیان مشہور عرب کیمیادان اور ابنِ خلدون وغیرہ پر چند علمی مضامین لکھے -

۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء میں مولانا ابوالکلام اپنے والدِ ماجد کے مرض الموت کے سبب "وکیل" کی ادارت چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے تو "وکیل" کے مالک غلام محمد نے مولانا عمادی کو ان کی جگہ بلا لیا اور وہ کئی سال امرتسر میں رہے - وہاں انھوں نے سرسیدؒ کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" کو پھر سے زندہ کیا اور کئی نمبر اس کے نکالے - نیز سرسیدؒ کے بعض رسالے بھی دوبارہ طبع کیے - خود جو رسالے اس سلسلے میں لکھے ، ان میں تاریخ عرب قدیم ، محکمات ، علم الحدیث ، فلسفۂ القرآن ، فلسفۂ ابنِ عربی اور صناعۃ العرب بہت مشہور ہیں - چند کتابوں کے ترجمے بھی کیے ، جن میں مفتی محمد عبدہٗ کی کتاب

۱- یادِ رفتگاں ، از سیدؒ سلیمان ندوی ، ص ۳۹۸ -

''الاسلام والنصرانیہ''، شیخ عبدالعزیز شادیش کی ''الاسلام دین الفطرۃ'' اور امام راغب کی ''تفصیل انشاء تین و تحصیل السعادتین'' شامل ہیں۔

۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے 'الہلال' جاری کیا تو مولانا عمادی کو بھی وہیں بلا لیا۔ اس زمانے میں انھوں نے جو مضامین لکھے ان میں اسوۂ نوح، اسوۂ ابراہیمی اور کشف ساتین بڑے معرکے کے تھے۔ کچھ عرصے بعد مولانا عمادی اخبار ''زمیندار'' میں چلے آئے۔ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء (۲۸ ذیحجہ ۱۳۳۲ھ) کو مولانا شبلی کا اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حالی کا انتقال ہوا تو اس سلسلے میں مولانا عمادی نے ''زمیندار'' میں نہایت پُراثر مضامین لکھے اور دوسروں سے بھی لکھوائے۔ اقبال نے بھی مولانا شبلی کی لوحِ مزار کے لیے یہ تاریخی جملہ انھی کی فرمائش پر تجویز کیا تھا، جو ۱۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کے روزنامہ ''زمیندار'' میں شائع ہوا:

''امام الہند والا نژاد شبلی طاب ثراہ''

۱۳۳۲ھ

۱۹۱۴ء کی پہلی جنگِ عظیم چھڑتے ہی ہندوستان کی انگریزی حکومت نے پیش بندی کے طور پر روزنامہ ''زمیندار'' کی اشاعت روک کر مولانا ظفر علی خاں کو ان کے گاؤں کرم آباد میں نظر بند کر دیا۔ مولانا ظفر علی خاں پنجاب کے پہلے اخبار نویس تھے، جنھوں نے برطانوی سامراج سے ٹکر لی تھی۔ ان کا حق گو اور بے باک قلم استعمارِ فرنگ کی دھجیاں اڑاتا تھا۔ نظر بندی ان کے لیے موت سے کم نہ تھی۔ وہ کچھ عرصہ تو خاموش رہے لیکن پھر سیاست سے کنارہ کشی کا وعدہ کر کے ہفتہ وار ''ستارۂ صبح'' کی اجازت حاصل

کی اور کرم آباد سے یہ پرچہ جاری کردیا ۔ فرائضِ ادارت کی انجام دہی کے لیے مولانا عبد اللہ عمادی کو مددگارِ اوّل اور خواجہ عبدالحئی کو مددگارِ دوم مقرر کیا ۔ ان تینوں کی متفقہ کوشش سے پرچہ بے حد کامیاب ہوا اور لوگوں نے اس کی خاطرخواہ پذیرائی کی ۔

لاہور کے ایک رئیس نے یہ دیکھ کر کہ ''ستارۂ صبح'' خوب چمک رہا ہے ، اس کے مقابلے میں اپنا اخبار ''الصباح'' کے نام سے جاری کیا اور مولانا عمادی کو طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر ''ستارۂ صبح'' کی ادارت سے توڑ لیا ۔ اب ''الصباح'' نے اپنا بازار گرم کرنے کے لیے ''ستارۂ صبح'' سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور اپنی ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۷ع کی اشاعت میں یوں اعلانِ جنگ کیا :

صبوحی کے چند قطرے

دہقانِ مے فروش کی چشمِ سیاہ مست
اب تو مئے طہور کو دینے چلی شکست
اسلام اس کے ناز کا سرمشقِ انصرام
الحاد اس کی شان کا ممنونِ بندوبست
شیخ اس سے شادکام تو رند اس کے ہیں غلام
''معشوقِ ما بشیوۂ ہر کس موافق است
با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد''

اس کا جواب مولانا ظفر علی خاں نے ''ستارۂ صبح'' میں یوں دیا :

شیشۂ الحاد میں تقوے کی پری

سنا ہے کہ اُتری ہے شیشے کے اندر
نئی اک پری ، نام جس کا ہے "تقویٰ"
پلاتی ہے بھر بھر کے جامِ صبوحی
کہ ہو اس کی تاثیر سے چشمِ حق وا
کروں میں بھی اس شیشے کی سیر لیکن
مجھے ڈر ہے مجھ کو نہ ہو جائے لقوا

علامہ عمادی ان تین نشتروں کی تاب نہ لا سکے - وہ ان کی خلش سے بے تاب ہو گئے - بلبلا اٹھے اور انھوں نے "الصباح" کی اگلی اشاعت میں ترکشِ ادب سے تیر نکالتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں کے دل کی تواضع اس طرح فرمائی :

اب تک تو یہ سمجھے ہوئے تھے آپ کے دل سوز
ہے مسخرگی بزمِ حریفاں میں دل افروز
اب آپ کو وعظوں میں بھی اصرار ہے اس پر
اللہ و نبیؐ پر بھی کوئی وار ہو دل دوز
مذہب کی یہ تضحیک ہو ، یہ بے ادبی ہو
پھر کیوں نہ ہو ، ملّت کے تو ہیں آپ ادب آموز
بھانڈ آپ اگر بننے چلے ، شوق سے بنیے
منبر پہ ہے کس واسطے وعظِ ستم اندوز
"رو مسخرگی پیشہ کن و ھزل بیاموز
تا دادِ خود از کہتر و مہتر بستانی"

اس کا جواب ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے "ستارۂ صبح" میں مولانا ظفر علی خاں کی طرف سے بہ اشعارِ ذیل شائع ہوا:

اللہ کی قدرت کا تماشا ہے کہ کل تک
الزام وہ دیتے تھے مجھے بُت شکنی کا
کہتے تھے کہ امرت کی ہر اک بوند میں ہے زہر
ہوتا تھا جو چرچا مری شیریں سخنی کا
مرتے تھے خود اس طفل برہمن کی ادا پر
جس کا مژہ ہمزاد ہے نیزے کی انی کا
لیتے تھے مزے اس لبِ جاں بخش کے دن رات
ہوتا ہے گماں جس پہ عقیقِ یمنی کا
ٹپکے مرے آنسو بھی جب اس طفل کے غم میں
اور ان کو ملا مرتبہ ہیرے کی کنی کا
افسانہ سنایا مرے دل نے بھی تڑپ کر
جب اس نگہِ ناز کی ناوک فگنی کا
سوجھا انھیں یہ طعنۂ نورستہ یکایک
دشمن ہے یہ کم بخت رسولِ مدنی کا
مذہب سے ہے بیزار یہ گمراہ، اور اسلام
ہے شکوہ گزار اس کی دریدہ دہنی کا
منصب مجھے ہوتا ہے عطا از رہِ الطاف
الحاد کے دربار کی صدر انجمنی کا
فرماتے ہیں اسلام کا رستہ نہیں محفوظ
بے چارے مسافر کو ہے ڈر راہ زنی کا

گھر گھر مری یزداں نشناسی کی بڑی دھوم
نظارہ بنے آپ مری اہرمنی کا
دونوں سے کیا آپ کے احساں نے سبکدوش
رکھا نہ مجھے دیں کا، نہ دنیائے دنی کا
اک جانِ حزیں رہ گئی ہے، لیجیے وہ بھی
حق اس پہ ہے کیا آپ کی گردن زدنی کا

(نگارستان)

علامہ عمادی کے قلبِ صافی پر ان اشعار کا بے حد اثر ہوا۔ جن رئیس صاحب کے فریب دینے سے آپ ''ستارۂ صبح'' سے علیحدہ ہوئے تھے، ان سے آپ نے فوراً قطع تعلق کر لیا اور ''ستارۂ صبح'' کے دفتر میں واپس آ کر پہلے کی طرح مولانا ظفر علی خاں کے ادبی رفیق بن گئے۔

اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' کی اشاعت پر جو قلمی جنگ چھڑی تھی، اس میں مولانا عمادی نے کھل کر اقبال کا ساتھ دیا اور مثنوی کے محاسن پر چند نہایت اچھے مضامین لکھے، جو روزنامہ ''زمیندار'' میں شائع ہوئے۔

۲ ستمبر ۱۹۱٦ء کے ایک خط میں علامہ اقبال نے مولانا عمادی کا تعارف کراتے ہوئے مہاراجہ سر کشن پرشاد مدارالمہام حیدر آباد دکن کو لکھا:

''ایک عریضہ اس سے پیشتر ڈاک میں ڈال چکا ہوں۔ آج پھر عریضہ لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ مجھے یاد ہے سرکار نے یا مجھے لکھا تھا یا زبانی ارشاد فرمایا تھا کہ ایک قابل

آدمی کی ضرورت ہے ، جو سرکار کے مشاغل تصنیف و تالیف میں ممد و معاون ہو ۔ میں تلاش میں تھا ۔ آخر ایک آدمی مل گیا ہے ، یعنی مولانا عبداللہ عمادی ۔ جونپور کے رہنے والے ہیں ، لاہور میں ایک عرصے سے مقیم ہیں ، عربی و فارسی میں ان کی لیاقت اعلیٰ درجے کی ہے اور اردو نثر نویسی میں ان کا طرزِ تحریر جدت رکھتا ہے ۔ علوم اسلامیہ میں ان کی مہارت کامل ہے اور ان کی پرائیویٹ زندگی بالکل بے داغ ہے ۔ پنجاب کے بعض اخباروں کی ایڈیٹری بھی کر چکے ہیں ۔ مثلاً ''وکیل'' ، ''زمیندار'' اور ''لمعات'' وغیرہ ۔ غرض کہ نہایت قابل آدمی ہیں ۔ میرے خیال میں ان سے بہتر آدمی سرکار کو نہ مل سکے گا ۔ تنخواہ ان کو ڈیڑھ دو سو روپے ماہوار ملتی رہتی ہے ۔ اگر سرکار کو ضرورت ہو اور ان کو پسند فرمائیں تو تنخواہ کے متعلق ان سے گفتگو کر لوں گا ۔ زیادہ کیا عرض کروں ۔ اس خط کا مقصد صرف یہی اطلاع تھی جو اوپر عرض کر چکا ہوں ۔''

حیدر آباد میں دارالترجمہ قائم ہوا تو مولانا عمادی اس میں لے لیے گئے ، جہاں وہ اپنی لغات دانی اور جدید عربی مصطلحاتِ علمی کی واقفیت کے سبب بہت کارآمد ثابت ہوئے ۔ انھوں نے وضعِ اصطلاحات کے علاوہ متعدد عربی کتابوں کے ترجمے بھی کیے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں :

۱- مؤرخ مسعودی کی التنبیہ والاشراف اور مروج الذہب ۔

۲- مورخ طبری کی ''تاریخ الرسل والملوک'' کی آخری دو جلدیں۔

۳- ''طبقاتِ ابنِ سعد'' کی بارہ جلدیں۔

۴- ابنِ حزم کی ''الملل والنحل''۔

۵- پانچویں صدی ہجری کے مشہور فلسفی، طبیعی و ریاضیاتی مصنف ابن الہیثم کے حسب ذیل رسائل:

(الف) رسالہ الضوء۔

(ب) رسالہ المرایاء المحرقة بالقطوع۔

(ج) رسالہ المرایاء المحرقة بالدائرہ۔

(د) رسالہ المسکان۔

(ہ) رسالہ مشکّل بنی موسیٰ۔

(و) رسالہ المساحت۔

(ز) رسالہ ضوء القمر۔

۶- محدث ابن جوزی کے مشہور تاریخی اور سیرتی خاکوں کا نوشتہ ''المنتظم فی التاریخ''۔

۷- تاریخ یعقوبی۔ وغیرہ۔

حیدر آباد میں رہ کر بھی مولانا نے اقبال کو ہردم یاد رکھا۔ جس زمانے میں اقبال یہاں ''بانگِ درا'' ترتیب دے رہے تھے، اسی زمانے میں مولوی عبدالرزاق صاحب نے حیدر آباد سے اقبال کا منتشر کلام مختلف رسالوں اور اخباروں سے جمع کر کے ایک مجموعہ ''کلیاتِ اقبال'' کے نام سے شائع کیا۔ چونکہ اقبال نظرثانی کرتے وقت اپنا بہت سا کلام رد کر چکے تھے اس لیے یہ مجموعہ انھیں پسند نہ

آیا اور اُنھوں نے حیدرآباد سے باہر اس کی فروخت پر پابندی لگوا دی۔ تاہم اس کتاب پر جو مقدمہ مولانا عمادی نے لکھا تھا ، اس کے ان الفاظ سے موصوف کی اقبال کے کلام سے گہری دلچسپی کا پتا چلتا ہے:

''اقبال کا دل وحیٔ الٰہی کا آئینہ دار ہے۔ کشفِ غطا نے اس کے سامنے سے آسمان و زمین کے پردے اُٹھا دیے ہیں اور اس کو صاف نظر آ رہا ہے کہ ۵۷۰ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نظامی نے ''مخزنِ اسرار'' میں جو فریاد کی تھی ، اِس چودھویں صدی میں وہ دعا مستجاب ہونے کو ہے۔ توحید کی عنقریب آنے والی عظمت کا نظارہ اس کے روبرو ہے اور وہ:

'محوِ حیرت ہے کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی'

ہر ایک اسلامی زبان کی شاعری میں یہ خصوصیت اقبال ہی کے لیے ودیعت تھی اور دنیا بھر میں یہی ایک حسّان الہند ہے جو گوری شنکر (ایورسٹ) سے لے کر پیرینیز (Parenees) کی چوٹیوں تک اعلائے لوائے نبویؐ کے لیے قوم کو آمادہ کر رہا ہے۔''

ایک دفعہ علامہ اقبال نے مولانا عمادی کو لکھا کہ:

''اکبر الہ آبادی نے تو یہ کہا ہے:

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

لیکن یہاں لاہور میں نہ تو اکبر ہیں نہ امرود۔ ایک اقبال ہے ، وہ بھی برائے نام!''

مولانا نے اس کے جواب میں نہایت برجستہ فرمایا :

تجھ پہ اے پنجاب نازل ہوں خدا کی رحمتیں
اے کہ تو اقبال کی دولت سے مالامال ہے
ہم نے مانا تو نہیں مسحورِ تہذیبِ فرنگ
تجھ میں سب کچھ ہے اگر اسلام اور اقبال ہے

مولانا نے ستّر برس کے سن میں ۱۱ شوال ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ع) کو انتقال فرمایا ۔ مرحوم نہایت خلیق ، ملنسار اور کنبہ پرور بزرگ تھے ۔ ان کا شمار مشرقی تہذیب کے آن نمونوں میں ہوتا تھا جن کے مٹنے کے بعد ان کی جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے ۔ بقول مولوی ابوالخیر مودودی ''عمادی صاحب جتنے بڑے عالم تھے ، اس سے زیادہ اعلیٰ قسم کے انسان تھے ۔ بلند نگاہ اور کریم النفس ، قلندر صفت اور قلندر سیرت ۔ ان کی زندگی شرافتِ علم اور شرافتِ نفس کے امتزاج کی نمود تھی ۔''[۱]

☆ ☆ ☆

۱۔ نقوش ، شخصیات نمبر ، حصہ دوم ۔

۲۸

مسز سروجنی نائیڈو

(۱۹۴۹ء)

بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو کا شمار اُن شخصیتوں میں نہیں ہوتا جو اپنی شہرت اور بقا کے لیے کسی دوسرے کی تعریف و توصیف کی محتاج ہوں۔ وہ خود ایک عظیم عالمی شاعرہ تھیں۔ ذاتی اوصاف اور خاندانی وجاہت کے لحاظ سے بھی بلند و بالا حیثیت کی مالکہ تھیں۔ ناموری اور شہرت کے معاملے میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھیں۔ وہ علامہ اقبال کی دوست اور ہم عصر تھیں اور دونوں ایک دوسرے کے مقام اور منزلت سے واقف تھے، اس لیے دونوں کے خوشگوار تعلقات پر روشنی ڈالنا کسی طرح بے جا اور غیر موزوں نہ ہوگا۔

سروجنی نائیڈو ۱۳ فروری ۱۸۷۹ء کو حیدرآباد دکن میں ڈاکٹر اگھوری ناتھ چٹوپادھیا کے گھر پیدا ہوئیں۔ وہ ذات کے برہمن تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۷ء میں ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری اڈنبرا یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ وہ تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ حیدرآباد دکن

کا نظام کالج انھی کی کوششوں کا رہینِ منّت ہے ۔ اُنھوں نے اپنی بچی کو بھی اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا ۔

بارہ تیرہ برس کے سن میں سروجنی نے مدراس یونیورسٹی سے ۱۸۹۱ع میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور اسی زمانے میں شاعرانہ زندگی کا آغاز کر کے شہرت کے پروں پر اُڑنا شروع کر دیا ۔ چنانچہ وہ خود فرماتی ہیں :

''شاعری مجھے والدین سے ورثے میں ملی تھی ۔ میری ماں نے عالمِ شباب میں بنگالی زبان میں پریم رس غزلیں کہی تھیں ۔ ان کا اثر مجھ پر بھی ہوا ۔ میری عمر گیارہ برس کی تھی جب میں نے پہلی نظم کہی ۔ پھر انٹرنس پاس کر کے تیرہ برس کی عمر میں ایک طویل نظم ''جھیل کی ملکہ'' کے عنوان سے لکھی ۔''

۱۸۹۵ع میں سروجنی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگستان بھیجی گئیں ۔ وہاں تین سال اُنھوں نے کنگس کالج لنڈن اور گرٹن میں تعلیم حاصل کی ۔ ۱۸۹۸ع میں امتحان سے فارغ ہو کر وہ اٹلی گئیں ، جس کی قدرتی خوبصورتی اور رنگا رنگ دلآویزی نے ان کی شاعری کو چارچاند لگائے ۔

دسمبر ۱۸۹۸ع میں وہ حیدرآباد واپس آئیں اور اسی مہینے ان کی شادی سرکار نظام کے میڈیکل آفیسر ڈاکٹر جی نائیڈو سے ہوگئی ۔ وہ غیربرہمن تھے ۔ ان کی اقامت گاہ گولڈن تھرش ہولڈ (طلائی چوکھٹ) کہلاتی تھی ۔ گرہست زندگی بسر کرنے کے باوجود سروجنی نے موسیٰ ندی کی طغیانی کے موقع پر دن رات امدادی کام کیا جس کے

اعتراف میں شاہ ایڈورڈ ہفتم نے ''قیصرۂ ہند'' کا خطاب عطا کیا۔ ان کے شغلِ شاعری میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اپنی لطیف روح کو غذا مہیا کر کے برابر پروان چڑھاتی رہیں۔ وہ قابل ترین ہندوستانی شاعرہ تھیں جو انگریزی میں بھی شعر کہتی تھیں۔ انھیں انگریزی زبان پر حاکمانہ قدرت حاصل تھی۔ اکثر انگریز اس پر رشک کرتے تھے۔ اپنی فصیح و بلیغ انگریزی نظموں کی وجہ سے وہ نائٹنگیل آف انڈیا (بلبلِ ہند) کہلاتی تھیں۔ ابتدا میں ان کی شاعری مغربی خیالات کا عکس ہوتی تھی، لیکن جب مسٹر ایڈمنڈ گوس نے انھیں سمجھایا کہ آپ کو پرانے مغربی خیالات کی جگالی نہیں کرنی چاہیے، ہم تو آپ کی زبان سے آپ کے دلی جذبات و احساسات معلوم کرنا چاہتے اور ہندوستانی دلوں کی دھڑکنیں سننا چاہتے ہیں، تو اس وقت سے آخری دم تک سروجنی نے اپنی شاعری کی زبان تو انگریزی ہی رکھی لیکن خیالات ہندوستانی ظاہر کیے۔ ۱۹۱۴ء میں وہ رائل سوسائٹی آف لٹریچر کی رکن بنا لی گئیں اور ۱۹۱۵ء میں شعلہ بیان شاعرہ تسلیم کی جانے لگیں۔

سروجنی کی نظمیں کیا تھیں؟ نہایت پیارے دلکش گیت تھے۔ جن میں کچھ موسموں کا حال، کچھ مجلسی اشارے اور کچھ پرانی عظمت کی داستانیں ہوتی تھیں۔ ہندوستان کے شاندار ماضی، شہزادی زیب النساء بیگم کے ظاہری و باطنی حسن، مہاتما بدھ کے تخیلات اور مذہبی جذبات، ہمایوں اور اس کی ملکہ کی مثالی محبت کے متعلق سروجنی نے جو لطیف خیالات اپنی نظموں میں ظاہر کیے، ان کی بدولت ایک عالم سے خراجِ تحسین وصول کیا۔

سروجنی نائیڈو جہاں گرد تھیں - ان کی زندگی کا بیشتر حصہ یورپ کی سیر و سیاحت میں بسر ہوا لیکن مغربی آب و ہوا نے ان کی وطن دوستی پر کوئی آنچ نہیں آنے دی - مادرِ ہند کی محبّت سروجنی کے دل میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی - وہ اپنی ایک نظم میں نہایت درد انگیز اور تڑپا دینے والے لہجے میں کہتی ہیں :

''اے مادرِ ہند ! جاگو - اُٹھو - تاریکی کے پردے ہٹاؤ - ایک نئی نویلی دلھن کی طرح اُمیدوں اور ارمانوں کی دنیا دل میں بساؤ اور اپنی کوکھ سے ایسے بچے جنم دو جو دنیا میں تمھارا اُپکار کرسکیں - تمھارا نام روشن کر سکیں -

تمھارے بچے اندھیری کال کوٹھڑیوں میں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے پڑے ہیں - تم ہی انھیں ان تیرہ و تار قیدخانوں سے آزاد فضا میں لا سکتی ہو - مستقبل کتنی میٹھی آواز سے تمھاری گزشتہ عظمت اور وقار کی بازیافت کا وعدہ کر رہا ہے -''

وہ حُب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہوکر اپنے ملک کو زندہ اور بیدار ملکوں میں شامل دیکھنے کی آرزو میں یہاں تک بے تاب ہو جاتی تھیں کہ تمام دنیاوی خواہشات ، جاہ و جلال اور ہر قسم کے آرام و آسائش کو لات مار کر کہتی تھیں :

''میری دنیاوی خواہشو ! تم میرے سر کا تاج تھیں مگر اب مجھے تمھاری صورت سے نفرت ہے - میں تمھیں پھولوں کی طرح اپنے سر کے بالوں میں سجائے رکھتی تھی مگر اب جاؤ ، چلی جاؤ ، میرا ساتھ چھوڑ دو ، بہت دُور ،

آسمان پر ، سفید بادلوں سے جا ملو ۔"

ــــ اور یہ صرف کہنے کی باتیں نہیں تھیں ۔ سروجنی نے یہ سب کچھ کر دکھایا ۔ اُس نے اپنے تمام غیر ملکی ریشمی کپڑے ترک کر دیے ۔ کھدر کی سفید موٹی ساڑھی پہننی شروع کر دی اور اپنی مثال سے عورتوں کو بتایا کہ ماتری بھومی کی آزادی کے لیے اپنی آسائشیں اور خوشیاں کس طرح قربان کی جا سکتی ہیں ۔

مسز سروجنی نائیڈو عمر بھر کانگرس کی راہنما رہیں ۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ صوبہ یو ۔ پی کی گورنر بنا دی گئیں ۔ انھوں نے ۲ مارچ ۱۹۴۹ع کو انتقال کیا ۔

سروجنی نے بے شمار نظموں کے علاوہ ابتدائی عمر میں چند ناول بھی لکھے ۔ ان کے تین شعری مجموعے "سنہری دروازہ" ، "پرندۂ وقت" اور "شکستہ بازو" بہت مشہور ہیں ۔ ان کی بعض نظموں کا اُردو ترجمہ "ایوانِ تصوّر" کے نام سے ظفر قریشی دہلوی نے کیا ہے ۔ سروجنی کی سحر بیانی ، ملیح حسن ، دلکش سریلی آواز ، بے نظیر علمی قابلیت اور اعلٰی درجے کی شاعری کی نسبت مشرق و مغرب کے اخبارات اور علم دوست حضرات ہمیشہ رطب اللسان رہے ، مگر مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے ۴ جنوری ۱۹۱۸ع کو کلکتہ میں جو اشعار ان کی شان میں کہے ، وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں :

آنکھیں ہوئی ہیں خیرہ سورج کی روشنی سے
مانگا ہے نور اس نے شاید سروجنی سے
ہندوستان والو ! پیارا وطن تمھارا
خالی نہیں ہے اب بھی سیتا و پدمنی سے

حکمت کے جو خزانے اس خاک میں چھپے ہیں
ان کا نشاں ملا ہے ہیرے کی اک کنی سے
ہاں اے عروس معنیٰ! تجھ سے ہی کیوں نہ سیکھیں
نکتہ تہمتنی کا اپنی فروتنی سے
تیرا ہر اک ترانہ، ہے زیست کا خزانہ
تو ہے تو ہم کو کیا ڈر دشمن کی دشمنی سے
سارے جہاں کے اندر اک گونج سی ہے پیدا
اے عندلیبِ شیدا تیری نوازنی سے
تیری زبانِ شیریں وہ کام کر دکھائے
جو ہو سکے نہ ہرگز تلوار کے دھنی سے

شاعرہ اور ادیبہ ہونے کے ساتھ ساتھ سروجنی شوخ بھی بہت تھیں۔ کانگرس ایجی ٹیشن کے زمانے میں ایک بار وہ دہلی جا رہی تھیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے عہدے دار ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے اور انھیں گاڑی سے اتار کر یونیورسٹی لے گئے تا کہ انھیں یونین کا تاحیات اعزازی سرپرست بنا سکیں۔ مسز نائیڈو ایک چبوترے پر کھڑی ہو کر تقریر کر رہی تھیں اور گیلری میں بیٹھے طالب علم اوپر سے ان پر گلاب کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔ تقریر کے دوران میں مسز نائیڈو نے یہ دلچسپ واقعہ سنایا کہ میں چند سال قبل جنوبی افریقہ گئی جہاں ہندوستانیوں سے سخت بدسلوکی کی جا رہی تھی۔ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں نے میرے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا اور سپاسنامہ پڑھنے کی ذمہ داری پرائمری اسکول کے ایک ٹیچر کو سونپ دی۔ سپاس نامے میں لفظ ''نائیٹنگیل آف انڈیا'' مرقوم

تھا ۔ ٹیچر یہ لفظ سمجھ نہ سکا اور اس نے ''ناٹی گرل آف انڈیا'' (بھارت کی شریر لڑکی) پڑھ کر تفنّن طبع کا سامان پیدا کردیا ۔

نظر حیدر آبادی مرحوم اپنی کتاب ''اقبال اور حیدر آباد'' میں لکھتے ہیں :

''چٹوپادھیا خاندان کی یہ نامور خاتون حیدر آباد کے علم و ادب کی مانگ کا سیندور ہے اور ایک ایسا روشن ستارہ جس کی تابناکیوں سے ہند اور سندھ کی سرزمین مدتوں جگمگاتی رہی ۔ شاعر ، ادیب ، مقرّر ـــــ ایک قوسِ قزح اور ہزار رنگ ـــــ بنگال کا جادو ان کی تقریروں میں سمٹ آیا تھا اور کبیرداس کی بے تعصّب روح ان کی شاعری میں دوبارہ زندہ ہوگئی تھی ۔ اس ساز کے آہنگ میں شیام کی بنسری کی مدھر تانیں تھیں اور حمد و نعت کی پُرسوز حلاوت بھی ۔ حیدرآباد کی سیاست میں انھوں نے کبھی عملاً حصہ نہیں لیا ، لیکن شعر و ادب کی ہر محفل کی شمع بھی وہی تھیں اور صدر بھی ۔ سماجی زندگی میں ان کی حیثیت ایک ہمدرد بہن اور شفیق ماں کی سی تھی ۔ سب کے دکھ درد میں برابر کی شریک ، خلیق ، ملنسار ، مسلسل برسنے والا ابرِ کرم ۔ جس میں ابھرنے کی صلاحیت دیکھی ، اس ممتا کی ماری نے اسے سینے سے لگایا ، حوصلوں کو بڑھایا اور جہد و عمل کی ایک نئی روح پھونک دی ۔ حیدرآباد کو ''شہرِ گوہریں'' کہتی تھیں اور اہلِ حیدر آباد کو

دیوانہ وار چاہتی تھیں ، اپنے بچوں کی طرح ـــــ"[1]

جب بھارتی حکومت نے فوجی قوت سے حیدرآباد پر حملہ کر کے اسے ہندوستان کا جزو بنا لیا تو بھارت بھر میں گھی کے چراغ جلے ، مگر سروجنی نے سوگ منایا اور سیاہ ماتمی لباس پہنا ۔ کسی جشن میں شرکت نہ کی ۔ کہا کہ "حیدر آباد کی اپنی ایک تہذیب تھی ۔ آج وہ تہذیب ختم ہو گئی ۔"

سروجنی ہندو مسلم اتحاد کی زبردست حامی تھیں ۔ اسلام کو پہلا مذہب تسلیم کرتی تھیں جس نے حرّیت کی تعلیم دی ۔ ان کے بچپن کے ساتھی چونکہ مسلمان بچے ہی تھے اس لیے وہ مسلمان سوسائٹی اور اسلامی معاشرے سے اچھی طرح مانوس تھیں ۔ ان کا خیال تھا کہ "دریائے گنگا نے مسلمان حملہ آوروں کا خیرمقدم کیا ۔ ان کے بچوں کو بپتسمہ دیا ، جس سے وہ ہندوستانی ہوگئے ۔ اب ہندوستان مستقل طور پر ان کا گھر ہے ۔ ان کا خون اور ہمارا خون ایک ہے ۔ ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ـــــ"[2] وہ قائدِ اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال کی صلاحیتوں کی معترف تھیں ۔ بابائے ملّت کے بارے میں ان کی کتاب The Embassador of Hindu Muslim Unity (ہندو مسلم اتحاد کا سفیر) موجود ہے ۔

اقبال سے سروجنی کے روابط بہت گہرے تھے ۔ اقبال سے ان کی پہلی ملاقات ولایت میں اس وقت ہوئی جب وہ تعلیم حاصل کرنے کی

۱۔ اقبال اور حیدر آباد ، ص ۲۱۹ ۔

۲۔ تقریر ، اکتوبر ۱۹۱۷ء ۔

غرض سے انگلستان گئے ہوئے تھے ۔ اس کے بعد بے تکلفی بڑھتی گئی اور پھر زندگی بھر وہ ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرتے رہے ۔ مس عطیہ فیضی نے بعض ابتدائی ملاقاتوں کا حال بڑے مزے لے لے کر بیان کیا ہے ۔ وہ اپنی جگہ سروجنی کو اپنا حریف سمجھتی تھیں ، اس لیے رقابت کے جوش میں کبھی کبھی اس پر طنز کے تیر بھی چلا دیتی تھیں ۔

اقبال کیمبرج میں زیرِ تعلیم تھے کہ ۲۹ جون ۱۹۰۷ء کو لیڈی ایمیٹس کے ہاں ایک فیشن ایبل پارٹی ترتیب دی گئی ۔ اس میں اقبال اور مس عطیہ فیضی بھی شریک تھے ۔ دونوں مصروف گفتگو تھے کہ عین اس وقت سروجنی دھم سے اندر داخل ہوئیں ۔ وہ اس وقت نہایت قیمتی لباس زیبِ تن کیے ہوئے تھیں اور ضرورت سے زیادہ جواہرات میں لدی پھندی اور بنی ٹھنی تھیں ۔ وہ انگلستان جاتے وقت مس عطیہ فیضی کی ہم سفر تھیں اور اپنے آپ کو تمام خوبیوں کا جامع سمجھتی تھیں ۔ وہ ہر شخص کو ، جو ان کی راہ میں آیا ، کیتاً نظر انداز کرتی ہوئی سیدھی اقبال کے پاس پہنچیں اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہا :

''میں صرف آپ سے ملنے آئی ہوں'' ۔

اقبال نے اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا :

''یہ حادثہ اس قدر فوری اور اچانک ہے کہ مجھے تعجب ہوگا اگر میں اس کمرے سے زندہ باہر نکل سکوں گا ۔''

دسمبر ۱۹۱۱ء میں اقبال نے اپنی چند نظمیں عطیہ بیگم فیضی کو بھیجیں اور ہدایت کی کہ یہ سروجنی نائیڈو کو بھی سنا دی جائیں ۔

غالباً اس ہدایت سے عطیہ کے اندر کی عورت جاگ اٹھی اور انھوں نے اقبال کو لکھ بھیجا کہ سروجنی اردو شاعری کی قدر نہیں کر سکتی۔ حالانکہ حیدر آبادی ہونے کی وجہ سے وہ اچھی خاصی اردو جانتی تھیں ۔ کبھی کبھار اردو میں تقریر بھی کر لیتی تھیں ۔ بے شک وہ اردو میں شعر نہیں کہہ سکتی تھیں مگر اقبال کے اشعار سے خوب لطف اندوز ہوتی تھیں ۔ اور شاعر ہونے کی بنا پر اقبال کی شاعری سے استفادہ ہی نہیں کرتی تھیں بلکہ اپنی انگریزی تقریروں میں اقبال کے اشعار کا حوالہ بھی دے جاتی تھیں ۔ انھیں اقبال کے لاتعداد شعر زبانی یاد تھے ۔

۱۹۱۷ء میں سروجنی نے اپنی نظموں کا ایک مجموعہ ''بروکن ونگ'' (شکستہ پر یا شکستہ بازو) اقبال کی خدمت میں پیش کیا ۔ اقبال اس کے مطالعے سے بہت محظوظ ہوئے اور انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار ان شعروں میں کیا :

یا رب از غارتِ گل بر دلِ نرگس چہ گذشت
دستِ بی طاقت و چشمِ نگرانست او را
شبنم و لالہ و گل اشک لگہ آلودش
گریہ بر محنتِ خونیں جگرانست او را
خیز و پر زن کہ دریں جلوہ گہ نکہت و رنگ
طائرے نیست کہ پرواز گرانست او را

یہ اشعار اقبال کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ۔ ''باقیاتِ اقبال'' میں محفوظ کیے گئے ہیں ۔

ایک دفعہ مسز نائیڈو کسی نہ کسی طرح اقبال کو گاندھی جی کے پاس لے گئیں اور انہیں اندر بھیج کر خود باہر دروازے پر منتظر رہیں ۔ وقت دس منٹ کا مقرر تھا مگر گفتگو پچاس منٹ تک جاری رہی ۔ آخر حضرت علامہ نے کہا : "گاندھی جی ! آپ کا وقت بہت قیمتی ہے ۔ اب مجھے اجازت دیں ۔" گاندھی جی نے "کُھدا ہافیج" (خدا حافظ) کہہ کر انہیں رخصت کیا ۔ مسز نائیڈو کا خیال تھا کہ پچاس منٹ کی گفت و شنید میں گاندھی جی نے اقبال کو شیشے میں اتار لیا ہوگا اور وہ گاندھی جی کے رنگ میں رنگے گئے ہوں گے مگر علامہ نے مسز نائیڈو کے استفسار کے جواب میں کہا :

"ٹھیک ہے ، یہ شخص امورِ خوراک کا ماہر ہے ۔ اسی لیے اس کی صحت اچھی ہے ۔ اس کا کوئی اور وصف قابلِ ذکر نہیں : ع

دندانِ مور دستۂ خنجر نمی شود

[چیونٹی کے دانتوں سے خنجر کا دستہ تیار نہیں ہو سکتا]"

سیاسی اختلاف کے باوجود اقبال اور سروجنی دونوں ایک دوسرے کے مداح اور قدردان رہے اور ان کے ذاتی تعلقات میں سرِمُو فرق نہ آیا ۔ ڈاکٹر ٹامس آرنلڈ ، ڈبلیو ییٹس ، رابندر ناتھ ٹیگور اور ولیم آئن سٹائن جیسے مشاہیر نے ۱۹۱۲ء میں رائل انڈین سوسائٹی آف لندن قائم کی تھی ۔ اس کا تعلق زیادہ تر پاکستان ، بھارت اور سیلون کے فنونِ لطیفہ سے تھا ۔ موسیقی ، مصوّری اور سنگ تراشی کے علاوہ شاعری بھی اس سوسائٹی کے دائرۂ کار میں تھی ۔ ۱۹۳۱ء میں

جب علامہ اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن پہنچے تو اس سوسائٹی نے ان کے اعزاز میں ایک جلسہ کیا، جس میں علامہ اقبال اور مسز سروجنی نائیڈو نے اپنا اپنا کلام سنایا۔[1]

اقبال سروجنی کی کتنی تکریم کرتے تھے؟ اس کا اندازہ اس ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے جو جناب مظفر حسین شمیم نے بیان کیا ہے۔ غالباً ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے کہ وہ اور مولانا چراغ حسن حسرت علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ مسز سروجنی نائیڈو کی آمد کی اطلاع ہوئی۔ اقبال کی طبیعت اگرچہ ناساز تھی لیکن ان کے استقبال کے لیے وہ خود اٹھ کر گئے۔ یہ دونوں حضرات باہر کی نشست گاہ میں بیٹھے رہے۔ سروجنی اور اقبال اندر کے ڈرائنگ روم میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جب سروجنی جانے کے لیے اٹھیں تو ان کے منع کرنے کے باوجود اقبال انہیں موٹر تک چھوڑنے گئے اور واپس آ کر ان کی تعریف کرتے رہے۔

اقبال کی زندگی میں (وفات سے ایک سال قبل) لاہور کی تقلید میں جب اہلِ حیدر آباد نے بھی پہلا ''یومِ اقبال'' منایا تو مسز نائیڈو حیدر آباد سے باہر تھیں۔ وہ بہ نفسِ نفیس تو اس تقریب میں شریک نہ ہو سکیں لیکن انھوں نے ایک تار کے ذریعے اپنا پیغام ارسال کیا۔ دیکھیے اس تار کے الفاظ میں دل کے تار کس طرح جھنجھنا رہے ہیں:

۱۔ ''لندن کی ایشیائی انجمنیں'' مندرجہ کتاب ''چند یادیں چند تاثرات'' از عاشق حسین بٹالوی۔

"میں اپنے بہترین دوست اقبال کو ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کا عظیم تریں شاعر سمجھتی ہوں ۔ اس شاعر کے آردو فارسی شعری کارنامے ہندوستانی قوم کے زبردست راہبر ثابت ہوں گے ۔"

☆ ☆ ☆

۲۹

سید شوکت حسین

(۱۹۴۹ء)

سیّد شوکت حسین ۲ مارچ ۱۸۹۹ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ دروازہ میں حاصل کی۔ ۱۹۱۷ء میں میٹرک کے امتحان کے بعد ۱۹۱۹ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے توسّط سے علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔ علی گڑھ کی فضائے علم ریز نے ان میں نہایت شستہ ادبی اور شعری ذوق پیدا کیا۔ وہیں مولانا محمد علی جوہر کی صحبتیں میسّر آئیں جن کی سب سے پہلی سوانح عمری ۱۹۲۶ء میں سیّد شوکت حسین ہی نے لکھی۔

علی گڑھ سے واپس آنے کے بعد شوکت صاحب نے روزانہ اخبار "سیاست" لاہور میں سیّد حبیب کے نائب مدیر کی حیثیت سے کام شروع کیا اور تحریکِ خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مگر جب یہ جوش سرد پڑ گیا تو صحافتی زندگی ترک کردی اور "سیاست" چھوڑ کر آپ نے گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ میں بطور مدرس ملازمت

حاصل کرلی - یہیں آپ کی زندگی میں انقلابِ عظیم پیدا ہوا اور آپ چشتی سلسلے کے ایک بزرگ خواجہ حبیب اللہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے صاحبِ حال ہوگئے - خواجہ حبیب اللہ کا مزار ''تاج سرور'' کے نام سے ماموں کانجن تحصیل سمندری کے قریب مرجعِ خلائق ہے - سیّد شوکت حسین کے عقیدت مندوں میں چونا منڈی لاہور کے مشہور ڈاکٹر سیّد دلاور علی شاہ کا بیان ہے :

''جن دنوں قبلہ شاہ صاحب کمالیہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں مدرس تھے ، حضور خواجہ حبیب اللہ صاحب خود وہاں تشریف لے گئے اور نزدیک کے ایک مکان میں فروکش ہوئے - شوکت صاحب نزدیک سے گزرے - آنکھوں سے آنکھیں ملیں - اسی میں کام بن گیا اور معاملہ یگانگت کا یہاں تک پہنچا کہ خواب میں دیکھا سرکار قبلہ صاحب دو گلاس ہاتھ میں لیے ، ایک گلاس سے دوسرے گلاس میں باری باری جلدی جلدی دودھ اُلٹ رہے ہیں ، اور خوشی سے فرما رہے ہیں :

من تُو شدم ، تُو من شدی ، من تن شدم تُو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں ، من دیگرم تو دیگری''[1]

اس کے بعد شوکت صاحب کی بقیہ تمام عمر ریاضت و مجاہدات اور ارشاد و ہدایت میں گزری - وہ اقبال کے بے حد عقیدت مند تھے - انھیں اقبال کے کلام سے والہانہ عشق تھا - ان کا خیال تھا کہ اقبال

۱- گنجینۂ حبیبیہ ، مرتبہ ڈاکٹر سیّد دلاور علی شاہ ، لاہور ، ص ۶ -

"فقیرِ صاحبِ اقبال" ہے :

غیب بیند دیدۂ بیدارِ او
در ثریا محشر از افکارِ او

کوئی اقبال کے کلام پر غلط قسم کی تنقید کرتا تو انھیں ناگوار گزرتی ۔ لکھنؤ کے ہفتہ وار مزاحیہ اخبار "اودھ پنچ" میں اقبال کے کلام کا اکثر مذاق اڑایا جاتا تھا ۔ ایک دفعہ اس اخبار نے اقبال کی ایک غزل کو ہدفِ تنقید بنایا ۔ شوکت صاحب نے "اودھ پنچ" کا تراشہ حضرتِ علامہ کی خدمت میں بھیج کر ان کی رائے دریافت کی تاکہ آن کے ارشادات کی روشنی میں "اودھ پنچ" کے اعتراضات کا جواب دیا جا سکے ۔ اقبال نے اس کے جواب میں شوکت صاحب کو انگریزی میں جو خط لکھا اس کا مفہوم یہ ہے :

"لاہور - ۳ جنوری ۱۹۱۹ع

محترمی ! اخباری تراشہ بھجوانے پر میں آپ کا بے حد شکرگزار ہوں - یہ چند روز قبل میرے مطالعے میں آ چکا ہے لیکن میں نے اس کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی - یہ نظم آج سے بیس برس قبل لکھی گئی تھی - مجھے اس بات کا علم نہیں کہ اب اسے کس نے شائع کیا ہے - بہتر ہوتا کہ اسے چھاپنے سے پہلے میری اجازت حاصل کر لی جاتی - لیکن افسوس کہ اس ملک میں اعلٰی ادبی کردار مفقود ہے - کوئی شخص بھی مصنّف کی پروا نہیں کرتا ، جس کا نظریہ اور ذہن ہر دم تغیّر پذیر رہتے ہیں -

اگرچہ یہ نظم میری ابتدائی کاوشوں میں سے ہے لیکن اس کے باوجود بعض اعتراضات محض کتابت کی غلطیوں پر مبنی ہیں ، جس کے لیے میں ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا ۔ بہرحال تنقید نگار کی نگاہ سے نظم کے اصل نقائص اوجھل رہے ہیں ۔ شاعری محض محاورات اور الفاظ کے صحیح استعمال ہی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اس سے کہیں بلندتر شے ہے ۔ میرے نظریات تنقید نگار کے علمی نظریات سے مختلف ہیں ۔ میرے کلام میں شاعری محض ثانوی حیثیت رکھتی ہے ۔ میری یہ قطعی خواہش نہیں کہ میرا نام موجودہ دور کے شعرا میں شامل ہو ۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال ، لاہور''

درحقیقت ''اودھ پنچ'' کے اعتراضات کا سلسلہ بہت پہلے سے چل رہا تھا ۔ اس کی سن گن پا کر ٦ مارچ ١٩١٧ء کو اقبال نے اپنے دوست منشی محمد الدین فوق مدیر ''اخبار کشمیری'' لاہور کو حسب ذیل خط لکھا تھا :

'''اودھ پنچ' لکھنؤ نے جو اعتراضات مجھ پر کیے ہیں ، ان کا مجھے علم نہیں ۔ وہ پرچہ تلاش کرنا چاہیے ۔ ممکن ہے ان اعتراضوں میں کوئی کام کی بات ہو ۔ لکھنؤ والے یا اور معترض خیال کرتے ہیں کہ اقبال شاعر ہے ، مگر میری غرض شاعری سے زبان دانی کا اظہار یا مضمون آفرینی نہیں ، نہ میں نے آج تک اپنے آپ کو شاعر سمجھا ہے ۔

حقیقت میں فنِ شاعری اس قدر دقیق اور مشکل ہے کہ ایک عمر میں بھی انسان اس پر حاوی نہیں ہو سکتا ۔ پھر میں کیونکر کامیاب ہو سکتا ہوں ، جسے روزی کے دھندوں ہی سے فرصت نہیں ملتی ؟ میرا مقصود گاہ گاہ نظم لکھنے سے صرف اسی قدر ہے کہ چند مطالب ، جو میرے ذہن میں ہیں ، میں ان کو مسلمانوں تک پہنچا دوں اور بس ۔''[1]

فوق صاحب نے ''اودھ پنچ'' کا تراشہ بھجوایا جسے دیکھ کر اقبال نے ۲۸ دسمبر ۱۹۱۸ء کو انھیں لکھا :

''نظم زیرِ تنقید میری ابتدائی نظموں میں ہے ۔ اس میں بہت سی خامیاں ہیں ، لیکن تعجب ہے کہ معترضین نے ان میں سے ایک پر بھی اعتراض نہیں کیا ، اور جس قدر اعتراض ہیں ، غالباً کتابت کی غلطیوں پر ہیں ۔ لوگ اس نظم کو بار بار چھاپتے ہیں اور بغیر میری اجازت کے ۔ کم از کم مجھے پروف ہی دکھا لیا کریں ۔ اس کا علاج میرے پاس کچھ نہیں ۔ والسلام''[2]

اس پر فوق صاحب نے اپنے اخبار[3] میں ''ڈاکٹر اقبال کی نظمیں اور اودھ پنچ'' کے عنوان سے حسبِ ذیل شذرہ لکھا :

'' 'اودھ پنچ' کو ملک کے مشہور آدمیوں سے ہمیشہ لاگ

۱۔ انوارِ اقبال ، مرتبہ بشیر احمد ڈار ، ص ۶۳ ۔
۲۔ ایضاً ، ص ۶۷ ۔
۳۔ کشمیری میگزین ، ۳۱ جنوری ۱۹۱۹ع ، جلد ۱۳ ، نمبر ۳ ، ص ۳ ۔

رہی ہے - چنانچہ اس نے اپنے دورِ اوّل میں مولانا حالی مرحوم اور مرزا داغ دہلوی کے کلام پر اعتراضات کر کے خوب شہرت حاصل کی (مولانا حالی جیسے فرشتہ خصلت انسان کے بارے میں تو یہاں تک لکھ دیا :

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے ــــ قریشی) اب

کچھ عرصے سے قوم کے مایۂ ناز اور ملک کے قابل ترین فرزند ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم - اے ، پی ایچ - ڈی بیرسٹر ایٹ لاء لاہور کے کلام پر توجہ مبذول ہو رہی ہے - چنانچہ ''اودھ پنچ'' کا ایک برچہ ہماری نظر سے گزرا ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کی نعت پر اعتراضات ہیں ، جس کے مقطع کا آخری مصرع حسب ذیل ہے : ع

بغل میں زادِ عمل نہیں ہے ، صلہ مری نعت کا عطا کر

جہاں تک ہمیں معلوم ہے ، یہ نعت ڈاکٹر صاحب کا ابتدائی کلام ہے ، جس کو غالباً چوتھائی صدی کے قریب عرصہ گزر چکا ہے - اور جہاں تک ہمارا خیال ہے ، یہ نظم ڈاکٹر صاحب کے مجموعۂ کلام میں بھی نہیں ہے ، جو قلمی ان کے پاس موجود ہے اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس نظم کو اپنے مجموعے میں درج کرنے کے قابل بھی نہیں سمجھا - گو نظم بھی ابتدائے مشقِ سخن کا نمونہ ہے لیکن اہلِ اخبار و رسائل بھی بلا اطلاع اور بغیر نظرِ ثانی کرانے کے اس کو غلط در غلط چھاپتے رہے

ہیں ۔ مثلاً ایک جگہ یہ مصرع ہے :

آڑا کے لائی ہے اے صبا تُو ، جو بُوئے زلفِ معنبریں کی

یہ مصرع اصل میں اس طرح ہے :

آڑا کے لائی ہے اے صبا تُو جو بُو کسی زلفِ عنبریں کی

لیکن اخبارات میں "بوئے زلفِ معنبریں" نقل در نقل ہو رہا ہے اور کوئی نہیں سوچتا کہ یہ ترکیب درست ہے یا نہیں ۔ نہ ڈاکٹر صاحب کو علم ہے کہ یہ نظم کہاں کہاں چھپی اور کس کس نے اس کو چھاپا ہے ۔ اس سے بھی زیادہ افسوس اور حیرت کی بات یہ ہے کہ کام کا کوئی اعتراض نہیں کیا گیا ۔"

آدھر سیّد شوکت حسین نے تلاش کر کے وہ اخبار بھی ڈھونڈ نکالا جس میں پہلے پہل اقبال کی یہ غزل شائع ہوئی تھی ۔ جب وہ اخبار حضرتِ علامہ کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے حسبِ ذیل خط لکھا :

"لاہور ۔ ٦ جنوری ۱۹۱۹ء

عزیز مکرّم ! مکتوبِ گرامی کے لیے بے حد ممنون ہوں ۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ اس نظم کی پرانی کاپی ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب رہے ہیں ۔ میرے پاس اس نظم کا مسودہ موجود نہیں ۔ ہر چند یہ نظم خامیوں سے مبرّا نہیں ، لیکن عدیم الفرصتی کی وجہ سے اس پر نظر ثانی ممکن نہیں ۔ کسی پرانی نظم میں ترمیم کرنے سے ایک نئی نظم لکھ لینا کہیں زیادہ آسان ہے ۔ بہرحال نظم کے نقائص نفسیاتی ہونے کے

علاوہ بعض جگہوں پر اظہارِ خیال سے بھی متعلق ہیں۔ ہندوستانی نقادوں کو ابھی فنِ تنقید کے اصولوں سے بہرہ ور ہونے کی ضرورت ہے۔ بہرحال مجھے خوشی ہے کہ آپ اس نظم کے بارے میں مطمئن ہیں۔

آپ کی خط و کتابت سے میں پریشان نہیں ہوتا۔ آپ اس بات کو ہرگز محسوس نہ کریں۔

آپ کا محمد اقبال"

اتفاق سے مجھے اقبال کے ابتدائی زمانۂ مشق کی یہ نعت مل گئی ہے اور میں آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے یہاں پیش کرتا ہوں:

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر
جو تیرے کوچے کے ساکنوں کا فضائے جنّت میں دل نہ بہلا
تسلّیاں دے رہی ہیں حوریں، خوشامدوں سے منا منا کر
بہارِ جنّت کو کھینچتا تھا ہمیں مدینے سے آج رضواں
ہزار مشکل سے اس کو ٹالا بڑے بہانے بنا بنا کر
لحد میں سوئے ہیں تیرے شیدا تو حورِ جنّت کو اس میں کیا ہے
کہ شورِ محشر کو بھیجتی ہے خبر نہیں کیا سکھا سکھا کر
تری جدائی میں خاک ہونا اثر دکھاتا ہے کیمیا کا
دیارِ یثرب میں آ ہی پہنچے صبا کی موجوں میں مل ملا کر
شہیدِ عشقِ نبی ؐ کے مرنے میں بانکپن بھی ہیں سو طرح کے
اجل بھی کہتی ہے زندہ باشی، ہمارے مرنے پہ زہر کھا کر

رکھی ہوئی کام آ ہی جاتی ہے ، جنسِ عصیاں عجیب شے ہے
کوئی اسے پوچھتا پھرے ہے درِ شفاعت دکھا دکھا کر
ترے ثناگر عروسِ رحمت سے چھیڑ کرتے ہیں روزِ محشر
کہ اس کو پیچھے لگا لیا ہے گناہ اپنے دکھا دکھا کر
کرے کوئی کیا کہ تاڑ لیتی ہے لاکھ پردوں میں بھی شفاعت
رکھے تھے ہم نے گناہ اپنے ترے غضب سے چھپا چھپا کر
بتائے دیتے ہیں اے صبا ہم ، یہ گلستانِ عرب کی بُو ہے
مگر نہ اب ہاتھ لا اِدھر کو ، وہیں سے لائی ہے تو اُڑا کر
تری جدائی میں مرنے والے فنا کے تیروں سے بے خطر ہیں
اجل کی ہم نے ہنسی اُڑائی ، اسے بھی سارا تھکا تھکا کر
ہنسی بھی کچھ کچھ نکل رہی تھی ، مجھے بھی محشر میں تاکتی ہے
کہیں شفاعت نہ لے گئی ہو مری کتابِ عمل اُٹھا کر
اُڑا کے لائی ہے اے صبا تُو ، جو بُو کسی زلفِ عنبریں کی
ہمیں سے اچھی نہیں یہ باتیں ، خدا کی رہ میں بھی کچھ دیا کر
یہ پردہ داری تو پردہ در ہے مگر شفاعت کا آسرا ہے
دبک کے محشر میں بیٹھ جاتا ہوں ، دامنِ تر میں منہ چھپا کر
شہیدِ عشق نبیؐ ہوں ، میری لحد پہ شمعِ قمر جلے گی
اُٹھا کے لائیں گے خود فرشتے چراغ خورشید سے جلا کر
جسے محبّت کا درد کہتے ہیں ، سایۂ زندگی ہے مجھ کو
یہ درد وہ ہے کہ میں نے رکھا ہے دل میں اس کو چھپا چھپا کر

خیالِ راہِ عدم سے اقبال تیرے در پر ہوا ہے حاضر
بغل میں زادِ عمل نہیں ہے، صلہ مری نعت کا عطا کر[1]

انھی دنوں اخبار "پنجاب" کے کسی شمارے میں اقبال کی ایک غزل غلط سلط نقل ہو کر مولانا گرامی کے ملاحظے میں آئی اور انھوں نے اس کی بعض خامیوں کی طرف علامہ اقبال کی توجہ دلائی۔ چونکہ ان کی نیّت نیک تھی اور مشورہ دوستانہ تھا اس لیے اقبال نے ۷ مئی ۱۹۱۷ء کو انھیں بعض الفاظ کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"میرا شعر یوں تھا:

جلوۂ گل تو ہے اک دامِ نمایاں، بلبل!
اس گلستاں میں ہیں پوشیدہ کئی دام ابھی[2]

پہلے مصرع میں "نمایاں" "پوشیدہ" کے مقابل ہے جو دوسرے مصرع میں ہے۔

عشق فرسودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل (خرام نہیں ہے)
عقلِ سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

دوسرے مصرع میں "پیغام" کا لفظ مقتضی ہے کہ پہلے مصرع میں "قاصد" کا لفظ ہو۔

"نیم اشارہ" عمدہ ہے مگر نیم اشارہ کس کا ہو گا؟ قاصد کا

۱۔ باقیاتِ اقبال، صفحات ۳۰۰-۳۰۲۔
۲۔ 'بانگِ درا' کی ترتیب کے وقت یہ شعر اقبال نے اپنی غزل سے خارج کر دیا (باقیاتِ اقبال، ص ۳۳۹)۔

یا خود محبوب کا؟ اس کے علاوہ ''ہے'' لانا پڑے گا۔
''عمل'' سے ''خرام'' اچھا ہے مگر معانیٔ مطلوبہ کے اعتبار
سے ''عمل'' بہتر ہے۔ یہ شعر[1] اس فارسی شعر کا ترجمہ
ہے:

عقل در پیچاکِ اسباب و علل
عشق چوگاں بازِ میدانِ عمل

''رہینِ سحر و شام'' سے ابھی تسکین نہیں ہوئی۔ مفصّل
لکھیے یا خود آئیے اور بیان کیجیے۔ میرا مقصود اس شعر:

سعیٔ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات
تیری میزان ہے شمارِ سحر و شام ابھی

سے یہ ہے کہ زندگی سحر وشام کی تعداد کے مجموعے کا نام
نہیں ہے بلکہ اس کا معیار سعیٔ پیہم ہے۔ اس کو دنوں کی
ترازو میں نہ تولنا چاہیے، جیسا کہ عام طور پر لوگ کرتے
ہیں۔ جب کوئی پوچھے فلاں آدمی کی عمر کتنی ہے؟ تو
جواب ملتا ہے اتنے سال یا اتنے مہینے۔ یہ جواب صحیح
نہیں ہے کیونکہ یہ جواب ایّام یعنی سحر و شام کے شمار
کا نتیجہ ہے۔''[2]

یہ غزل ''بانگِ درا'' کے صفحہ ۳۱۸ پر درج ہے۔ اس کا

۱۔ یہ فارسی شعر اقبال کا اپنا ہی ہے۔
۲۔ مکاتیبِ اقبال بنام گرامی، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحات ۱۱۹-۱۲۰۔

مطلع یہ ہے :

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

چند شعر یہ ہیں :

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

ظاہر ہے کہ ترقی پسند اقبال کے یہ خیالات روایتی غزل کہنے والوں سے بالکل مختلف تھے ۔ ''اودھ پنچ'' یا دوسرے اہلِ زبان نقاد تو ایک طرف ، مولانا گرامی کی توجہ بھی بہتر الفاظ لانے پر تھی ۔ اصل مفہوم ان کے پیشِ نظر بھی نہ تھا ، اس لیے اقبال کو اپنا مطلب تفصیل سے بیان کرنا پڑا ۔

اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' شائع ہوئی تو اہلِ تصوّف نے اسے تصوّف کے خلاف اعلانِ جنگ خیال کیا اور اس کی مخالفت شروع کردی ۔ مگر سیّد شوکت حسین صاحب نے اس بحث میں کوئی حصہ نہ لیا ۔ البتہ ''خطاب بہ اقبال'' کے نام سے ۱۵۵ اشعار کی ایک فارسی نظم کتابچے کی صورت میں شائع کی جس میں اقبال سے استدعا کی کہ اپنے خیالات کو محض نظریے کی حد تک محدود نہ رکھیں بلکہ خود اس کا عملی پیکر بن کر قوم کے سامنے آئیں ۔

ابتدائیہ میں آپ نے فرمایا :

''اس فارسی نظم سے فلسفۂ اشک ریزی کا ایک نیا پہلو دکھانا مقصود ہے ، حضرتِ علامہ اقبال کی لاجواب مثنوی کا جواب لکھنا مدِ نظر نہیں اور نہ ہی ان کی ذاتِ گرامی سے کچھ سروکار ہے ۔''

اس کے بعد آپ نے اقبال کو نہایت اچھے الفاظ میں مخاطب کرتے ہوئے کہا :

اے کلیمِ طورِ سینائے خودی
اے خمارِ پاکِ مینائے خودی

اے سبق آموزِ اسرارِ ازل
اے کتابِ معرفت اندر بغل

سینہ ات از سوزِ ما سرمایہ دار
چشمِ تو از دردِ ملّت اشکبار

بسکہ ربِ عالمِ این هست و بود
پردہ هائے زندگی بر تو کشود

نالۂ تو جانِ من بیتاب کرد
لختِ دل در پہلوام سیماب کرد

اے کہ همچو بلبلِ دیوانۂ
آنکہ گرید بر سرِ ویرانۂ

بر غلامی اشک از دردِ دلے
بر فشانی تا بگیری حاصلے

پھر گریز کر کے اصل مدعا عرض کیا :

لیکن اے فرزانۂ بالغ نظر
دیدۂ تو از ارسطو تیز تر

بیں کہ در دنیائے اُمّید و رجا
کارزارِ دشنہ و تیغ و وغا

کارِ تیغِ آہنیں اشکے نہ کرد
غیز را زیرِ نگیں اشکے نہ کرد

اگر صرف رونے دھونے سے قوموں کے دن پھر سکتے اور تاج و نگیں حاصل ہو سکتے تو طارقِ اعظم گھوڑے پر زین کیوں کستا ؟ فاتحِ اندلس خنجر کیوں آزماتا ؟ دشمن کے خرمن کو آگ کیوں لگاتا ؟ کیا بوترابؓ نے خنجر و تیغ و سناں کے بغیر ہی دشمن کو تباہ و برباد کر دیا تھا ؟ کیا رسول اکرمؐ نے ان کے بارے میں یہ ارشاد نہیں فرمایا تھا کہ : ''وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز'' :

تیغ و تیرِ تیز و خنجر آزمود
دشنۂ او سینۂ اعدا دزود

اشک ریزی تو کمزوری کی نشانی ہے۔ اشک فشانی کے بعد جاں فشانی لازمی ہے :

اشک ریزی شیوۂ دوں ہمّتاں
حربۂ اطفال و آئینِ زناں

اشک چوں از حلقۂ چشمے چکید
بر زمیں افتاد و در خاکے رمید

آشیاں بر شاخ اشکے ساختن
هست دامانے بہ آتش داشتن

گریۂ تو مثلِ اشکِ بلبلے
کو فغاں ریزد بشاخِ سنبلے

او ز خواریٔ چمن اندر خروش
باغباں از نالہ اش پنبہ بگوش

او خروشد ، پر زند ، شیون کند
باغباں بنیادِ شاخے بر کند

اس لیے نالہ و فریاد سے گزر کر عملی زندگی اختیار کرنی چاہیے :

پس گریز از نالہ و آہ و فغاں
الحذر از مردمِ شیون کناں

گفتہ‌ای اے محرمِ رازِ حیات
''در عمل پوشیده مضمونِ حیات''

''در جهاں نتواں اگر مردانہ زیست
همچو مرداں جاں سپردن زندگیست''

پس چرا در خانۂ باشی اسیر
تاجِ قیصر ، تخت از کسریٰ بگیر

قوتِ پنہانِ خود کن آشکار
تا کہ باشی خام سوز و پختہ‌کار

کعبہ آباد است از اصنامِ ما
''خنده زن کفر است بر اسلامِ ما''

خاکِ یثرب کافروں کے پاؤں کے تلے روندی جا رہی ہے ، عندلیبانِ

حجازی بے خروش ہیں ، ساکنانِ گلستاں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ، تو محبت کا دعویٰ کرتا ہے ، رسول خدا ؐ سے عہد و پیمان باندھتا ہے ، تو حجاز میں مرنے کی آرزو کرتا ہے ، جس کے متعلق تیرا خیال ہے کہ :

''خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است''

تجھے یہ بھی معلوم ہے خاکِ یثرب پر کیا بیت رہی ہے اور اس بہارِ باغِ رضوان کا کیا حشر ہو رہا ہے ؟ تو خود تسلیم کر چکا ہے :

''ساقیِ دیرینہ را ساغر شکست
بزمِ رندانِ حجازی بر شکست''

مگر افسوس :

گلشنِ معشوقِ تو برباد رفت
بہرِ صیدِ طائرانِ صیاد رفت

پس اٹھ اور سرمد و منصور کی رسمِ کہن تازہ کرتے ہوئے اپنی محبت کا ثبوت پیش کر :

خیز و مثلِ عاشقِ دیوانہٗ
جانِ خود را سوز چوں پروانہٗ
''ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز
آبروئے ملتِ بیضا مریز''
مردِ حق شو ، تیغِ 'لا' در دست گیر
بہرِ 'الّا اللہ' مقامِ سخت گیر

سطوتِ فاروقؓ بنما ارجمند
شیوۂ حیدرؓ بگیر اے ہوشمند

شوکت صاحب نے حضرتِ علامہ کے علاوہ اس وقت کے بہت سے مشاہیر شعرا اور اہلِ علم کی خدمت میں یہ نظم ارسال کی - ہر ایک کا ردِ عمل جداگانہ تھا - مولانا غلام قادر گرامی نے کلام کی دلآویزی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا :

''آپ کا کلام دلآویز ــــ آپ کی ابتدا اَوروں کی انتہا : ع
نخستیں گام بر منزل رسیدی''

عزیز لکھنؤی نے اشعار کی دل کشی کی داد دیتے ہوئے فرمایا :

''سبحان اللہ ! کس قدر دلکش اشعار ہیں - اگر ابتدا یہ ہے تو انتہا کیا ہوگی : ع
قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا
اشعار کا جوش و خروش آپ کے جذبات اور کمالِ فن کی ترجمانی کر رہا ہے - حضرتِ اقبال کی ذات سے آپ نے جو کچھ خطاب کیا ہے ، میں اس کا ہم نوا ہوں - ایسے ممدوح کے واسطے ایسے ہی ستائش گر کی ضرورت تھی - خدا کرے ملک ہمیشہ آپ کے بلند افکار سے مستفید ہوتا رہے -''

البتہ کیمبرج کے پروفیسر ڈاکٹر نکلسن نے نظم کے مندرجات سے شدید اختلاف کیا اور لکھا :

''عزیزم ! میں آپ کا نہایت ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی نظم ''خطاب بہ اقبال'' کا ایک نسخہ بھجوایا - میں نے بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کیا - میرے نزدیک یہ

بات قرینِ قیاس نہیں کہ ڈاکٹر اقبال نے ایک مظلوم اور پسماندہ قوم کی آزادی کے لیے اشک ریزی کا نسخہ تجویز کیا ہے۔ یقیناً یہ "اسرارِ خودی" کا ماحصل نہیں۔ آزادی اور سربلندی کی منزل خود اعتمادی اور نظم و ضبط سے حاصل ہوتی ہے۔

آپ کا مخلص

اے۔ آر نکلسن ، ۱۲ ہاروے روڈ ، کیمبرج"

خود علامہ اقبال اس نظم کو پڑھ کر محظوظ ہوئے اور آپ نے شوکت صاحب کو نہایت اختصار کے ساتھ لکھا :

"مخدومی ! السلام علیکم

آپ کی نظم موصول ہو گئی ہے۔ شکریہ قبول فرمائیے۔ "اسرارِ خودی" اقبال کا قال ہے مگر ممکن ہے آپ کا حال ہو۔ اگر ایسا ہو تو میرے لیے بھی دعا فرمائیے۔

محمد اقبال

لاہور۔ ۷ فروری ۱۹۲۶ع[1]"

شوکت صاحب قیامِ پاکستان کے دو سال بعد تک زندہ رہے اور ۱۹۴۹ع میں انتقال فرمایا۔

☆ ☆ ☆

۱۔ سیّد شوکت حسین کے نام علامہ اقبال ، ڈاکٹر نکلسن اور عزیز لکھنوی کے تمام خطوط مرحوم کے صاحبزادے سیّد مقبول حسین شاہ کے پاس موجود ہیں جو عزیزِ مکرم عابد نظامی کے ایک مضمون کے ذریعے پہلی دفعہ منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اسی سے اس مضمون کی تیاری میں مدد لی گئی ہے۔

۳۰

چودھری محمد حسین

(۱۹۵۰ء)

چودھری محمد حسین ۲۸ مارچ ۱۸۹۴ء کو بروز بدھ[1] موضع پہاڑنگ اونچہ تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ کے ایک جاٹ گھرانے میں پیدا ہوئے - ان کے والد چودھری فضل احمد علاقے کے ذیلداروں کے خاندان سے تھے - چودھری صاحب نے ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی اسکول پسرور سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا - ۱۹۱۶ء میں ایف - اے اور ۱۹۱۸ء میں بی - اے کا امتحان پاس کیا - ابتدا ہی سے عربی ، فارسی ، اردو اور اسلامیات کی جانب ان کی توجہ زیادہ تھی اس لیے نقشبندی طریق پر تربیت حاصل کی - قرآن ، حدیث اور فقہ کا مطالعہ ہمیشہ جاری رکھا - نماز اور روزے کی بھی پابندی کی اور عمر بھر صوفی سے بنے رہے - ۱۹۲۰ء میں

۱- ''اقبال ، چودھری محمد حسین کی نظر میں'' از محمد حنیف شاہد ، بار اول ، ۱۹۷۵ء ، ص ۳۲ -

اسلامیہ کالج ہی سے ایم ۔ اے عربی کا امتحان پاس کیا اور پرائیویٹ طور پر منشی فاضل بھی کیا ۔ پھر آخری عمر میں مولانا غلام رسول خاں سے لوہاری دروازے کے اندر کسی مسجد میں جا کر اصولِ فقہ پر درس لیے اور عربی منطق پر عبور حاصل کیا ۔

کہنے کو تو سکول کی زندگی ہی میں شعر کہنے شروع کر دیے تھے ، لیکن کالج کی فضا میں یہ رنگ اَور نکھر گیا ۔ پھر جیسے جیسے علم بڑھتا گیا اور ذہن پختہ ہوتا گیا ، پرانے اساتذہ کا رنگ آپ کی فطرت کا حصہ بنتا گیا ۔ اُس زمانے میں آپ کی غزلیں اور نظمیں روزنامہ "الاثر" اور "زمیندار" میں اکثر شائع ہوتی تھیں ، جن میں اکبر الہ آبادی کے ظریفانہ رنگ کا اثر نمایاں تھا ۔ ایک روز مغرب کی اذان ہو چکی تھی اور ریواز ہوسٹل کے ایک کمرے میں نماز ہونے کو تھی مگر کمرے میں کوئی چراغ روشن نہ تھا ۔ اس پر آپ نے فرمایا : ع

روشنی مسجد میں ہونی چاہیے

کسی نے کہا کہ شعر ادھورا ہے ۔ آپ نے برجستہ فرمایا :

وقتِ مغرب قبلِ تکبیرِ صلٰوۃ
روشنی مسجد میں ہونی چاہیے

اسی دَور کا ایک شعر ہے :

تا کجا در صحبتِ یاراں نشینی ز اشتیاق
اے رہینِ لطفِ صحبت آخرِ صحبت فراق

زندہ دلی اور رندی کی مثالیں بھی آپ کے اشعار میں بے شمار ہیں ۔

فرماتے ہیں :

چل ، چلے چلتے ہیں مسجد کو ، مگر یہ تو بتا
تیرے کوچے میں کوئی اے شیخ میخانہ بھی ہے؟[1]

۱۹۱۷ع کے اواخر میں آپ نے اسلامیہ کالج کے پرنسپل ہنری مارٹن کے کہنے پر نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم کے بچوں کی اتالیقی قبول کر لی تھی ۔ نواب صاحب کا حضرت علامہ اقبال سے گہرا دوستانہ تھا ۔ اس سبب سے چودھری صاحب کو علامہ سے ملنے کا اکثر موقع ملتا تھا ۔ علامہ نے آپ کی مخلص دین داری کو بھانپ لیا اور پھر انھیں ایسا اپنایا کہ مرتے دم تک نہ چھوڑا ۔ انھی دنوں جب مثنوی ''اسرارِ خودی'' شائع ہوئی تو آپ نے علامہ کو کچھ شعر لکھ کر بھیجے ، جن میں سے چند یہ ہیں :

کوئی جا کے پوچھے تو شیخ سے یہ اسے ہی کہتا خودی نہ ہو
جو کہ بے خودی کی زباں پہ ہے ، میں جمالِ روئے جلال ہوں
گو اثر نہیں وہ زبان میں ، وہ تپش نہیں ہے اذان میں
پہ یہ لکنتیں ہیں بتا رہی کہ میں یادگارِ بلالؓ ہوں

علامہ سے مراسم کے بعد غالباً ۱۹۲۰ع میں آپ کی ایک غزل ''علی گڑھ میگزین'' میں شائع ہوئی ، جس پر نام کے ساتھ ''تلمیذِ علامہ اقبال'' کے الفاظ بھی موجود ہیں ۔ اس غزل میں مسلمانوں کے حال پر

۱- جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال : مقدمہ کتاب ''اقبال ، چودھری محمد حسین کی نظر میں'' صفحات ۱۲-۱۳ ۔

نوحہ کیا گیا ہے :

دل چاہتا ہے نت نئے فتنے سے کھیل کود
کیوں بس میں اپنے گردشِ چرخِ کہن نہیں
کب تک پھرے گا وادیٔ وحشت میں ساتھ ساتھ
تیرِ قضا ہے ، خارِ سرِ پیرہن نہیں
بستی سے دل کی گرم ہیں ہستی کی محفلیں
اس صدرِ انجمن کی کوئی انجمن نہیں
کیا دن تھے گلستاں پہ بہارے ، بتائے کون
غنچے نہیں ، صبا نہیں ، مرغِ چمن نہیں
لائے جو رنگ پر تھے ، کبھی رنگِ روزگار
اس آئنے میں رخ وہی پرتو فگن نہیں
مجنوں ہے غرقِ شرم کہ صحرا نورد تھا
سنتا بھی کیا ، تھی کوہکنی کوہکن نہیں

اور آخر میں علامہ کی طرف اشارہ ہے :

ظاہر خدا کرے گا خدائے سخن کی شان
ان کافروں کو ہند کے ذوقِ سخن نہیں

اس وقت کے حالات اور واقعات سے متاثر ہو کر کئی نظمیں لکھیں جو اخبار ''زمیندار'' میں شائع ہوئیں۔ چند نظموں کے عنوان یہ ہیں :

ماپلوں کا جرم (۲۸ جولائی ۲۲ع) ، فرنگی معشوق اور ہندی عاشق (۱۶ اکتوبر ۲۲ع) ، اب نہ کافر تر کوئی کافر مسلمانوں سے ہے (۳ مئی ۲۳ع) ، ایک پیش‌گوئی مرزا غلام احمد قادیانی کی یاد میں (۱۵ اکتوبر ۲۴ع)۔

یہ نظم نعمت‌اللہ قادیانی کی سنگ ساری کے واقعے سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی - نعمت‌اللہ کو حکومتِ افغانستان نے مرتد قرار دے کر سنگ ساری کی سزا دی تھی - اس پر قادیانی جماعت نے ساری دنیا میں شور مچایا اور اس کے خلاف احتجاج کیا - چودھری محمد حسین صاحب نے امیر امان‌اللہ خاں کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے ''قادیانیت کے خاتمے اور پرچمِ ختمِ رسالت'' کی سربلندی کی پیشگوئی کرتے ہوئے کہا :

پھر ہوا آمادۂ تائیدِ حق عبدالکریم
پھر امان اللہ خاں کرتا ہے دیں کو استوار
کیا کہوں کس شان سے لہرائے گا فاران پر
پرچمِ ختمِ رسالت سربلند و پُر وقار

۲۹ مئی ۱۹۲۲ء کو ''زمیندار'' کے 'عید نمبر' میں ، جہاں سرورق پر علامہ اقبال کی وہ نظم شائع ہوئی ، جس کے دو شعر یہ ہیں[1] :

نتواں ز چشمِ شوق رمید اے ہلالِ عید
از صد نگہ براہِ تو دامے نہادہ اند
بر خود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج
در سینۂ تو ماہِ تمامے نہادہ اند

۱- ''اقبال ، چودھری محمد حسین کی نظر میں'' ، صفحات ۲۲۳ - ۲۲۴ -

وہیں چودھری صاحب کا منظوم "تحفۂ عید[1] علامہ اقبال کی خدمت میں" شائع ہوا۔ اکتیس اشعار کی یہ نظم اپنے اندازِ بیان، زورِ بیان، معنی آفرینی اور موضوع کے اعتبار سے واقعی تحفے کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ نہ صرف ایک دوست کا نذرانہ ہے بلکہ بھٹکی ہوئی قوم کے نام ایک پیغام بھی ہے:

"ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو"
گڑگڑائے قوم سے کہہ کر یہ اقبالِ حزیں
شورِ گریہ سے پڑا سکتہ سا اک افلاک پر
کانپ اٹھا درد کی آواز سے عرشِ بریں
ہو مبادا قلبِ احمدؐ اس فغاں سے مضطرب
حق نے بھیجے خدمتِ اقدس میں جھٹ روح الامیں
پہنچے رک رک کر پرانے آستاں پر جبرئیل[ع]
دل میں ڈر یارب! نہ ہوں مضطر شہِ دنیا ودیں
بہرہ ور لطفِ حضوری سے مگر جس دم ہوئے
صد وقار و صبر کا گھر تھی وہ فرخندہ جبیں
کہہ سکا قاصد نہ کچھ ہیبت سے جب بعدِ سلام
خود بخود گویا ہوا آخر وہ یثرب کا مکیں
"کیوں ہوا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو؟"
تجھ پہ روشن ہو گی کیفیت یہ جبریلِ امیں[ع]

۱۔ "اقبال، چودھری محمد حسین کی نظر میں"، صفحات ۲۲۵ - ۲۲۷۔

اپنے ہاتھوں آپ محرومِ دو عالم ہو گئے
کہنے والے مجھ کو منہ سے رحمۃ للعالمیں
کب سے برگشتہ خدا اپنے کی طاعت سے ہوئے
سجدۂ بت سے ہے کب سے ان کی آلودہ جبیں
وہ جو میں کہتا تھا تم وارث ہو اب اس ارض کے
وہ عقیدہ کب رہا سینوں میں ان کے جاگزیں
کیا انھیں مومن کہوں میں جن کی کرتوتوں سے آج
دست و پا بستہ ہے، رسوا ہے امیرالمومنیں ؟
راہ میں اللہ کی لڑنے کو بے ہتھیار ہیں
کفر کی کرنا حمایت ہو تو ہیں شمشیر کیں
حق نہ پیدا ایسے مومن میری اُمّت میں کرے
قتلِ مومن سے میسّر ہو جنھیں نانِ جویں
آج بھی دن ہے کہ تربت ہے مری رہنِ فرنگ
وہ بھی دن ہی تھا، فرنگستان تھا سب زیرِ نگیں
داستاں اُمّت کی بربادی کی تجھ سے کیا کہوں
مجھ کو آتی بھی ہو دنیا میں نظر اُمّت کہیں
کل ابھی سارا عجم اسلام سے معمور تھا
ہو رہی خالی ہے آج اس سے عرب کی سرزمیں
لٹ گئے، مٹ بھی گئے حق کی مگر تکبیر سے
جوش میں آتے نہیں اہلِ عراق و مصر و چیں
مسلمِ ہندوستاں تھا، کر گئی اس کو بھی رام
آب و گل کی مورتی، یعنی وطن کی سرزمیں

"زلفِ دلبندش صبا را حلقہ در گردن نہد
با ہواداران رہ رو حیلہ ٔ ہندو ببیں"
ہاں وہ اقبالِ حزیں ، شیدا وہ ملّت کا مری
تیرے نالوں سے ، اسے کہدو ، کہ میں غافل نہیں
ہر فغاں لب کی ترے ، دل کی مرے آواز ہے
ہر صدا نغمے کی ہے تیرے قیامت آفریں
دے نشاں منزل کا گمراہوں کو پھر آفاق میں
دل میں درماندوں کے بھر دے عزم و اُمید و یقیں
از سرِ نو ان کو بتلا رمزِ قرآن و حدیث
کس مپرسی میں ہے اب میرے مسلمانوں کا دیں
نکتہ ٔ توحید سکھلا کر مٹا دُوئی کو پھر
کر دلوں پر نقش پھر معنیٔ ختم المرسلیں ؐ
"خضرِ رہ" تو ہو اگر ، موسیٰؑ بنے ہر فردِ قوم
دیکھ لے فرعون پھر ، ہے کون رب العالمیں
عظمتِ رفتہ کی یاد ان کے دلوں میں تازہ کر
"آخریں" ہیں یہ بتا ان کو کہ کیا تھے "اولیں"
حسن مستقبل کے جلوے ان کی آنکھوں کو دکھا
خستہ حالوں کو مرے ہونے نہ دے اندوہ گیں
سوگواروں کو محرّم کے ، پیامِ عید دے
چشم کو ان کی اٹھا سوئے مہِ گردوں نشیں
خوں رُلاتی ہے تجھے اُلفت مرے ناموس کی
یاد کو رکھتا ہوں تیری میں بھی دل کے ہم قریں

کیا کہوں تُو مستحق حق کے ہے کس انعام کا
بات اک تھوڑی سی کر لے گر مری خاطرنشیں
''برگِ گل دیدن ز جیبِ غنچہ گر داری ہوس
دامنِ پیراہن از چاکِ قبائے خویش بیں''

(''زمیندار''، ۲۹ مئی ۱۹۲۲ء)

لیکن علامہ کے کہنے پر چودھری صاحب نے شاعری ترک کردی اور نثر کی طرف توجہ کر کے چند نہایت سلجھے ہوئے متوازن تنقیدی مضامین لکھے، جو زیادہ تر علامہ کی تخلیقات مثنوی 'اسرار خودی'، 'پیامِ مشرق'، 'زبورِ عجم'، 'جاوید نامہ' اور 'ارمغانِ حجاز' کے بارے میں ہیں۔ علامہ اقبال کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ بھی کیا جو ''خلافتِ اسلامیہ'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔

۱۹۲۶ء میں حضرت علامہ کے اصرار پر آپ نے پنجاب سول سیکریٹریٹ میں ملازمت کر لی۔ آپ پریس برانچ سے وابستہ ہوئے اور ترقی کرتے کرتے ہوم ڈیپارٹمنٹ تک پہنچے۔ ۱۹۳۶ء میں آپ کو ''خان صاحب'' کا خطاب ملا اور ۱۹۴۳ء میں ''خان بہادر'' کا۔ سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ آپ نے انجمن حمایت اسلام کی بھی خدمت کی۔ انجمن نے تعلیمِ نسواں کے لیے زنانہ کالج کھولا تو آپ اس کے اعزازی معتمد مقرر ہوئے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۳ء کو انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس فرمانروائے بھوپال نواب حمید اللہ خاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ صدرِ انجمن نواب مظفر خاں نے چودھری محمد حسین کی شان دار خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا:

''حضرات! اب مجھے خان صاحب چودھری محمد حسین کے

متعلق ایک سجدۂ سہو ادا کرنا ہے۔ بہت کم حضرات کو
معلوم ہوگا کہ یہ ڈاکٹر اقبال ہی تھے جو چودھری
محمد حسین صاحب کو میرے پاس لے کر آئے تھے۔ فرمایا :
"انھیں لے لو" میں نے حکم کی تعمیل کی ۔ فرمایا "آپ
کو معلوم ہو جائے گا کہ میں آپ کو ایک 'سچا' موتی دے
رہا ہوں ۔"[۱]

حضرتِ علامہ، چودھری صاحب کو کس عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ؟ اس کا اندازہ لگانا قدرے مشکل ہے ۔ آپ ہی کے مخصانہ مشورے سے علامہ نے اپنا کلام مجموعوں کی صورت میں شائع کرانا شروع کیا ۔ جب "بانگِ درا" پہلی بار ۱۹۲۴ء میں چھپی، تو علامہ نے اس کے سرورق پر اپنے ہاتھ سے یہ شعر لکھ کر چودھری صاحب کو دیا :

برون کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا
چہ عقدہ ھا کہ مقامِ رضا کشود مرا

چودھری صاحب روزانہ بلا ناغہ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے ۔ عموماً رات کو دیر تک صحبت گرم رہتی ۔ علامہ تنہائی میں چودھری صاحب کو اپنا کلام سناتے ۔ دونوں بزرگ فارسی یا عربی لغت کی مدد سے اشعار میں مضمون کی بندش، الفاظ کی صحت یا جذبات کی ہم آہنگی پر بحث کرتے ۔ بعض اوقات اسلام، فلسفے یا سیاست پر بھی گفتگو ہوتی ۔ ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہوتیں ۔ ایک دفعہ

۱- روئداد ترپنواں اجلاس، منعقدہ ۲۷ تا ۲۹ نومبر ۱۹۴۳ء، ص ۸۶ -

چودھری صاحب نے علامہ کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی یادداشت لکھنی شروع کی تھی لیکن وہ چودھری صاحب کے ساتھ ہی دفن ہوگئی۔ کلامِ اقبال کا ایک ایک شعر چھپنے سے پہلے چودھری صاحب کی نظر سے گزرتا تھا۔ وہ ہر شعر کی شانِ نزول سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ ہر اشارے کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

جب علامہ نے مدراس میں اسلام پر اپنے مشہور و معروف لیکچر دیے تو چودھری صاحب جنوبی ہند کے دورے پر علامہ کے ہمراہ گئے۔ یہ لیکچر انگریزی میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی اور سلطان ٹیپو شہید کے مزارت کی زیارت بھی چودھری صاحب نے اقبال کی معیت میں کی۔

جنوری ۱۹۳۳ء میں علامہ کی خطرناک بیماری کا آغاز ہوا اور ۱۹۳۵ء میں ان کی اہلیہ (والدۂ جاوید) کا انتقال ہوگیا۔ کمسن بچوں کے حقوق کی نگہداشت کی خاطر علامہ نے ایک وصیّت نامہ مرتّب کیا جس میں خواجہ عبدالغنی، شیخ اعجاز احمد، چودھری محمد حسین اور حکیم طاہر الدین کو اپنے کمسن بچوں کا ولی مقرر کیا۔ ۱۹ مئی ۱۹۳۷ء کو علامہ کی زندگی ہی میں خواجہ عبدالغنی انتقال کر گئے۔ بیماری کے آخری دنوں میں علامہ نے ایک سر بمہر لفافہ چودھری صاحب کو دیا اور فرمایا کہ یہ میری وفات کے بعد کھولا جائے۔

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو پانچ بجے علامہ نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ چودھری صاحب نے اقبال کی وصیت کے ایک ایک حرف پر عمل کر کے امانت و دیانت کا پورا پورا حق ادا کیا۔ کلامِ اقبال کی اشاعت کے ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان

کے حقوق کی نگہداشت بھی کی ۔ مزارِ اقبال کی تعمیر کا فریضہ انجام دیا ، جاوید کو پہلے دیوانِ غالب ، پھر کلامِ اقبال اور آخر میں علامہ کے فرمان کے مطابق ''جاوید نامہ'' کے آخر میں ''خطاب بہ جاوید'' پڑھا کے اطمینان کا سانس لیا ۔ مارچ ۱۹۴۹ء میں علامہ کی صاحبزادی منیرہ بیگم کی شادی ہوئی اور چودھری صاحب اپنے ایک اہم فرض سے سبکدوش ہو کر خوش ہوئے ۔ ستمبر ۱۹۴۹ء میں جاوید انگلستان روانہ ہوئے تو آپ نے انہیں نصیحت کی کہ ''علم شکار کرنا علم'' ۔

۱۶ جولائی ۱۹۵۰ء کو چار بجے شام آپ اللہ کو پیارے ہو گئے اور جھنگی قاضیاں ، اقبال پارک میں دفن ہوئے ۔

☆ ☆ ☆

۳۱

خواجہ حسن نظامی دہلوی

(۱۹۵۵ء)

علامہ اقبال اور خواجہ حسن نظامی دونوں کا خمیر محبت کے خامن سے اُٹھایا گیا تھا ۔ دونوں اخوتِ اسلامی کے رشتے میں بندھے، ایک دوسرے کے نام کی مالا جپتے تھے ۔ بے غرض دوستی کی نیو تو اسی وقت پڑ گئی تھی جب دونوں نے لکھنا شروع کیا تھا اور اخبار و رسائل کے ذریعے ان کے رشحاتِ قلم سامنے آنے لگے تھے ۔ خواجہ صاحب نے نثر نویسی میں کمال پیدا کیا اور ان کے البیلے اسلوبِ نگارش نے بہت جلد اُردو دنیا سے اپنا لوہا منوا لیا ۔ اقبال نظم کے ذریعے اپنے افکار و خیالات پیش کر کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن رہے تھے ۔ شاعری سے ان کا مقصود صرف اتنا تھا کہ پڑھنے والوں میں بھی وہی خیالات موج زن ہو جائیں جو ان کے اپنے قلب میں طوفان برپا کر رہے تھے ۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ :

''اگر میں خواجہ صاحب جیسی نثر لکھنے پر قادر ہوتا تو

کبھی شاعری کو اظہارِ خیال کا ذریعہ نہ بناتا ۔''[1]

اس کے برعکس خواجہ حسن نظامی کی رائے یہ تھی کہ اگرچہ :

''ڈاکٹر اقبال سلیس اُردو پر قادر نہیں مگر جذبات کو متحرک و مضطرب کر دینے کی ان کو بڑی قدرت ہے ۔ حیاتِ انسانی کی مختلف شاخوں پر جس خوبی سے وہ لکھتے ہیں اور جو سوز کی تاثیر پیدا کر سکتے ہیں ، اَور کسی میں یہ بات کم پائی جائے گی ۔''[2]

بہرحال دونوں کی پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جب خواجہ صاحب نے پنجاب کا چوتھا سفر کیا ۔ ''آپ بیتی خواجہ حسن نظامی'' کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ خواجہ صاحب نے اپنے والد بزرگوار اور مرحوم بھائی کے ہمراہ پنجاب کے دو سفر تو خوردسالی ہی میں کیے ۔ تیسرا سفر حضرت مولانا شاہ سلیمان چشتی قادری پھلواری کی معیّت میں بہاول پور کا ہوا ۔ اس سفر میں پہلی بار شیخ عبدالقادر مدیرِ ''مخزن'' سے ملاقات ہوئی ۔ وہ اس زمانے میں صحافت اور اسٹیج کے آفتاب بنے ہوئے تھے ۔ اُنھوں نے خواجہ صاحب کو دیکھ کر کہا کہ :

''شیخ محمد اقبال صاحب کا خیال تھا کہ حسن نظامی بہت بڈھے آدمی ہیں اور میں کہتا تھا کہ وہ نو عمر ہیں ۔ آج دیکھ کر مجھ کو اپنے اندازے کی تصدیق ہوگئی کہ وہ صحیح تھا ۔''[3]

---

۱ ، ۲- اتالیقِ خطوط نویسی ، از خواجہ حسن نظامی ، ص ۴۱ -
۳- آپ بیتی خواجہ حسن نظامی ، ص ۶۹ -

اس سفر کے بعد چوتھا سفر پنجاب کا وہ تھا جس میں شیخ محمد اقبال سے ملاقات ہوئی اور پنجاب کے قومی خیالات کا ایک گہرا نقش لے کر خواجہ صاحب دہلی واپس گئے ۔ خود فرماتے ہیں :

''ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب سے میرا ملنا جلنا ۱۹۰۳ء سے تھا ۔ ایک دفعہ انجمن حمایت اسلام لاہور میں آنھوں نے اپنی نظم خاص لحن سے پڑھی اور مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں نے اپنا عمامہ سر سے آتار کر ان کو دے دیا اور کہا :

تمھارے جام سے کی نذر میری پارسائی ہو

اراکین انجمن نے عمامہ نیلام کیا اور حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر نے اس کو خرید لیا ۔ اس جلسے میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے ۔''[1]

یوں ایک ایسی مستحکم اور پائدار دوستی کی بنیاد قائم ہوگئی جسے زمانے کی کوئی گردش گزند نہ پہنچا سکی ۔ اس کی نسبت خواجہ صاحب کا خیال تھا کہ :

''ملنساری کا برتاؤ اَور چیز ہے اور دوستی کسی اَور شے کو کہتے ہیں ۔ دوستی ایک ناقابل ختم ملنساری ہے ، اور جیسی زندگی کو اس کی ضرورت ہے ویسی ہی مشکل سے وہ میسّر آتی ہے ۔''[2]

۱۔ دیباچہ کتاب ''پاکستان کے موجد اوّل ڈاکٹر سر محمد اقبال کے خطوط خواجہ حسن نظامی دہلوی کے نام ۔''

۲۔ آپ بیتی خواجہ حسن نظامی ، ص ۱۲۲ ۔

اقبال جب تک اپنے جسم اور روح کے ساتھ اس دنیا میں حیات رہے ، میل ملاپ کا سلسلہ بھی جاری رہا اور خطوں کے ذریعے خیالات کا تبادلہ بھی ہوتا رہا ۔ اقبال کے سیکڑوں خطوں میں سے چند خط ، جو خواجہ حسن نظامی کی کتاب ''اتالیقِ خطوط نویسی'' میں دیگر مشاہیر کے خطوں کے ساتھ نمونے کے طور پر محفوظ رہ گئے ہیں ، دونوں کے خوش‌گوار تعلقات کی جیتی جاگتی اور منہ بولتی تصویریں ہیں ۔ یہ کتاب نومبر ۱۹۲۹ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی ۔ اس کے چار ایڈیشن بعد میں نکلے ۔ قیامِ پاکستان کے بعد خواجہ صاحب نے اس کتاب سے اقبال کے خطوط الگ کر کے بھی شائع کیے اور اس کتاب کا نام ''پاکستان کے موجدِ اول ڈاکٹر سر محمد اقبال کے خطوط خواجہ حسن نظامی کے نام'' رکھا ۔ دیباچے میں اس اشاعت کی ایک وجہ تو یہ بیان کی :

''اب ان خطوط کو اس لیے شائع کیا جاتا ہے کہ پاکستان بن گیا ہے جس کا خیال سب سے پہلے ان کے دل میں آیا تھا اور انھوں نے بار بار زبانی مجھے پاکستان کا منصوبہ سنایا تھا ۔ مگر اس منصوبے میں ہندوستان کی تقسیم کا خیال نہیں تھا بلکہ ساری اسلامی دنیا کے اتحاد کو وہ پاکستان کہتے تھے ۔ البتہ ان کا خیال تھا کہ پاکستان ہندوستان میں بنایا جائے اور ساری اسلامی دنیا کا ہندوستان مرکز بن جائے ۔ ان خطوں میں بھی اس خیال کے اشارات کئی جگہ ہیں ۔ اس سلسلے میں وہ کئی بار میرے پاس دہلی آئے اور میں بھی کئی بار ان کے پاس لاہور آتا جاتا رہا ۔''

دوسری وجہ اس غلط فہمی کا ازالہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب میں مثنوی ''اسرارِ خودی'' کی اشاعت پر اختلاف ہوگیا تھا ۔ اس کی نسبت خواجہ صاحب نے وضاحت فرمائی :

''مثنوی 'اسرارِ خودی' کے بنیادی اصول میں مجھے ان سے اختلاف نہ تھا بلکہ حضرتِ حافظ وغیرہ شعرا اور مشائخ صوفیہ کے بعض خیالات کی نسبت جو کچھ انہوں نے لکھا، میں نے اور حضرت اکبر الہ آبادی نے ان سے اختلاف کیا تھا، جس کو مخالفین نے اصل حقیقت سے بڑھا چڑھا کر مشہور کیا تھا ۔ مگر اقبال آخر تک میرے دوست رہے اور ان کے برتاؤ میں کچھ فرق نہیں آیا ۔

بہرحال اب میرے مرنے کا وقت قریب ہے، اس لیے میں ان خطوط کو اس غرض سے شائع کرتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے باشندگان کی غلط فہمیاں دُور ہو جائیں اور اُن کو اِن خطوط سے اندازہ ہو جائے کہ انہوں نے اپنی مثنوی کا نام رکھنے سے پہلے مجھ سے مشورہ لیا تھا ۔ میرا ایمان ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صرف ہندوستان ہی کے نہیں بلکہ پوری ایشیا کے ہیرو اور لیڈر تھے اور ایشیا کی بیداری ان کی برکاتِ باطن کا نتیجہ تھی ۔''[۱]

اقبال کے یہی خطوط شیخ عطاءاللہ مرحوم نے ''اتالیقِ خطوط نویسی'' سے لے کر اپنی تالیف ''اقبال نامہ'' میں شامل کیے

۱۔ دیباچہ کتاب ''پاکستان کے موجدِ اول ڈاکٹر سر محمد اقبال کے خطوط خواجہ حسن نظامی کے نام'' ۔

ہیں۔ چونکہ ''اقبال نامہ'' نہایت آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے اس لیے آیندہ مضمون میں اسی کے حوالے دیے جائیں گے۔

خواجہ صاحب کی ابتدائی زندگی بڑی عُسرت اور تنگ دستی اور نہایت مشکلات میں گزری۔ برادری کے لوگ ان سے خدا واسطے کا بَیر رکھتے تھے۔ ان کو قوتِ لایموت حاصل کرنے کے لیے کئی قسم کے پاپڑ بیلنے اور بڑی دوڑ دھوپ کرنی پڑی تھی۔ اسی محنت و مشقت نے انھیں کامیابی سے ہمکنار کرکے فائزالمرام کیا۔ ۱۹۰۴ع میں خاندان میں سے کسی دشمن نے ان کے مرنے کی بد خبر اڑائی مگر بعد میں اس کی تردید ہوگئی۔ اقبال نے اپنے ۲۲ جولائی ۱۹۰۴ع کے خط میں خواجہ صاحب کو لکھا:

''دو دفعہ 'پیسہ اخبار' میں، میں نے وہ خبر پڑھی جسے پڑھ کر لاہور کے دوستوں کو بے انتہا تشویش تھی، مگر قدرت خدا کی، مجھے مطلق رنج نہ محسوس ہوا اور اسی بنا پر جس دوست نے مجھ سے پوچھا، میں نے بے تکلّف کہہ دیا کہ خبر غلط ہے۔ الحمد للہ کہ ایسا ہی ثابت ہوا اور میں لاہور کے احباب میں مفت کا صوفی مشہور ہو گیا۔ ایسی خبریں زیادتیٔ عمر کی علامت ہیں . . . اس خبر سے کم از کم یہ تو معلوم ہو گیا کہ ملک کو آپ کی کس قدر ضرورت ہے۔ انشاءاللہ میں بھی تعطیلوں میں اگر ممکن ہوا تو آپ سے دہلی میں ملوں گا۔''[1]

۱۔ اقبال نامہ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، جلد دوم، ص ۳۵۲۔

۶-۱۹۰۵ء میں خواجہ صاحب ہندو فقیروں ، سادھوؤں ، جوگیوں اور ان کے متبرّک تیرتھوں کی سیر کے شوق میں متھرا ، بنارس ، بندراین ، گیا ، ہردوار اور جگن ناتھ وغیرہ گئے اور ایک رسالہ ''تیرتھ یاترا'' لکھا ۔ اقبال انھیں قدم قدم پر یاد آئے ۔ وہ ان دنوں کیمبرج میں زیرِ تعلیم تھے ۔ چنانچہ انھوں نے وہاں سے ۲۵ اپریل ۱۹۰۶ء کو لکھا :

''سرمست سیّاح کو سلام ۔ متھرا ، ہردوار ، جگن ناتھ ، امر ناتھ جی سب کی سیر کی ، مبارک ہو ۔ مگر بنارس جا کر لیلام ہو گئے ۔ کیوں ٹھیک ہے نا ؟ بلکہ ہمارے میر صاحب نیرنگ اور اکرام کو بھی ساتھ لے ڈوبے ۔

میرے پہلو میں ایک چھوٹا سا بُت خانہ ہے کہ ہر بُت اس صنم کدے کا رشکِ صنعتِ آزری ہے ۔ اس پُرانے مکان کی کبھی سیر کی ہے ؟ خدا کی قسم ! بنارس کا بازار فراموش کر جاؤ ۔ میں تو ہر قدم پر آپ کو یاد آتا تھا ۔ کیوں نہ یاد آؤں ؟ آپ بھی ہم کو یہاں عموماً یاد آیا کرتے ہیں ۔''[1]

اقبال کو انگلستان اور جرمنی میں جو علمی فتوحات حاصل ہو رہی تھیں ، ان کو خواجہ صاحب خوب اچھالتے تھے ۔ اس بنا پر بعض دوست خواجہ صاحب ہی کو قابلِ مبارک باد سمجھتے تھے ۔

۱۔ اقبال نامہ ، جلد دوم ، ص ۳۵۶ ۔

اقبال نے ۱۰ فروری ۱۹۰۸ء کو لندن سے خواجہ صاحب کو لکھا :

''میری کامیابیوں پر جو لوگ آپ کو مبارک باد دیتے ہیں ، راستی پر ہیں - مجھ میں اور آپ میں فرق ہی کیا ہے ؟ دیکھنے کو دو ، حقیقت میں ایک ۔''۱

اقبال ولایت سے پی ایچ ۔ ڈی اور بیرسٹری کی سند لے کر واپس آئے تو خواجہ صاحب نے ان کی شان میں بہت کچھ لکھا ۔ اس احسان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو سیالکوٹ سے اقبال نے نہایت انکسار سے تحریر فرمایا :

آپ لوگوں کو میرا مشتاق بناتے ہیں ۔ مجھے کچھ اعتراض نہیں ، مگر اندیشہ ہے کہ مجھ سے مل کر انھیں مایوسی نہ ہو ـــــ آپ اپنی ہر تحریک میں بغیر پوچھے مجھے شریک تصور کیجیے ۔ مگر جس درد نے کئی مہینوں سے مجھے بیتاب کر رکھا ہے ، جو مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا ، جو مجھے تنہائی میں رُلاتا ہے ، اس کی وجہ مجھ سے پہلے سن لیجیے ، پھر جو چاہے کیجیے ۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور آپ میرے ساتھ ۔''۲

۲۴ جون ۱۹۱۲ء کو پھر لکھتے ہیں :

''آپ سے ملنے کو دل چاہتا ہے مگر کیا کروں ، علائق نہیں چھوڑتے ۔ روٹی کا دھندا لاہور سے باہر نکلنے نہیں دیتا ۔

۱۔ اقبال نامہ ، جلد دوم ، ص ۳۵۸ ۔

۲۔ اقبال نامہ ، جلد دوم ، صفحات ۳۶۰-۳۶۱ ۔

کیا کروں عجب طرح کا قفس ہے ۔''[1]

ہندوستان میں احیائے اسلام کی خاطر جو بزرگ اُس وقت مختلف حلقوں میں کام کر رہے تھے، اخبار ''توحید'' میرٹھ میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے اقبال کا نام نہ لیا ۔ شاید کسی وجہ سے چُوک ہو گئی ۔ اقبال نے اس فرو گزاشت پر دوستانہ شکوہ کرتے ہوئے خواجہ صاحب کو لکھا :

''خدا آپ کا بھلا کرے کہ آپ نے ہندوستان کے پُرانے بُت کدے میں ''توحید'' کی مشعل روشن کی ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ دل اس کی حدّت سے گرمائیں گے اور آنکھیں اس کے نُور سے منوّر ہوں گی ۔ میں بھی اپنی بساط کے موافق کچھ نہ کچھ حاضر کروں گا ۔

مسلمانانِ ہندوستان کی بیداری کے پانچ اسباب ، جو آپ نے اس ہفتے کے ''توحید'' میں ارقام فرمائے ہیں ، بالکل بجا ہیں ۔ لیکن آپ نے یہ نہیں لکھا کہ اقبال ، جس نے اسلامی قومیت کی حقیقت کا راز اُس وقت منکشف کیا جب ہندوستان والے اس سے غافل تھے اور جس کے اشعار کی تاریخ ''زمیندار'' ، ''کامریڈ'' ، بلقان ، طرابلس اور نواب وقار الملک کی حق گوئی کی تاریخ سے پہلے کی ہے ، کس کا خوشہ چین ہے ؟ شاعروں کی بدنصیبی ہے کہ اُن کا کام بُرا بھلا ، جو کچھ بھی ہو ، غیر محسوس ہوتا ہے اور ظاہر بیں آنکھیں

۱۔ اقبال نامہ ، جلد دوم ، ص ۳۶۵ ۔

مرئیات کی طرف قدرتاً زیادہ متوجہ ہوتی ہیں ۔

اس خط کا مقصد شکایت نہیں اور نہ یہ کہ اقبال کے کام کا اشتہار ہو ۔ حسن نظامی کو خوب معلوم ہے کہ اس کا دوست اشتہار پسند مزاج لے کر دنیا میں نہیں آیا ، مگر یہ مقصد اس خط کا ضرور ہے کہ ایک واقفِ حال دوست کی غلط فہمی دُور ہو ، تاکہ اقبال کی وقعت اپنے دوست کی نگاہ میں محض اس خیال سے کم نہ ہو کہ اس نے مسلمانانِ ہندوستان کی بیداری میں حصہ نہیں لیا :

بکلامِ بیدل اگر رسی ، مگذر ز جادۂ منصفی
کہ کسی نمی طلبد ز تو صلۂ دگر مگر آفریں''[۱]

۱۹۱۴ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے انتیسویں سالانہ اجلاس میں لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کے رنگ میں چند چھوٹی چھوٹی طنزیہ و مزاحیہ نظمیں سنائیں ۔ انھوں نے تو مذاقاً ان کا عنوان ''رگڑا'' رکھا تھا مگر وہ کتابی صورت میں ''اکبری اقبال'' کے نام سے شائع ہوئیں ۔ خواجہ حسن نظامی نے ان کی نہایت شگفتہ تمہید لکھی ۔ کتاب ''اکبری اقبال'' اب نایاب ہے مگر اس کی بعض منتخب نظمیں ''بانگِ درا'' میں آ گئی ہیں ۔ خواجہ صاحب کی تمہید ، جو تبرّک کا درجہ رکھتی ہے ، ان کی یادگار کے طور پر ذیل میں درج کی جاتی ہے :

''لاہور میں سیالکوٹ کے رہنے والے ایک آدمی رہتے ہیں ،

۱۔ اقبال نامہ ، جلد دوم ، صفحات ۳۶۵-۳۶۶ ۔

جن کا نام محمد اقبال ہے ، اور ڈاکٹر ہے اور بیرسٹر ہے اور پی ایچ - ڈی ہے - وہ شعر گاتے ، شعر بجاتے اور موقع پاتے ہیں تو شعر پیدا بھی کر لیتے ہیں -

میں نے ان کو آدمی اس ڈر سے کہا کہ جو لوگ آدمیّت کی عینک لگائے ہوئے ہیں اور اقبال ان کو آدمی ہی نظر آتے ہیں ، کہیں وہ مجھ سے ثبوت نہ مانگ بیٹھیں ، ورنہ میں اقبال کو پیکرِ خاک نہیں سمجھتا اور ان کے پُتلے کو آدم زاد نہیں جانتا - ممکن ہے کہ وہ بشر ہوں مگر ان کی بشریت فقط ان کے بیوی بچوں یا ان کے لیے مبارک ہو ، جو ان کو گورا چٹا مونچھوں والا عقل مند پروفیسر و بیرسٹر کہتے ہیں -

میں نے پروفیسر اقبال کو بھی دیکھا ہے اور ڈاکٹر اقبال کو بھی ، سیالکوٹی اقبال کو بھی اور لاہوری اقبال کو بھی ، یورپین اقبال کو بھی دیکھا ہے اور لندنی اقبال کو بھی ، مگر آدمی کبھی نہیں پایا - وہ ازل سے حیوان ہیں اور حیاتِ ابدی کے نشان ہیں - ہندوستان کے آدمی حیوان کے لفظ کو مکروہ جانتے ہیں مگر میں اس لفظ میں وہ جان پاتا ہوں جو ہندوستان کے کسی انسان میں نہیں -

برسات میں مکھیّاں اور پروانے دونوں پیدا ہوتے اور دونوں جاندار کہلاتے ہیں ، مگر ایک آدمی کو ستاتا اور مگسِ بے حیا نام پاتا ہے اور دوسرا شمع کے رُخ پر قربان ہو جاتا ہے اور عبرت ڈھونڈنے والوں کو صبح کے وقت

اپنی لاش دکھا کر رُلاتا ہے۔

اقبال بھی ایک پروانہ ہے جو اَن دیکھی شمع کا دیوانہ ہے۔ مکھیاں اس کے اشعار کو مٹھاس سمجھ کر چاٹتی ہیں اور پروانے شعلہ سمجھ کر قربان ہونے آتے ہیں۔

اقبال ہمیشہ آسمان پر اڑتے ہیں۔ زمین پر کبھی آنا ہوتا ہے تو اُس زمین میں جو آسمان سے زیادہ دُور ہوتی ہے۔ اس لیے وہ لوگ جن کے پاس ہوائی جہاز نہیں ہیں، یہ کہتے رہ جاتے ہیں کہ اقبال کہاں ہیں؟ ہم ان تک کیونکر پہنچیں؟

ایک دن بھری سبھا کے اندر اقبال زمین پر آئے اور چند جملے ان کی زبان میں سنائے جو زمانے کی زبان کہلاتے ہیں، جن کا نام اکبر ہے، جو الہ آباد میں بیٹھ کر اللہ کی آبادیاں بساتے ہیں۔ اکبر کے ہم زبان ہو کر بولنا آسان بات نہیں ہے۔ اکبر اشارات ربّانی کے حامل ہیں۔ اکبر کو گویا کرنے والا پہلے آنکھ سے دیکھتا ہے، پھر قلم سے لکھواتا ہے۔ اکبر کی ہر بات زمین آسمان کو ایک کر دیتی ہے۔ ہر قول وہ وجود لے کر آتا ہے جس کو انگریزی میں کیرکٹر کہتے ہیں۔ اکبر نے اُس دھوپ میں بال سفید کیے ہیں جس نے اسلامی سلطنت کا باغ خشک کر دیا۔ اقبال نے اکبری زبان میں جو کچھ کہا ہے وہ ''اکبری اقبال'' ہے۔ خلقت اس کو دیکھتی ہے کہ اقبال

نے کس حد تک اکبر کی روش کو نباہا ہے اور اکبر کی طرح کیونکر تنگ قافیوں کو کشادہ کیا ہے ۔ مگر دیکھنا یہ تھا کہ زمانہ اکبر کی زبان میں بولتے بولتے اب اقبال کی زبان میں بھی آیا ہے ۔ خدا خیر کرے ۔ دیکھیے ان حروف کے پردے سے کیا نکلنے والا ہے ۔

ہندو استھان کی بے قراری میں کام کی باتیں درکار ہیں جن میں نتائج ہوں اور چلنے کے لیے راستہ ہو ۔ عبرت کے لیے دل خوش کن آگاہی و تنبیہ ہو ۔ اکبر و اقبال کا ابتدا سے یہی شیوہ رہا ہے مگر اقبال نے اَور طریق سے کہا اور اکبر نے اَور پیرایے سے ۔ اس نظم میں جو منشی مرغوب رقم صاحب کے ذریعے شائع ہوتی ہے ، اقبال نے اکبری نقشِ قدم پر پاؤں اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ مضبوطی سے ہر نشان پر پاؤں جمایا ہے ۔ مجھ سے کہے ہیں کہ میں اس نظم پر وہ لکھوں جس کو لوگ ریویو کہتے ہیں ، مگر میں پوچھتا ہوں کہ بہتے ہوئے دریا کی روانی کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ دوسرا اس کے تیز بہاؤ کی حقیقت پر لیکچر دے ۔ موجیں مارنے والا سمندر جب خود نظر آتا ہے تو کسی کا یہ کہنا کہ کشتیاں چکرا جائیں گی ، سواریوں کو چکر آئیں گے ، بادل اٹھیں گے اور زمین پر مینہ برسائیں گے ، فضول ہے ۔ جاننے والے خود جانتے ہیں کہ یہ طوفان کسی موسم کی خبر دیا کرتا ہے ۔ اس واسطے میں اس نظم کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا ۔ اور نہ کہنا

ہی اس کی اعلیٰ شان کی دلیل ہے ۔"

۱۹۱۵ع کے آغاز میں خواجہ صاحب نے اقبال کی اسلامی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں "سرّ الوصال" کا خطاب عطا کیا ۔ اقبال نے ۶ فروری ۱۹۱۵ع کے خط میں لکھا :

"آپ کی سرکار سے جو خطاب مجھے عطا ہوا ہے ، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ لیکن وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت و استحکام پر بحث کی ہے ، اب تقریباً تیار ہے اور پریس میں جانے کو ہے ۔ اس کے لیے کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمائیے ۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کا نام اسرار حیات ، پیام سروش ، پیام نو ، آئین نو تجویز کیے ہیں ۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمائیے اور نتائج سے مجھے مطلع کیجیے تاکہ میں انتخاب کر سکوں ۔"[۱]

یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ خواجہ صاحب نے اس مثنوی کے لیے کون کون سے نام تجویز کیے ، البتہ یہ ۱۹۱۱ع سے ۱۹۱۵ع تک مختلف وقتوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے لکھی جاتی رہی اور اس کے بعض بعض اشعار خاص خاص دوستوں کو ملاحظے اور مشورے کے لیے بھیجے بھی جاتے رہے ۔ البتہ اقبال نے ۱۹۱۵ع میں اسے "اسرار خودی" کے نام سے پیش کیا ۔ اس سے قبل یکم اگست ۱۹۱۳ع کے ہفتہ وار "توحید" میرٹھ میں ، جو خواجہ حسن نظامی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا ، اقبال کے چند اشعار نظر آتے ہیں ، جو "مثنوی اسرار خودی"

۱- اقبال نامہ ، جلد ۲ ، ص ۳۶۸ ۔

کے عنوان سے مندرجہ ذیل تمہید اور تعارف کے ساتھ شائع ہوئے تھے :

''یہ نظم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی شہرۂ آفاق اور ہردلعزیز شاعری میں ایک نئے باب کا افتتاح کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خواب میں دیکھا کہ حضرت مولانا روم ارشاد فرماتے ہیں ''اقبال ! مثنوی لکھو''۔ عرض کیا ''مثنوی کا حق تو آپ ادا کر گئے''۔ فرمایا ''نہیں ، تم بھی لکھو''۔ التماس کی ''آپ فرماتے ہیں خودی کو مٹاؤ اور مجھ کو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ خودی قائم کرنے کی چیز ہے''۔ ارشاد ہوا ''نہیں ، ہمارا مطلب بھی یہی ہے جو تم سمجھتے ہو''۔ آنکھ کھلی تو زبان پر یہ شعر تھے ، جن کو قلم بند کرنا شروع کیا۔ پہلی قسط اخبار ''توحید'' کے ذریعے شائع کی جاتی ہے ، جس میں کچھ حصہ نعت کا ہے اور کچھ متفرق اشعار قیامِ خودی کی نسبت ہیں۔ نوکری کی نسبت جو کچھ جنابِ اقبال کے قلم سے نکلا ہے ، وہ اس قابل ہے کہ دورِ حاضر کے وہ تمام نوکری پرست لوگ ، جو دوسروں کی غلامی کے لیے باہمی کشمکش میں مبتلا ہیں ، غور سے پڑھیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ ہم غلام بنیں گے۔ مسلمان کہتے ہیں یہ حلقہ ہمارے کان میں ڈالنا چاہیے۔ ایسے داروگیر کے زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم ہندوستانیوں میں ایک نئی زندگی پیدا کرے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ ناظرینِ ''توحید'' اس نظم کو خود بھی یاد کریں اور اپنے دوستوں کو بھی

یاد کرائیں ۔''[1]

اس کے کئی سال بعد جون ۱۹۵۰ع کے ''منادی'' دہلی میں خواجہ صاحب نے واشگاف الفاظ میں لکھا :

''ڈاکٹر سر محمد اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' کا نام میں نے تجویز کیا تھا ۔ اور بھی کئی نام تجویز کیے تھے مگر انھوں نے اس کو پسند کیا ۔''[2]

مثنوی ''اسرارِ خودی'' کا شائع ہونا تھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا ۔ چونکہ مثنوی کا علمِ کلام عام سطح سے بلند تھا ، اس لیے تصوف کے بعض مسائل مثلاً وحدت الوجود ، تنزلاتِ ستہ اور رہبانیت وغیرہ سے لوگوں نے اختلاف کیا اور مخالفت کا ایک زبردست طوفان اٹھ کھڑا ہوا ۔ بعض صوفی ، پیر اور سجادہ نشین ، جنھیں روایاتِ باطلہ کی پابندی اور شریعتِ حقہ سے ناواقفیت کی نمایندگی کا شرف حاصل تھا ، اقبال کے خلاف صف آرا ہوگئے اور انھوں نے خوب خوب ضربیں لگائیں ۔ تعجب کی بات ہے کہ خواجہ حسن نظامی اور ان کے مرید اس جنگ میں سب سے پیش پیش تھے ۔ خواجہ صاحب نے اس بات کا تو اعتراف کیا کہ :

''حضرتِ اقبال کے کمالِ شاعری ، سوز و گداز اور اس اثر سے انکار کرنا ، جس نے مسلمانوں کی موجودہ نسل کو بیدار کیا ، آفتاب کے وجود سے انکار کرنا ہے ۔ وہ میرے اس زمانے سے دوست ہیں جب ان کی کارگزاری نے نیا نیا نشان

۱۔ ہفتہ وار ''توحید'' میرٹھ ، یکم اگست ۱۹۱۳ع ۔

۲۔ ماہنامہ ''منادی'' دہلی ، بابت جون ۱۹۵۰ع ۔

بلند کیا تھا ۔ میں ہمیشہ ان کے عَلم کے نیچے رہا ۔ میں
نے زبان سے ، قلم سے اور ہر ایک طریقے سے ، جس پر مجھ
کو قابو تھا ، اقبال کے خیالات کی تبلیغ کی ۔ میرے
عقیدے میں اقبال کا پایہ اس توصیف سے بھی کہیں بلند
ہے جس کو جنابِ ''کشاف'' نے بیان کیا ہے ۔[1]

لیکن اس کے باوجود مثنوی کے خلاف نہ صرف انھوں نے خود نہایت زوردار مضامین لکھے بلکہ دوسروں سے بھی لکھوائے ۔ چنانچہ آپ نے کہا :

''میں اقبال کی نیّت پر حملہ نہیں کروں گا ۔ اس لیے نہیں کہ وہ میرے دوست ہیں ، اس لیے نہیں کہ وہ بڑے آدمی ہیں ، بلکہ اس لیے کہ سالہا سال سے میں ان کے خیال و ارادے کو جانتا ہوں ۔ انھوں نے تو یہ مثنوی اپنی دانست میں مسلمانوں کے فائدے کے لیے لکھی ہوگی مگر اس سے سخت خطرے پیدا ہوں گے اور مسلمانوں کے اصولی عقائد میں تزلزل پڑ جائے گا ۔ درحقیقت یہ مثنوی اقبال کی نہیں بلکہ اقتضائے وقت کی لسانِ حال ہے ۔ وقت کی خواہش ہے کہ مشرقی مغربی بن جائیں ۔ مگر کیا وہ ایسا کر سکے گا ؟ اس سے کہہ دو کہ نہیں :

سانجھے گھر کا بالکا مرے نہ مارا جائے

۱۔ مضمون ''کشّافِ خودی'' از خواجہ حسن نظامی ، مطبوعہ اخبار ''وکیل'' امرتسر ، ۲۹ دسمبر ۱۹۱۵ء ۔ نیز مجلہ ''اقبال'' لاہور ، اکتوبر ۱۹۵۳ء ، ص ۷۶ ۔

حضرتِ حافظ (شیرازی) کی اقبال نے کیسی آبرو ریزی کی ہے ، کیسے کریہہ الفاظ سے ان کو یاد کیا ہے ۔ اگر وہ سچے ہیں کہ حافظ کے کلام نے مسلمانوں کو کم ہمت بنا دیا ہے تو میں پوچھوں گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دنیائے مردار کی مذمّت کی تھی ، اس سے مسلمانوں کی ہمت نہ ٹوٹی؟ حضورؐ اور سب صحابہ دین کو مقدّم اور دنیا کو مؤخّر کہتے تھے ۔ انھوں نے کیسی کیسی فتوحات کیں ۔ ''اسرارِ خودی'' دنیا کو مقدّم کہہ کر کیا دکھا سکے گی ؟ ''اسرارِ خودی'' میں کن کن یورپین فلاسفروں کی روح ہے ؟ اس کو ذرا سمجھ لینے دو ۔ گو ہم بےعلم ہیں ، بے سہارا ہیں مگر دین کی حمایت میں ہم سے جو کچھ بن پڑے گا ، کریں گے ۔ اقبال سے خدانخواستہ دشمنی نہیں لیکن دوستی کو عقائد میں حائل ہونے کا کوئی حق نہیں ۔ مسلمان اپنی مذہبی رائے میں کسی دنیاوی تعلق کا پابند نہیں ہو سکتا ، لہٰذا میں بھی نہیں ہوں ۔''[۱]

اسی پر ہی بس نہیں کی ، خواجہ صاحب نے مندرجہ ذیل آٹھ سوال مرتّب کر کے بعض مشائخِ کرام کے پاس بھیجے اور ان کے جوابات کی ، جو مثنوی پڑھے بغیر دیے گئے تھے ، خوب خوب اشاعت کی :

(۱) ''کیا قرآن شریف عقیدۂ وحدت الوجود کا مخالف ہے ؟

۱۔ سہ ماہی ''اقبال'' ، لاہور ، اکتوبر ۱۹۵۳ع ، صفحات ۷۸-۷۹ ۔

(۲) کیا توحید اور وحدت الوجود دو جدا گانہ اشیا ہیں ؟
(۳) کیا اسلام صرف انانیّت مٹانے کو آیا ہے ؟
(۴) تصوّف کا انتہائی نتیجہ اور مقصود کیا ہے ؟
(۵) کیا صحابۂ کرام میں کیفِ سُکر مثل خواجہ حافظ شیرازی کے کسی میں نہ تھا ؟
(۶) صوفیوں کی حالت سلوک کے کسی مقام کو مفید ہے یا نہیں ؟
(۷) کیا کیفیتِ وحدت الوجود کسی مقام کا نام ہے اور اس مقام کے بعد کیا مقام ہے ؟ کیا حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعد عدمِ محض تسلیم کیا ہے اور یہ مذہبی امور میں مفید ہے یا نہیں ؟
(۸) کیا وحدت الوجود محض علمی مسئلہ ہے یا اس کو مذہب سے بھی کچھ تعلق ہے ؟''

خواجہ صاحب نے اس سے بھی آگے بڑھ کر ۳۰ جون ۱۹۱۶ء کے رسالۂ ''خطیب'' دہلی میں ''سرِّ اسرارِ خودی'' کے عنوان سے مثنوی کے اصول پر بحث کی اور مندرجہ ذیل پانچ وجوہ کی بنا پر اسے نامعقول قرار دیا :

اوّل : ''یہ کہ اقبال نے مثنوی میں خودی کی حفاظت پر جو کچھ لکھا ہے ، وہ کچھ انوکھا اور نرالا نہیں بلکہ قرآن شریف کی تعلیم سے بہت ہی کم ہے ۔ لہٰذا بمقابلۂ قرآن اس کی ضرورت نہیں ۔

دوم : یہ کہ دیباچے میں مسئلۂ وحدت الوجود اور صوفیوں

کو ملزم قرار دیا گیا ہے کہ ترکِ خودی کا جذبہ اس مسئلے اور وحدت الوجود کے مقلّد صوفیہ کے سبب قوم میں پیدا ہوا۔ پرائیویٹ خط وکتابت میں بھی حضرت اقبال نے اس پر بہت زور دیا ہے اور اُن کے احباب بھی صاف صاف کہتے ہیں کہ اس مثنوی کا اصل مقصد صوفی تحریک کا دنیا سے مٹانا ہے۔ بس چونکہ ان کا ارادہ بے بنیاد ہے اور وہ قیامت تک اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے، لہٰذا میں بھی اس مثنوی کو بے نتیجہ تصوّر کرتا ہوں، اور لغویّت سے اختلاف ضروری ہے۔

سوئم: مصنّف نے دیباچے میں مسلمانوں کو بہ پیرویٔ حکمائے یورپ اپنے عقائد بدل دینے کی صلاح دی ہے۔

چہارم: یہ مثنوی گو خود داری سکھاتی ہے مگر ساتھ ہی اس کے مغربی خود غرضی بھی سکھاتی ہے، جو اسلام کے سراسر خلاف ہے۔

پنجم: اس مثنوی نے میری خودی کی توہین کی ہے۔"[۱]

جب علامہ اقبال کے عقائد کی نسبت لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلنی شروع ہوئیں اور مسائل کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا تو اُنھوں نے مخالفوں کے اعتراضات کا جواب دینے اور اپنے نظریے کی وضاحت کرنے کے لیے خود بھی چند مضامین لکھے جو اُس وقت کے

۱۔ خطیب، دہلی، ۳۰ جون ۱۹۱۶ع۔

اخباروں بالخصوص ''وکیل'' امرتسر اور ''نیو ایرا'' (انگریزی اخبار) لکھنؤ میں شائع ہوئے۔ خواجہ حسن نظامی کو خاص طور پر مخاطب کر کے آپؒ نے فرمایا:

''مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ کو اسلام اور پیغمبر اسلامؐ سے عشق ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ کو ایک حقیقتِ اسلامی معلوم ہو جائے اور آپ اس سے انکار کریں؟ بلکہ مجھے ابھی سے یقین ہے کہ آپ بالآخر میرے ساتھ اتفاق کریں گے۔ میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے کہ میرا فطری اور آبائی میلان تصوّف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی قوی ہو گیا ہے، کیونکہ فلسفۂ یورپ بحیثیتِ مجموعی وحدت الوجود کی طرف رخ کرتا ہے، مگر قرآن پر تدبّر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا۔ اور اس مقصد کے لیے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔''[1]

اس کے بعد علامہ اقبال نے ایک ایک کرکے ہر اعتراض کا جواب نہایت وضاحت اور جامعیت سے دیا۔ مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک مسئلے میں بھی صاف گوئی سے کام لیا۔ بڑے آدمیوں کی طرح کوئی

۱۔ سہ ماہی ''اقبال'' لاہور، اپریل ۱۹۵۴ع، ص ۴۴۔

ایسی بات نہ کی جس سے موقع بہ موقع کترا کے نکل جانے کی گنجائش باقی رہتی ۔ ان کو اپنے آپ پر پورا اعتماد تھا ۔ وہ فلسفی ، مفکر اور اس کے علاوہ بہت اچھے قانون دان بھی تھے ۔ وہ جو کچھ بھی کہتے یا لکھتے ، اس میں جذبات کو اتنا زیادہ دخل نہ ہوتا جتنا کہ سوچ سمجھ اور فکر و تدبر کو دخل ہوتا تھا ۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ، اس میں مغز اور دلائل کے علاوہ ایک اچھے قانون دان اور اچھی وکالت کرنے والے کا منطقی ربط بھی تھا ۔ اپنی بحث سمیٹتے ہوئے حضرت علامہ نے فرمایا :

''مندرجہ بالا سطور سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ فلسفیانہ اور مورخانہ اعتبار سے مجھے بعض ایسے مسائل سے اختلاف ہے جو حقیقت میں فلسفے کے مسائل ہیں مگر جن کو عام طور پر تصوف کے مسائل سمجھا جاتا ہے ۔ تصوف کے مقاصد سے مجھے کیونکر اختلاف ہو سکتا ہے ؟ کوئی مسلمان ہے جو ان لوگوں کو بُرا سمجھے جن کا نصب العین محبتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے ؟ وہ اس ذریعے سے ذاتِ باری سے تعلق پیدا کر کے اپنے اور دوسروں کے ایمان کی پختگی کا باعث ہوتے ہیں ۔ اگر میں تمام صوفیا کا مخالف ہوتا تو مثنوی میں ان کی حکایات و مقولات سے استدلال نہ کرتا ۔''[1]

حضرتِ علامہ کو اپنے خیالات کی صحت و صداقت پر پورا پورا

۱- سہ ماہی ''اقبال'' لاہور ، اکتوبر ۱۹۵۳ع ، صفحات ۹۴ - ۹۵ -

یقین تھا - اس سلسلے میں انھوں نے کئی خط مہاراجہ کشن پرشاد شاد مدارالمہام حیدر آباد دکن کو بھی لکھے - ۱۴ اپریل ۱۹۱۶ع کے مکتوب کی مندرجہ ذیل سطور میں جو پیش گوئی کی گئی وہ حرف بحرف پوری اتری - فرمایا :

"یہ مثنوی ، جس کا نام 'اسرارِ خودی' ہے ، ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے - میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سُکر و مستی و بے خودی کی طرف ہے - مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے ، میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی ، بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے - اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لیے کیوں انتخاب کیا گیا ! جب تک اس کا دوسرا حصہ ختم نہ ہو لے گا ، میری روح کو چین نہ آئے گا - اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ بس میرا یہی ایک فرض ہے اور شاید میری زندگی کا اصل مقصد بھی یہی ہے - مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہوگی کیونکہ ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار ہیں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر و اجزا و اسباب کو اپنے شکار (خواہ وہ شکار کوئی قوم ہو ، خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے ، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدنصیب شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربّی تصوّر کرتا ہے - مگر :

بن صدائے شاعرِ فرداستم

اور :

نا امیدستم ز یارانِ قدیم
طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

نہ حسن نظامی رہے گا نہ اقبال ۔ یہ بیج جو مردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے ، اُگے گا ، ضرور اُگے گا اور علی الرغمِ مخالفت بارآور ہوگا ۔ مجھ سے اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے ۔ الحمد للہ ۔"[۱]

اس موقع پر حضرتِ اکبر الہ آبادی نے ثالث بالخیر کا کردار ادا کیا ۔ اُنھوں نے پہلے تو اس ہنگامۂ مخالفت کو کوئی اہمیت ہی نہ دی بلکہ سرسری طور پر اپنے رنگ میں کہہ دیا کہ کیوں دیوانے ہوئے جاتے ہو ؟ تصوف کے مسائل اس طرح حل نہیں ہوں گے :

حضرتِ اقبال اور خواجہ حسن
پہلوانی اِن میں ، اُن میں بانکپن

جب نہیں ہے زور شاہی کے لیے
آؤ گُتھ جائیں خدا ہی کے لیے

ورزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی
ہاتھا پائی کو تصوف ہی سہی

۱۔ "صحیفہ" ، لاہور ، اقبال نمبر ، حصہ اول ، صفحات ۱۶۸ - ۱۶۹ ۔

هست در هر گوشۂ ویرانہ رقص
می کنند دیوانہ با دیوانہ رقص[1]

لیکن جب معاملہ حد سے بڑھ گیا اور بحث اُلٹی سیدھی ہو کر پٹڑی سے اترنے لگی تو اقبال نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے حضرتِ اکبر کو لکھا:

"۲۷ جنوری ۱۹۱۶ء ـــ انشاءاللہ اختلافِ رائے کا اثر پرائیویٹ تعلقات پر نہ ہوگا۔ میں نے تو صرف ایک دو خط شائع کیے تھے، اور وہ بھی اُس وقت جب خواجہ حسن نظامی نے خود مضامین لکھے اور اپنے احباب سے لکھوائے۔ ان مضامین کی مجھے کوئی شکایت نہیں۔ شکوہ صرف اس امر کا تھا کہ پرائیویٹ خطوں میں تو وہ مجھے لکھتے تھے اور لکھتے ہیں کہ تمھاری نیّت پر کوئی حملہ نہیں، لیکن اخباروں میں اس کے برعکس لکھتے ہیں۔ میں نے خواجہ صاحب سے اس امر کی شکایت کی تھی اور نہایت صاف باطنی کے ساتھ لکھا تھا کہ آپ میرے ساتھ ناانصافی نہ کریں۔ علمی بحث ہونی چاہیے۔ حریف کو بدنام کرنا مقصود نہ ہونا چاہیے بلکہ اس کو قائل کرنا اور راہِ راست پر لانا (مقصود ہونا چاہیے)۔

بہرحال وہ معذور ہیں۔ وہ صوفی ضرور ہیں مگر تصوّف کی تاریخ و ادبیات اور علوم القرآن سے مطلق واقفیت نہیں رکھتے،

۱۔ خطوطِ اکبر، بنام خواجہ حسن نظامی، ص ۲۴۔

اس واسطے مجھے ان کے مضامین کا مطلق اندیشہ نہیں ۔''[۱]
ایک اور خط میں اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے اسی بات کو دہرایا :

''۴ فروری ۱۹۱۶ء ـــــ میں تصوّف کی تاریخ پر ایک مبسوط مضمون لکھ رہا ہوں ، جو ممکن ہے کہ ایک کتاب بن جائے ۔ چوں کہ خواجہ حسن نظامی نے عام طور پر اخباروں میں میری نسبت مشہور کر دیا ہے کہ میں صوفیائے کرام سے بد ظن ہوں ، اس واسطے مجھے اپنی پوزیشن صاف اور واضح کرنی ضروری ہے ، ورنہ اس طویل مضمون کے لکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔ چوں کہ میں نے خواجہ حافظ پر اعتراض کیا ہے ، اس واسطے ان کا خیال ہے کہ میں تحریکِ تصوّف کو دنیا سے مٹانا چاہتا ہوں ۔ ''سترِ اسرارِ خودی'' کے عنوان سے انہوں نے ایک مضمون ''خطیب'' میں لکھا ہے جو آپ کی نظر سے گزرا ہوگا ۔ جو پانچ وجوہ انہوں نے مثنوی سے اختلاف کرنے کے لیے لکھے ہیں ، انہیں ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے ۔

آپ کا قطعہ ''حضرتِ اقبال اور خواجہ حسن'' بہت خوب رہا ۔ صرف ایک بات ہے کہ خواجہ صاحب کو تو کبھی رقص اور سُکر نصیب ہوتا ہوگا ، میں اس نعمت سے محروم ہوں ۔''[۲]

۱۔ اقبال نامہ ، جلد دوم ، صفحات ۴۹ - ۵۰ ۔
۲۔ ایضاً ، صفحات ۵۱ - ۵۳ ۔

پھر ایک خط میں اپنے دلی جذبات کا اظہار اس طرح کیا :

''۲۵ جولائی ۱۹۱۸ء ــــ خواجہ حسن نظامی سے مجھے دلی محبّت ہے ، جس پر اختلافِ خیال کوئی اثر نہیں کر سکتا ۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ وہ اختلاف بھی، کم ازکم میرے علم اور سمجھ کے مطابق ، کوئی اختلاف نہیں ہے ۔ وہ کچھ عرصہ ہوا یہاں تشریف لائے تھے ۔ میں نے اصرار کیا کہ ایک آدھ روز قیام فرمائیے مگر وہ ٹھہر نہ سکتے تھے ۔ زبانی باتیں ہوتیں تو بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جاتیں ۔ لیکن جو کچھ بھی ہو اس سے محبّت میں کمی واقع نہیں ہو سکتی جو مجھ کو ان سے ہے ۔ وہ ایک نہایت محبوب آدمی ہیں ۔ ان کو جان کر ان سے محبت نہ رکھنا ممکن نہیں ۔''[1]

آخر حضرتِ اکبر نے ایک طرف تو اقبال کو روکا کہ اس قسم کی بحث غیر ضروری ہے ، دوسری طرف خواجہ حسن نظامی کو مشورہ دیا :

اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رد
قومی رکنوں کے ہیں نگہبان وہ بھی
تم محو ہو حسن کی تجلی میں اگر
ہیں دشمنِ فتنۂ رقیبان وہ بھی

۱۔ اقبال نامہ ، جلد دوم ، صفحات ۶۳ - ۶۴ ۔

پریوں کے لیے جنون ہے تم کو اگر
دیووں کے لیے بنے سلیماں وہ بھی

اس پر دونوں خاموش ہو گئے - میں نے اس تمام بحث کو نہایت تفصیل کے ساتھ اپنے مضمون ''معرکۂ اسرارِ خودی'' میں بیان کیا ہے ، جو مجلۂ ''اقبال'' لاہور بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء اور اپریل ۱۹۵۴ء میں چھپ چکا ہے - یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں - لبِ لباب یہ ہے کہ اقبال کو اس قلمی جنگ میں کامیابی نصیب ہوئی - انھوں نے مثنوی کے دوسرے نقش میں بعض جگہ لفظی ترمیمیں کر کے میدان مار لیا - ان کا فلسفۂ خودی مقبولِ خاص و عام ہوا - خواجہ حسن نظامی بھی پہلے کی طرح ہمنوا اور شیر و شکر ہو کر اقبال کی دوستی کا دم بھرنے لگے -

۱۹۱۸ء میں پھر غلط فہمی کے آثار پیدا ہوئے لیکن بات بڑھنے نہ پائی تھی کہ صفائی ہو گئی - پہلی عالمی جنگ کی وجہ سے روزنامہ ''زمیندار'' پر حکومت نے پابندی عاید کر کے مولانا ظفرعلی خاں کو ان کے گاؤں کرم آباد میں نظر بند کر دیا تھا - مگر انھوں نے سیاسیات سے کنارہ کش رہنے کا وعدہ کرنے کے باوصف ایک نیا ہفتہ وار ''ستارۂ صبح'' جاری کر لیا تھا - اس اخبار کی گرمیٔ بازار کی خاطر انھوں نے جھوٹے تصوّف ، پیشہ ور صوفیوں اور جعلی پیروں کے خلاف ایک سلسلۂ مضامین شروع کر دیا - اس پر خواجہ حسن نظامی کو شبہ گزرا کہ یہ سب کچھ علامہ اقبال کی شہ پر ہو رہا ہے - بدمزگی بڑھنے ہی والی تھی کہ اقبال اور خواجہ حسن نظامی کے مشترک دوست میر غلام بھیک نیرنگ نے خواجہ صاحب کو ایک وضاحتی خط لکھ کر

مغالطہ دور کر دیا ۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے اقبال کو حسب ذیل معذرت نامہ لکھا :

''محب الفقراء جناب شیخ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب !

السلام علیکم ۔ آج محبّی میر نیرنگ صاحب کے خط نے مجھے ایک بڑے مغالطے سے بچا لیا اور میں ان کا از حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی ذاتی طمانیت کا اظہار کر کے مجھ کو ایک بدگمانی کے گناہ سے نجات دی ۔ میں آپ سے معذرت کرنے کو یہ خط لکھتا ہوں ۔ مجھے لاہور کے متعدد حضرات نے تحریری و زبانی اطلاعیں دی تھیں کہ اخبار ''ستارۂ صبح'' کی آڑ میں آپ ہیں ، مگر مجھے میر نیرنگ کا سب سے زیادہ یقین ہے ۔ اس لیے میں اپنی بدگمانی کو واپس لے کر آپ سے عذر کرتا ہوں ۔ اب مجھے اس تگ و دو میں آپ سے کوئی سروکار نہ ہوگا ۔[1]

مخلص دیرینہ حسن نظامی''

اس معذرت نامے کے جواب میں ۱۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو علامہ اقبال نے خواجہ صاحب کو جو خط لکھا وہ بھی پڑھنے کے قابل ہے :

''آپ کا خط کئی دن سے آیا رکھا ہے ۔ مجھے مصروفیت رہی ، اس وجہ سے جواب نہ لکھ سکا ۔ معاف کیجیے گا ۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ میر نیرنگ صاحب نے آپ کو خط لکھا ہے جس نے آپ کو ''بدگمانی کے گناہ''

۱۔ انوار اقبال ، ص ۱۸۳ ۔

سے بچا لیا ۔ الحمد للہ علٰی ذالک ۔

آپ کو معلوم ہے تقریباً دو سال ہوئے میں نے اُن اعتراضات کے جواب میں ، جو آپ نے مثنوی 'اسرارِ خودی' پر کیے تھے ، چند مضامین مسائلِ تصوّف پر لکھے تھے ، جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسئلۂ وحدت الوجود ان معنوں میں کہ ذاتِ باری تعالٰی ہر شے کی عین ہے ، قرآن سے ثابت نہیں ۔ اور روحانیت میں اسلامی تربیت کا طریق صحو ہے ، نہ کہ سُکر ۔ آپ ہی کے اخبار 'خطیب' میں حضرت صوفی قاری شاہ سلیمان نے ان دونوں مسائل کے متعلق میرے حق میں فیصلہ صادر فرمایا ۔ باوجود اس کے مجھے ہمیشہ اس بات کا تعجب رہا کہ آپ اور آپ کے احباب اس اختلاف کی وجہ سے مجھے کیوں دشمنِ تصوّف سمجھتے ہیں ؟ یہ اختلاف کوئی نئی بات نہیں بلکہ حضراتِ صوفیہ میں ایک عرصے سے موجود ہے ۔ بہرحال جن خیالات کا اظہار میں نے اخبار ''وکیل'' میں کیا تھا ، ان کی صحت اور صداقت کا مجھے اب تک یقین ہے ، گو ان پر بحث کرنا کئی وجوہ سے غیر ضروری جانتا ہوں ۔ عوام بلکہ خواص کو بھی ان اصولی امور میں کوئی دلچسپی نہیں اور نہ اس قسم کے مباحث اخباروں کے لیے موزوں ہیں ۔ ان سب باتوں کے علاوہ مولانا اکبر (الہ آبادی) نے (جن کا ادب و احترام میں اس طرح کرتا ہوں جس طرح کوئی مرید اپنے پیر کا احترام کرے) مجھے لکھا کہ یہ بحث غیر ضروری

ہے - اس دن سے آج تک میں نے ایک سطر بھی ان مباحث پر نہیں لکھی ، گو ذاتی فائدے کے خیال سے مطالعہ جاری رکھتا ہوں - اب جو مولوی ظفر علی خاں صاحب نے اخبار "ستارۂ صبح" میں یہ بحث دوبارہ چھیڑی تو بوجہ ان دیرینہ تعلقات کے ، جو میرے اور ان کے درمیان ہیں اور نیز اس وجہ سے کہ اس بحث میں مجھے کمال دلچسپی ہے ، بعض لوگوں کو بدگمانی ہوئی کہ "ستارۂ صبح" کے مضامین میں لکھتا ہوں یا لکھواتا ہوں ـــــ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے قلم سے ایک سطر بھی اس بحث پر نہ نکلی اور نہ میں نے مولوی صاحب موصوف کو کوئی مضمون لکھنے کی تحریک کی ، بلکہ پرائیویٹ گفتگو میں کئی امور میں میں نے ان سے اختلاف کیا ہے - اس کے علاوہ میں تو اصولی بحث کو ، جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں ، اخباروں کے لیے موزوں نہیں سمجھتا ، چہ جائیکہ کسی اَور کو اس کے جاری رکھنے کی تحریک کروں - البتہ موجودہ نتائج کے حالات پر لکھنے اور ہمدردانہ لہجے میں ان کے خیالات و رسوم کی تنقید کرنے سے قوم کو ضرور فائدہ ہوگا - اگر مولوی ظفر علی خاں یا آپ اس طرف توجہ کریں تو چشمِ ما روشن دلِ ما شاد - غرض کہ آپ کو میری نسبت بدگمانی کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی - اور اگر کسی وجہ سے بدگمانی ہو بھی گئی تھی تو آپ مجھ سے براہِ راست دریافت کر سکتے تھے - لوگ تو اس قسم کی باتیں اڑایا ہی کرتے

ہیں ۔ دو چار روز کا ذکر ہے ، ایک شخص نے بیان کیا کہ حسن نظامی صاحب نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اقبال نے اپنی ٹوپی ہمارے قدموں پر رکھ کر ہم سے معافی مانگی ہے اور آیندہ کے لیے توبہ کی ہے ۔ میں نے انھیں یہ جواب دیا کہ جن لوگوں کے عقائد و عمل کا مأخذ کتاب و سنّت ہے ، اقبال ان کے قدموں پر ٹوپی کیا ، سر رکھنے کو تیار ہے اور ان کی صحبت کے ایک لحظے کو دنیا کی تمام عزت و آبرو پر ترجیح دیتا ہے ، لیکن جو بات خواجہ حسن نظامی کی طرف منسوب کرتے ہو تو اس کے لغو ہونے میں کوئی شبہ نہیں ۔ زیادہ کیا عرض کروں ۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔ اگر آپ چاہیں تو یہ خط شائع کر سکتے ہیں ۔ والسلام ۔"[1]

اس مراسلت کے بعد خواجہ حسن نظامی نے ایک مضمون اپنے ہفت روزہ اخبار "خطیب" میں لکھا ، جس کا عنوان تھا "جناب اقبال و حسن نظامی"۔ اس میں یہ اعلان کیا :

"گزشتہ ایام میں جناب شیخ اقبال صاحب بیرسٹر پی ایچ ۔ڈی اور حسن نظامی کے درمیان مسئلۂ تصوّف میں اختلاف واقع ہوا تھا ۔ گفتگو آگے بڑھتی مگر ایک طرف تو جناب ڈاکٹر صاحب کو مولانا سیّد اکبر حسین صاحب الہ آبادی نے روکا اور دوسری جانب مجھے بھی ممانعت فرمائی ۔ میں

۱۔ انوار اقبال ، صفحات ۱۸۴ - ۱۸۶ ۔

حضرتِ اکبر کی ذات کو اپنا مرشدِ معنوی تصوّر کرتا ہوں
اس لیے اس گفتگو سے دست بردار ہو گیا اور خلقت کی اس
شہرت کو برداشت کرتا رہا کہ حسن نظامی اقبال سے علمی
بحث نہ کر سکا ، کیونکہ بدنامی بہتر تھی اپنے رہنمائے روح
کی عدمِ تعمیلِ ارشاد سے ۔"[1]

۱۹۳۵ع میں دہلی کے ہندو مسلمان اہلِ علم نے جناب سری رام آنجہانی مصنّفِ "خم خانۂ جاوید" (متوفی ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ع) کے مکان پر جمع ہو کر "غالب سوسائٹی" قائم کی ۔ اس کے صدر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی ، نائب صدر پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی ، خواجہ حسن نظامی دہلوی اور لالہ دیش بندھو گپتا تھے ۔ اور سیکریٹری میر محمد حسین مالک فرم زنگی قلم ، آغا محمد اشرف نبیرۂ مولانا محمد حسین آزاد اور جناب عشرت رحمانی تھے ۔ اس سوسائٹی نے ۱۵ فروری ۱۹۳۶ع کو پہلا "یومِ غالب" بڑے وسیع پیمانے پر منایا ۔ اراکینِ انجمن کے مشورے سے خواجہ حسن نظامی نے مقامی و بیرونی ہندو مسلم مشاہیر کو شرکت کی دعوت دی اور ہندوستان کے علمی سرپرستوں اور والیانِ ریاست کو غالب ڈے کی امداد و اعانت کے لیے تار بھیجے ۔ علامہ اقبال ان دنوں علیل تھے ، اس لیے خود بہ نفسِ نفیس تو تقریبات میں شریک نہ ہو سکے مگر انھوں نے اپنا الہامی پیغام خواجہ حسن نظامی کے نام بھیج دیا جو حسب ذیل تھا :

۱- انوارِ اقبال ، حاشیہ ، ص ۱۸۶ ۔

''جناب خواجہ صاحب ! دو سال سے علیل ہوں :

سخن اے ہمنشیں از من چہ خواہی
کہ من با خویش دارم گفتگوے

پیغام کے لیے مراقبہ کیا تو مرزا ہرگوپال تفتہ کی روح سامنے آئی اور دلی والوں کے لیے یہ دو شعر نازل کر کے غائب ہو گئی :

دریں محفل کہ افسونِ فرنگ از خود برد او را
نگاہِ پردہ سوز آور ، دلے دانائے راز آور
مئے ایں ساقیانِ لالہ رو ذوقے نمی بخشد
ز فیضِ حضرتِ غالب ہماں پیمانہ باز آور

زیادہ کیا عرض کروں ، سوائے اس کے کہ دعاؤں کا محتاج ہوں - ہاں دلی کے بنڈتوں سے سلام کہہ دیجیے -''[1]

۱۹۳۶ء میں خواجہ صاحب نے میلادی جنتری بابت ۱۳۵۵ھ شائع کی - اس میں انھوں نے جہاں اور بہت سی جدتیں پیدا کیں وہاں بہت سے مشاہیر کے قلمی چہرے بھی اپنے مخصوص انداز میں لکھے اور اپنے دوست اقبال کے قلمی چہرے میں نہایت پیار سے یوں

۱- منادی ، دہلی ، ص ۲۱ - ۲۸ فروری ۱۹۳۶ء -
''غالب ڈے'' کی مکمل روئداد راقم الحروف کے مضمون ''عظمتِ غالب'' مطبوعہ اقبال ریویو ، جولائی ۱۹۶۵ء میں ملاحظہ فرمائیے -

رنگ بھرے :

''سرو قد ، گندمی رنگ ، پُرتمکنت چہرہ ، ڈاڑھی صاف ۔ شاعر بھی ہیں ، نثر نویس بھی ہیں ، بیرسٹر بھی ہیں ، 'سر' بھی ہیں ، لیڈر بھی ہیں اور پھر صاحبِ اقبال بھی ہیں ۔ آنکھیں ایسی نشیلی کہ ایک آنکھ میں حافظ کا میکدہ تو دوسری آنکھ میں عمرِ خیام کا خم خانہ ۔ جسم پنجابی ، دماغ فلسفی ، خیال صوفی ، دل مسلمان ۔ پہلے شاعر بنے ، پھر بیرسٹر ہوئے اور اب لیڈر ہیں ۔ انگریزی زبان پر پورا عبور رکھتے ہیں لیکن انگریزیّت کے قابو میں نہیں آتے ۔ انگریز ان کو سمجھتا ہے اور انگریز کو یہ سمجھتے ہیں ۔ اگر انگریز کو سمجھنا نہ جانتے تو نہ 'سر' بنتے اور نہ گول میز کانفرنس میں نظر آتے ۔ عربی بھی جانتے ہیں اور فارسی بھی جانتے ہیں ۔ فارسی اتنی اچھی جانتے ہیں کہ اگر خاقانی اور انوری کے زمانے میں ہوتے تو دوسرے خاقانی اور انوری مانے جاتے ۔ مسلک حق پسندی ، پیشہ علمی خدمت ، مذہب مسلمانوں کی بہبودی ۔ مزاج میں سنجیدگی ، متانت اور استقلال ۔ یعنی شاعر ہونے کے باوجود شاعرانہ تلوّن مزاجی نہیں ہے ۔ دوسرے شاعروں کی طرح ان کی شاعری بھی عشق باز ہے لیکن ان کی شاعری کو گل و بلبل سے عشق نہیں ہے ۔ ان کی شاعری کو قوم اور وطن سے عشق کرنے میں لطف آتا ہے ۔ انگریز کی نظر میں پسندیدہ ہیں ، مسلمان کی نظر میں محبوب ہیں اور ہندو کی نظر

میں اپنی صاف بیانی کی وجہ سے غیر مرغوب ہیں ۔ ان کی
قابلیت کو سوئی ہوئی قوم کو جگانا خوب آتا ہے ۔ اگر یہ
پیدا نہ ہوتے تو حالی کی شاعری کے گلشن میں کبھی
بہار نہ آتی ۔''[۱]

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو حضرتِ علامہ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ چنانچہ ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء کے ''منادی'' میں آپ کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے خواجہ حسن نظامی نے جو کچھ لکھا اس کے حرف حرف سے درد و غم کا اظہار ہوتا ہے :

''آج ۲۱ اپریل کی صبح کو دلی ریڈیو نے یہ المناک خبر
سنائی کہ تمام اسلامی دنیا کے مسلمہ قومی شاعر نے ،
جنھوں نے ساری اسلامی دنیا میں ترقی و زندگی کی لہر
پیدا کر دی ، اس دنیا سے انتقال فرمایا ۔ یہ خبر نہ صرف
دنیا بھر کے مسلمانوں کو غمگین کرنے والی ہے بلکہ تمام
ایشیائی قوموں کو اس کا صدمہ ہوگا کیونکہ مرحوم اقبال
ایشیا کی پرانی تہذیب کے حامی اور مددگار تھے ، اس لیے
ان کی وفات سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایسا نقصان
پہنچا ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی ۔[۲]

مرحوم کا دلدادہ : حسن نظامی''

اس کے بعد ۲۹ اپریل ۱۹۳۸ء کے ''منادی'' میں تحریر فرمایا :

''اقبال کی وفات کے وقت آخری الفاظ یہ تھے : ''میں موت

۱- میلادی جنتری ، ۱۳۵۵ ہجری ۔
۲- ''منادی'' دہلی ، ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء ۔

سے نہیں گھبراتا ۔ میں مسلمان ہوں ۔ ہنسی خوشی موت کا استقبال کروں گا ـــــ"

میرے دوست اور فلسفیانہ شاعری کے آفتاب جناب ڈاکٹر شیخ سر اقبال صاحب نے جمعرات کے دن ۱۹ صفر ۱۳۵۷ھ صبح صادق کے وقت اس دنیا سے کوچ فرمایا ۔ وہ چونکہ محبِ اہل بیت تھے اور تفضیلی عقائد رکھتے تھے اس لیے قدرت نے ان کو چہلمِ سید الشہدا علیہ السلام سے ایک دن پہلے کی تاریخ عطا فرمائی :۔

ہندوستان کے ہر باشندے نے ، چھوٹا ہو یا بڑا ، اس صدمے کو قومی اور ملکی صدمہ محسوس کیا اور ہندوستان کے باہر بھی ایک تہلکہ برپا ہو گیا ، جس سے ان کی ہردلعزیزی اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

مرحوم جب تعلیم کے لیے یورپ جا رہے تھے تو درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں حاضر ہوئے تھے اور ایک نظم بھی نذر کی تھی ، جس کے حسبِ ذیل اشعار بہت مقبول ہوئے تھے :

ہند کا داتا ہے تُو ، تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربارِ گوہربار سے

محوِ اظہارِ تمنائے دلِ ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال کا ہم نام ہوں

خواجہ محمد اقبال ، حضرت خواجہ نظام‌الدین اولیاء کے ایک

مقبول خدمت گزار کا نام تھا ۔ انھی کے نام کی طرف اس نظم میں اشارہ کیا ہے ۔

اس سفر کے وقت مرحوم کے ساتھ میر نیرنگ صاحب وغیرہ شعرا بھی تھے ، جو سب جمع ہو کر مرزا غالب کے مزار پر گئے تھے اور میں نے دلی کے مشہور قوال ولایت خاں کو بلایا تھا ۔ ولایت خاں اس وقت نوعمر لڑکا تھا ۔ سر اقبال نے غالب کی لوحِ مزار کو دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لے کر سر جھکا لیا تھا اور ولایت خاں نے غالب کی یہ غزل گائی تھی :

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اس شعر کو ولایت خاں نے اس طرح ادا کیا تھا کہ سب پر ایک کیفِ الم طاری تھا ۔ مگر آج جب اقبال کے مرنے کی خبر آئی تو اس ولایت خاں قوال نے ، جو اب بوڑھا ہو گیا ہے ، دلی ریڈیو میں خود اقبال کی ایک غزل گائی اور ایسے درد انگیز لہجے میں کہ سب سننے والے رونے لگے ۔

آج رات کو پروفیسر میرزا محمد سعید ایم ۔ اے نے دلی ریڈیو میں مرحوم اقبال کی نسبت ایک بہت اچھا مضمون سنایا تھا ، جس کے بعد ریڈیو والوں نے خبریں سناتے وقت کہا کہ مرحوم اقبال نے اپنے قدیمی خدمت گزار نوکر علی بخش کی گود میں جان دی ۔ یہ سن کر مجھ پر بہت اثر ہوا ۔ اتنا اثر جو

گورنر پنجاب اور سر ٹیگور اور صدر کانگرس اور مسٹر جناح کے بیانات سے بھی نہیں ہوا تھا ۔ کیونکہ آقا اور نوکر کی یہ وفاداریاں اور باہمی اُلفتیں اب خواب و خیال ہوگئی ہیں ۔ ہر چیز میں ظاہر داری اور نمائش ہوتی ہے ، دلی تعلق بہت کم ہوتا ہے ۔ پس مجھ پر اثر اس لیے ہوا کہ اقبال سچ مچ ہماری مٹنے والی تہذیب کی ایک نشانی تھے ، جن کے مستقل طرزِ عمل اور برتاؤ نے ان کے نوکر علی بخش کو ایسا گرویدہ کر لیا تھا کہ وہ آخر وقت تک ساتھ رہا ۔ اس لیے میں نے تعزیت نامہ علی بخش کو بھیجا ہے ، مرحوم کی اولاد کو نہیں بھیجا ۔ اولاد کے پاس تمیں خود ماتم پُرسی کرنے جاؤں گا ۔ اس وقت تو خطاب کے قابل میں نے علی بخش نوکر کی محبت دیکھی کیونکہ میرے کانوں میں اقبال کی ایک آواز گونج رہی تھی : ”علی بخش حقّہ بھر لا ۔ اندر سے جاوید کو لا ۔ خواجہ صاحب سے ملا ۔“

اقبال کے مرنے سے ہندوستان ہی سونا نہیں ہو گیا بلکہ ایشیا بھر میں اندھیرا چھا گیا ہے ۔ ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال تمام ایشیا کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے اقبال کی قدر کی تھی اور پانچ سو روپے ماہوار پیش کرتے تھے ۔ امید ہے کہ مرحوم کے اہل و عیال کو بھی نواب صاحب فراموش نہیں کریں گے ۔[1]

حسن نظامی ، ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ع“

۱۔ منادی ، دہلی ، ۲۹ اپریل ۱۹۳۸ع ۔

علامہ اقبال نے جس آزاد اسلامی مملکت کا تخیّل پیش کیا تھا، وہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی اور اہل پاکستان نے اس مفکرِ اعظم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے "یومِ اقبال" پہلے سے زیادہ شان دار طریق پر منانا شروع کیا۔ ۱۹۵۲ء میں خواجہ حسن نظامی کو بھی لاہور میں ہونے والے یومِ اقبال میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ اُنھوں نے لاہور آنا تو خوشی سے قبول کر لیا لیکن بیماری اور ضعف کے سبب وہ سفر اختیار نہ کر سکے۔ انھوں نے اپنا مضمون لکھ کر لاہور میں اپنے خلیفہ جناب محمد حسین نظامی کو بھیج دیا کہ وہ اسے طبع کرا کے جلسے میں تقسیم کر دیں۔ یہ مضمون اقبال کے متعلق خواجہ صاحب کی آخری تحریر ہے، اور اس لحاظ سے نہایت قیمتی ہے کہ اس میں انھوں نے اپنے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے اور نہایت فراخ دلی سے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اپنے تمام مریدوں اور عقیدت مندوں کو اقبال کے کلام کی روح پر متوجہ رہنے کی تلقین کی ہے:

"لاہور کے یومِ اقبال کی خبر سن کر میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ خود لاہور آؤں اور یومِ اقبال میں اپنا یہ مضمون پڑھوں مگر بڑھاپے اور بیماری اور بینائی کی خرابی کے سبب لاہور کا سفر نہ کر سکا۔

گزشتہ سال دہلی میں پاکستانی ہائی کمشنر صاحب نے میری صدارت میں یومِ اقبال کا جلسہ کیا تھا، جہاں اسلامی دنیا کے سفیر بھی موجود تھے اور پنڈت زار صاحب اور ان کے فرزند پنڈت گل زار صاحب وغیرہ ہندوؤں نے

بہت اچھی تقریریں کی تھیں اور نظمیں سنائی تھیں - میں نے اپنی صدارتی تقریر میں مصر کے سفیر کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ سر محمد اقبال مرحوم کشمیری برہمن تھے اور کشمیری برہمنوں کا تعلق مصر سے ہے کیونکہ مصر میں سورج کے مندر کے بڑے پجاری سہنت ہری ہر تھے اور مصری زبان میں سورج کو ''را'' کہتے ہیں - قرآن شریف کی سورۃ یوسف بھی ''الف لام را'' سے شروع ہوتی ہے یعنی ''را'' کا لفظ خدا تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا ہے -

سہنت ہری ہر کی شادی قبطی فرعون کی لڑکی سے ہوئی - جب فرعون لاولد مر گیا تو سہنت ہری ہر کو فرعون بنا دیا گیا اور ان کی اولاد چار سو برس تک مصر پر حکومت کرتی رہی - پھر نئے انقلاب کے سبب نیا خاندان حاکم ہو گیا اور سہنت ہری ہر کی اولاد حضرت موسیٰؑ کی یہودی قوم کے ساتھ مصر سے نکلی - حضرت موسیٰؑ فلسطین چلے گئے اور ہری ہر کی اولاد افغانستان میں آ گئی - یہاں اس نے ہری نام کا ایک شہر آباد کیا جس کو بعد میں ہرات کہنے لگے - اس کے بعد یہ لوگ کشمیر میں آئے اور کشمیر سے ہندوستان میں آئے اور گنگا کے کنارے اپنے مورثِ اعلیٰ کے نام پر 'ہری دوار' تیرتھ بنایا -

لہٰذا ہندوسان کے کشمیری برہمن سب مصری ہیں - چونکہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی کشمیری برہمن تھے اس لیے اقبال بھی مصری تھے اور نہرو جی بھی کشمیری برہمن ہونے کے

سبب مصری ہیں ۔

میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے میرے تعلقات اتنے زیادہ تھے کہ وہ بار بار دہلی میں میرے پاس آتے تھے اور میں بار بار ان کے پاس جاتا تھا ۔

وہ ساری اسلامی دنیا کے مسلمانوں کو متحد کر کے کل جہان میں پاکستان بنانا چاہتے تھے اور ان ہی کی تحریک سے میں نے ۱۹۱۱ء میں مصر ، فلسطین ، شام اور حجاز کا سفر کیا تھا ۔ واپس آکر میں نے اقبال سے کہا تھا کہ مذکورہ ملک انگریزی تہذیب کے اس قدر دل دادہ ہوگئے ہیں کہ مجھے وہاں اسلامی اتحاد کی امید نظر نہیں آتی ۔

اس کے بعد اقبال نے مثنوی 'اسرارِ خودی' لکھی اور حضرت حافظ شیرازی کے کلام پر اور بعض صوفیوں کے عقائدِ ترکِ دنیا پر تنقید کی ، جس کو میں نے اور حضرت اکبر الہ آبادی نے ناموزوں خیال کر کے اس سے اختلاف کیا ۔ کچھ عرصے تک اخبارات میں اختلافی مضامین شائع ہوئے مگر آخرکار میرا ان کا اتحادِ خیال ہوگیا ، اور میں نے تسلیم کر لیا کہ ترکِ دنیا کا وہ تخیّل جو بعض صوفیائے کرام کا ہے ، وہ وقتِ حاضر کے لیے موزوں نہیں ہے ، کیونکہ قرآن میں خدا نے جو دعا سکھائی ہے ، اس میں دنیا کی بھلائی کو مقدّم اور آخرت کی بھلائی کو مؤخر رکھا گیا ہے ۔

اس کے بعد میں نے دہلی کے پاکستانی یومِ اقبال میں کہا

تھا کہ میرے مریدوں کی غلط فہمی دُور ہو جانی چاہیے کیونکہ میری اور اقبال کی صفائی اور صلح ہوگئی تھی اور ہم دونوں میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی شان میں کئی قصیدے لکھے تھے ۔ ایک قصیدے میں یہ شعر تھا :

ہند کا داتا ہے تو ، تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربارِ گوہربار سے

اور اسی قصیدے میں حضرت کے خادمِ خاص خواجہ محمد اقبال صاحب کی نسبت بھی ایک شعر تھا :

محوِ اظہارِ تمنّائے دلِ ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال کا ہمنام ہوں

اور یہ شعر بھی تھا :

جا ہی پہنچے گی صدا لاہور سے دہلی تلک
منہ چھپا کر مانگتا ہوں تجھ سے وہ سائل ہوں میں

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں ہم کو

سوامی شردھانند کی تحریکِ شُدھی اور میری جوابی تحریکِ تبلیغ کے ایام میں لاہور کے لالہ لاجپت رائے صاحب نے مظفرپور بہار کے جلسے میں کہا تھا کہ ہندو قوم کا ہاضمہ بہت قوی ہے ۔ وہ یونانی سکندر کے ساتھیوں کو ہضم کر گئی اور اب ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی ہضم کر

جائے گی ۔ اس کے جواب میں پٹنہ جا کر میں نے تقریر کی تھی کہ لاجپت رائے صاحب اپنے دعوے کا ثبوت پیش کریں اور میں اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرتا ہوں کہ مسلمانوں کا ہاضمہ بہت مضبوط ہے جو کشمیری برہمن اقبال کو ہضم کر گئے اور راجپوت قوم کے میاں سر فضل حسین کو ہضم کر گئے ۔ اس تقریر کو اخباروں میں پڑھ کر جو خط سر اقبال نے مجھے لکھا تھا وہ آج تک موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس جواب سے بہت خوش ہوئے تھے ۔

آخر میں مجھے یہ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اقبال مرحوم ایسا پاکستان چاہتے تھے جو یورپ کی تہذیب کے براثر سے پاک ہو ـــــ لہٰذا پاکستان کے مسلمانوں کو اقبال کے اس خیال پر غور کر کے اپنے حالات کا اندازہ لگانا چاہیے کہ وہ یورپ کی تقلید سے کتنے آزاد ہیں ۔

لاہور میں ایسے اصحاب موجود ہوں گے جن کو شاید یاد ہو کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک جلسے میں اقبال نے اپنی نظم سنائی تو میں نے اپنے سر کا عمامہ اتار کر آن کے سر پر رکھ دیا تھا اور کہا تھا :

تمھارے جامِ مے کی نذر میری پارسائی ہو

اور اقبال کی نظم اور میرے خیالات اور میرے عمل کا سب حاضرین پر بہت اثر ہوا تھا ۔

میرا مقصد اس تحریر سے یہ ہے کہ میری موت کا وقت قریب ہے اور ممکن ہے کہ میرے بعد میرے مریدوں میں

یہ غلط فہمی باقی رہے کہ مجھ میں اور اقبال میں بعض مسائلِ تصوّف کے سبب اختلاف تھا ۔ اس لیے میں لاہور کے جلسۂ عام میں اعلان کرتا ہوں کہ مجھ میں اور اقبال میں کسی قسم کا اختلاف باقی نہ رہا تھا اور میں آج تک اقبال کے ان خیالات کا حامی ہوں جو انھوں نے بعض اہلِ تصوّف کے خیالاتِ ترکِ دنیا کے خلاف ظاہر کیے تھے ۔

میں پاکستانی مریدوں اور دوستوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اقبال کے کلام کی روح پر متوجہ رہیں اور قرآن کے اس حکم کو سامنے رکھیں جس میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے:

ولا تنس نصیبک من الدنیا

[اے ! انسان مت بھول اپنے دنیاوی حصے کو]

اقبال کے کلام میں دنیا کے حصے کو حاصل کرنے کے ساتھ ہی یورپ کے منکرِ دین حصے سے بچنے کی تلقین بھی ہے ۔"[1]

خواجہ حسن نظامی ، جو ۲ محرم ۱۲۹۶ھ (۱۸۸۰ع) کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے، اپنی خداداد صلاحیتیں اور زباں دانی کے فطری جوہر دکھا کر ۱۷ ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ (۱۹۵۵ع) کو اپنے اللہ کو پیارے ہوگئے ۔ وہ اردو کے صاحبِ طرز ادیب بلکہ اپنے رنگ کے فردِ وحید تھے ۔ بلاشبہ ان کی سبق آموز اور زندگی افروز تحریروں سے پاک و ہند نے بہت کچھ حاصل کیا ۔ عوام نے ان کی رنگین بیانی اور شگفتہ سرائی سے لطف اٹھایا تو خواص نے زبان کے چٹخارے کے

۱- "ادبی دنیا" ، لاہور ، مئی ۱۹۶۵ع ، صفحات ۹ - ۱۱ -

ساتھ حکمت وتصوف کے گُہر ہائے گراں مایہ سے اپنے جیب و دامن بھرے - علامہ اقبال کے فرزند جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے ۱۹۶۳ء میں یومِ حسن نظامی کی تقریب پر پیغام دیتے ہوئے فرمایا :

''علامہ اقبال کے حضرت خواجہ حسن نظامی سے گہرے مراسم تھے بلکہ ان کی ذات سے خاص محبّت تھی - ایک دو بار جب میں علامہ کی معیّت میں دہلی گیا تو نظام الدین اولیاء کے مزار پر حاضری دینے کے بعد علامہ مجھے حضرت کے ہاں لے گئے - بچپن میں مجھے حضرت کی تصانیف پڑھنے کی ترغیب بھی علامہ ہی نے دی - مجھے خوب یاد ہے جب میں حضرت کی تصانیف میں مغل شہزادوں کی مفلوک الحالی کے متعلق پڑھا کرتا تھا تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلتے تھے - ایک مرتبہ میں نے علامہ سے ذکر کیا کہ حضرت کا اندازِ تحریر غیر معمولی طور پر مؤثر ہے - فرمانے لگے کہ حضرت دردمند ہیں اور ہر دردمند کا اندازِ تحریر مؤثر ہوا کرتا ہے -

مجھے ابھی تک حضرت کا چہرہ یاد ہے - دراز گیسو، شفقت بھری نگاہیں اور شخصیت سادگی و عجز کی ایک نادر مثال - ہر وقت مسکراتے رہتے - مجھے فخر ہے کہ میرے سر پر اس بزرگ ہستی کا دستِ شفقت رہا ہے اور میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے ان کا ذکر چھیڑ کر ایک پرانی یاد تازہ کر دی -''[1]

۱- ''ادبی دنیا''، لاہور، جولائی ۱۹۶۵ء، ص ۲۳ -

یہ ہے مختصر سی جھلک اُن بزرگ ہستیوں کی دوستی کی جو اُلفت و یگانگت کے رشتوں میں جکڑے ہوئے تھے اور جن کے مخلصانہ اور بے غرضانہ تعلقات چالیس سال کی طویل مدت پر پھیلے ہوئے تھے۔ وفا کی سطح سے گری ہوئی دنیا میں غرض کے بندے تو بے شمار ملیں گے مگر ایسی بے ریا دوستی کی مثالیں کم ہی نظر آئیں گی۔

''اقبال ریویو'' ، کراچی ، جنوری ۱۹۷۰ء
بشکریہ اقبال اکادمی

☆ ☆ ☆

۳۲

ثاقب کانپوری

(۱۹۵۵ء)

مولوی حاجی سیّد شاہ ابو محمد ثاقب کانپوری نہایت خوش گو شاعر تھے ۔ اصل وطن کڑا ضلع الٰہ آباد تھا مگر آپ ۱۹۰۴ء میں کانپور میں تولّد ہوئے ۔ پانچ سال کی عمر میں تسمیہ خوانی ہوئی ۔ چونکہ خاندان کے تمام افراد علومِ عربیہ کے زبردست محقّق اور عالم تھے ، اس لیے ابتدائے عمر ہی میں السنہٴ مشرقیہ سے خاص دلچسپی اور مناسبت پیدا ہوگئی ۔ ددھیال کی طرف سے ساداتِ بارہہ کے مشہور بادشاہ گر خاندان سے تعلق ہے ۔ ننھیال کی طرف سے سادات جمل اللیل سے ہیں ۔ اس خاندان کے بزرگ سیّد حسن جمل اللیل مدینہٴ منّورہ کے مسلّم الثبوت فضلا اور اکابرین میں سے تھے ۔ آپ کے پرنانا حضرت مولانا حاجی سیّد شاہ غلام رسول صاحب رسول نما اپنے زمانے کے رئیس المشائخ تھے ۔

ثاقب نے ابتدائی درجوں میں مولانا محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی اور اس کے بعد حافظ عبدالحلیم صدیقی نائب ناظم جمعیت العلماء

دہلی سے درسی کتابیں پڑھیں اور آخر میں علم و ادب کا درس علامہ آزاد سبحانی سے لیا۔ حافظ محمد صدیق (مُلّا رموزی مرحوم)، مولانا سعید رزمی اور مولوی محمد طاہر فاروقی آپ کے ہم درس تھے۔

۱۹۱۹ء میں کہ سولہ برس کا سن تھا، آپ کو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ شعر کہنے شروع کیے اور بہت جلد اطرافِ ملک میں مشہور ہوگئے۔ ۱۹۲۵ء میں مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم نے انجمن اربابِ علم پنجاب کی جانب سے متحدہ ہندوستان کے تمام شعرا کو ایک انعامی مقابلے کی دعوت دی، جس کے لیے بارہ مختلف عنوانات پر نظمیں لکھوائی گئیں۔ ثاقب نے بھی تین نظمیں لکھ کر بھیجیں، جو اوّل انعام کی حق دار قرار دی گئیں اور آپ کو اڑھائی سو روپیہ نقد انعام اور ''سحر طراز'' کا خطاب عطا ہوا۔

آپ کی شاعری پر جن شعرا کے کلام نے نمایاں اثر ڈالا، وہ میر، غالب اور اقبال ہیں۔ اقبال کی ''زبورِ عجم'' نے تو ان کی دنیائے تخیّل ہی بدل ڈالی۔ بقول علامہ آزاد سبحانی:

''ثاقب کی شاعری حقیقت نگاری اور مصوّریٔ جذبات، اصلیّت و خیالات اور رنگینیٔ ادا کا عمدہ مجموعۂ مرکب ہے۔ ان کی شاعری کا معیّن موضوع حقیقتِ اشیا کی ترجمانی مع مصوّریٔ جذبات ہے۔ اسی محور کے گرد ثاقب کی کل کائناتِ شاعری گردش کرتی نظر آتی ہے۔ ثاقب کا کلام شریفانہ جذبات اور مجدّدانہ کیفیات کے اظہار تک محدود ہے اور اس کا قدم بازاری جذبات و کیفیات کے اظہار

کی حدود میں نہیں پڑتا ۔ یہ خوبی باوجود شاعر کی
نوعمری اور رنگینئی طبیعت کے ایک خداداد نعمت اور
تائید ایزدی ہے ۔''[۱]

''متاعِ درد'' ثاقب کے کلام کا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا ۔ ثاقب نے یہ مجموعہ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال کی خدمت میں اظہار رائے کے لیے بھیجا ۔ حضرت علامہ نے اسے ملاحظہ فرما کر ثاقب کو درج ذیل خط لکھا :

محبّی ! آپ کا مجموعہ ملا ۔ آپ کے کلام میں جو تنّاسب
ہے ، وہ نوجوان شعرا کے ہاں بہت کم ملتا ہے ۔ آپ کے
ایک شعر نے مجھے تڑپا دیا ۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے :

جان دیتا ہوں قفس میں دونوں پر کھولے ہوئے
حسرتِ پرواز میں بھی شان ہے پرواز کی

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے ۔[۲]

مخلص محمد اقبال''

''متاعِ درد'' کا یہ مختصر سا مجموعہ ۷۴ نظموں ، ۵۷ غزلوں اور ۵۴ رباعیوں پر مشتمل ہے ۔ اکثر غزلیں تین چار اور پانچ شعروں کی ہیں مگر بایں ہمہ جابجا بجلیاں کوندتی نظر آتی ہیں ، جو محبّت سرشت دلوں کے سرمایۂ شکیب کو خاکستر کیے بغیر نہیں چھوڑتیں ۔ اقبال

۱۔ متاعِ درد ۔
۲۔ انوارِ اقبال ، مرتبہ بشیر احمد ڈار ، ص ۵ ۔

کو جس شعر نے تڑپایا ، اس کی خوبی بقول عندلیب شادانی مرحوم یہ ہے :

”شاعر کو پہلے سے معلوم ہے کہ طائر جب اُڑنا چاہتا ہے تو اپنے دونوں بازو کھول دیتا ہے ۔ اب اُس نے دیکھا کہ ایک پرندہ قفس میں بند ، دونوں بازو پھیلائے جان توڑ رہا ہے ۔ سببِ مرگ خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس کی متخیّلہ نے ان معلومات کو ایک نئی شکل میں مرتّب کر کے پیش کر دیا ؛ یعنی اس آخری لمحے میں دونوں پروں کا پھیلا ہونا اس کے نزدیک دلیل ہے اس امر کی کہ طائرِ محبوس کو تمام زمانۂ قید میں آزادی کی تمنّا رہی حتّٰی کہ مرتے مرتے بھی قفس سے چھوٹ کر پرواز کر جانے کی حسرت اس کے دل میں موجود تھی ۔“

ایک اَور شعر ملاحظہ فرمائیے :-

وطن کی خاک ! تجھ کو یاد کر کے ہم بہت روئے
کہ تجھ سے دُور تھے اور شامِ غربت تھی بیاباں میں

اور پھر یہ شعر :

کیا جانے کسے ڈھونڈا بیمار نے مرتے دم
اک بار اِدھر دیکھا ، اک بار اُدھر دیکھا

اندازِ بیان میں بلاغت کا ایک لطیف نکتہ ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ مرنے والے نے جسے ڈھونڈا ، شاعر نے اس کا پتا نہیں بتایا ۔ کہا تو

یہ کہا کہ نہیں معلوم کسے ڈھونڈا۔ درحقیقت یہ ایک ایسا بلیغ کنایہ ہے جس نے شعر کی قوتِ اثر کو ایک سے ہزار گونہ کر دیا ہے۔ کوئی تصریح اس لطف و خوبی کے ساتھ مقصود کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتی۔

۱۹۵۵ء میں ثاقب اندھیروں میں گم ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

۳۳

علامہ کیفی چریا کوٹی

(۱۹۵۶ء)

یہ فاضل بزرگ ایک مشہور عباسی علمی گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ ان کا نام محمد مبین اور تخلص کیفی تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ مخدوم شاہ اسمٰعیل تھے جو سلطان محمد تغلق کے عہد میں عدن سے تشریف لائے۔ وہ حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی کے بھانجے اور خود بہت بڑے درویش اور عالم تھے۔ اس خاندان میں علوم و فنون کے بڑے بڑے آفتاب و مہتاب مسلسل پیدا ہوئے۔

علامہ کیفی جولائی ۱۸۹۰ء (۱۳۱۰ھ) میں قصبۂ ولید پور ضلع اعظم گڑھ میں کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں آئے۔ ان کے والد مولوی محمد فاروق چریا کوٹی اپنے عہد کے ایک نامور عالم اور فلسفی تھے۔ علامہ شبلی نعمانی ان کی شاگردی پر فخر کیا کرتے تھے۔ علامہ کیفی کی ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے نانا حضرت چراغ ربّانی مولانا محمد کامل کی زیرِ سرپرستی ولید پور میں ہوا۔ وہ بھی مشہور صوفی، درویش، فلسفی اور عالم تھے۔ اس کے بعد وہ اپنے والدِ ماجد کے پاس چریا کوٹ

چلے گئے۔ ان کی نگرانی میں انھوں نے ۱۹۰۶ء میں کہ سولہ برس کے تھے آردو ، فارسی ، ہندی ، فلسفہ ، حدیث ، منطق ، ریاضیات اور علوم ادب و زبان کی تکمیل کی ۔ پھر اپنے چچا اقلیدس ِثانی مولوی عنایت رسول سے ترکی ، عبرانی اور سریانی وغیرہ زبانیں سیکھیں اور فلسفۂ الٰہیات و طبیعیات کا درس لیا ۔ پھر گورکھپور جا کر ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۱ء تک انگریزی پڑھی اور ۱۹۱۳ء میں رائے بریلی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا ۔ ساتھ ہی فرانسیسی ، المانوی اور لاطینی زبانوں سے واقفیت حاصل کی ۔ کچھ عرصہ ندوۃ العلماء میں بھی زیر ِتعلیم رہے جہاں ان کے والد معلّم تھے ۔

تعلیم سے فارغ ہو کر مولانا نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور کئی اخباروں اور رسالوں کی ادارت کے فرائض انجام دیے ۔ ۱۹۱۶ء میں اعظم گڑھ سے ایک علمی ماہنامہ ''العلم'' جاری کیا جو ۱۹۱۸ء میں بند ہوگیا ۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ کی ادارت کی ۔ ۱۹۲۰ء میں خلافت اور عدم ِتعاون کی تحریکوں میں شمولیت کے باعث یہ سلسلہ ٹوٹ گیا ۔ تھانہ چورا چوری ضلع گورکھپور کا مشہور واقعہ مولانا اور ان کے رفیقوں کی راہنمائی ہی میں پیش آیا تھا ۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۷ء تک پھر مختلف علمی ، ادبی اور سیاسی ماہناموں ، ہفتہ واروں اور روزناموں میں کام کیا ۔ ان میں ماہنامہ ''سحبان'' گورکھپور ، روزنامہ ''زمانہ'' کلکتہ ، روزنامہ ''انقلاب'' کلکتہ ، ہفتہ وار ''ترجمان'' الٰہ آباد ، روزنامہ ''خادم'' ، ہفتہ وار ''کلیم'' اور ہفتہ وار ''استقلال'' الٰہ آباد قابل ِذکر ہیں ۔

۱۹۲۷ء میں ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد قائم ہوئی تو اس کے سرپرست سر تیج بہادر سپرو اور سر شاہ سلیمان نے تالیف و تصنیف اور تحقیق کا کام مولانا کے سپرد کیا۔ یہاں رہ کر مولانا نے بڑی محنت سے تذکرہ ''جواہرِ سخن'' ترتیب دیا جو چھ ہزار صفحات پرمشتمل ہے اور سات ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس میں اردو زبان کے شاعروں اور ادیبوں کے حالات اور ان کے کلام پر نہایت جچا تُلا تبصرہ ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی نے اس کی صرف چار جلدیں شائع کیں۔

مولانا نے خسرو کے کلام کو ''جواہرِ خسروی'' کے نام سے مرتب کیا۔ ایک اردو ڈراما ''وفا کی دیوی'' لکھا جس کا پلاٹ عربی سے لیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۳۳ء میں رام دیال پریس الٰہ آباد نے شائع کیا۔ دوسرا ڈراما ''آدم و حوّا'' ترکی اور عربی زبانوں کی مدد سے لکھا جو شائع نہیں ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں ایک ڈراما ''النور والنار'' عربی میں مکمل کر کے مصر بھیجا جس پر مصر والوں نے آپ کو ''سحبان الہند'' کا خطاب عطا کیا۔ ۱۹۳۸ء میں خرابیٔ صحت کی بنا پر مولانا، اکیڈمی کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوکر وطن واپس چلے آئے۔

۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لٹن لائبریری میں عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، ترکی اور ہندی کی قلمی کتابوں کی فہرست مرتب کرنے کے لیے آپ کو طلب فرمایا۔ مولانا نے نہایت جاں فشانی سے بڑی مفید اورکارآمد فہرستِ مخطوطات مرتب کی۔ چند اور کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں ''فلسفۂ سیاسیاتِ اسلام''، ''ترجمۂ قانونِ مسعودی'' اور

"فلسفۂ عمرانیات" بہت مشہور ہیں - اپنے ہندی کلام کا مجموعہ "نویں سنگرہ" ۱۹۳۶ء میں مکمل کیا تھا مگر وہ طبع نہ ہو سکا - آٹھ سو سے زیادہ اردو غزلوں کا دیوان "کیف و الہام" اور نو سو سے اوپر نظموں کا مجموعہ "جمال و جلال" کے نام سے ۱۹۳۷ء میں مرتب ہو چکا تھا مگر چھپنے کی نوبت نہیں آئی - البتہ ان کے چند انتخابات شائع ہوئے جن میں "پارہ ہائے جگر" اور "میکدۂ کیفی" وغیرہ بہت مقبول ہوئے -

مولانا کیفی یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء کو دو شنبہ کے روز یک بہ یک فالج میں مبتلا ہو کر پینسٹھ برس کی عمر میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور اٹاوہ کی سرزمین میں دفن ہوئے -

کیفی صاحب اپنے تمام علم و فضل اور شاعرانہ قابلیتوں کے باوصف علامہ اقبال کی پُرجوش اور حریت آموز قومی شاعری اور زندگی افروز پیغام کی معجزنمائی کے قائل اور معترف تھے - ان کے تاثر اور اعتراف کا دائرہ یہاں تک پھیلا ہوا تھا کہ وہ جب کبھی خود کوئی کام کی چیز یا اقبال کے رنگ میں کچھ لکھتے تو حضرت علامہ کی خدمت میں ضرور بھیجتے اور ان سے داد طلب ہوتے - وہ خود جذبۂ اسلامی سے سرشار تھے - ان کے دل میں قومی درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا - علامہ اقبال ان کے ذاتی اوصاف و کمال کو جانتے اور ان کی خاندانی عظمتوں کے طول و عرض سے بخوبی واقف تھے - وہ اپنی عادت کے مطابق تحسین و آفرین فرماتے اور ضروری مشوروں سے بھی دریغ نہ کرتے -

۱۹۱۶ء میں جب مولانا کیفی نے رسالہ "العلم" جاری کر کے

اس کا ایک پرچہ حضرتِ علامہ کی خدمت میں ارسال کیا تو اقبال نے اس کے محاسن کا اعتراف کرتے ہوئے مندرجہ ذیل خط مولانا کو لکھا:

''لاہور

۱۲- اگست ۱۹۱۶ء

جنابِ مولانا کیفی صاحب ایڈیٹر ''العلم'' !

مخدومی ! السلام علیکم - رسالہ ''العلم'' کے لیے ممنون ہوں - نہایت عمدہ رسالہ ہے - اس کے مضامین تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے نہایت مفید ہوں گے - مضمون ''الحیوانات فی القرآن'' نہایت قابلیت سے لکھا گیا ہے، جسے میں نے خصوصیت سے پسند کیا - اسی مضمون پر ایک مغربی مستشرق نے بھی لکھا ہے، جس کا عنوان ہے ''حیوانات کے نام سامی زبانوں میں''- مجھے یقین ہے آپ کا رسالہ کامیاب ہوگا اور مسلمانوں کے لیے باعثِ برکت -

محمد اقبال''

یہ مفید رسالہ کسی وجہ سے جاری نہ رہ سکا اور ۱۹۱۸ء میں بند ہو گیا مگر اقبال مرتے دم تک اس علمی رسالے کے دوبارہ اجرا پر مولانا کو آکساتے اور توجہ دلاتے رہے -

انہی دنوں مولانا نے اقبال کی بعض قومی نظموں (غالباً ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'') سے متاثر ہو کر ایک نہایت پُرسوز نظم ''نالۂ مسلم'' لکھی اور ملاحظے کے لیے ''حکیمِ نے نواز'' کے پاس بھیجی - اس دل گداز نظم کے چند شعر یہ ہیں :

نالۂ مسلم

اپنے اللہ سے ہے شکوہ شکایات کی رات

کچھ مجھ میں بے وفائی، کچھ تجھ میں کج ادائی
اس کشمکش کے اندر اغیار کی بن آئی
انکارِ حسنِ صورت اب حد سے بڑھ چلا ہے
رخ سے ہٹا دے پردہ اے شانِ دل ربائی
گردوں کی گردشوں نے بندوں کو پیس ڈالا
شانِ خدا کہاں ہے؟ حیران ہے خدائی
غیروں کی انجمن میں تو اور سکون و راحت
کانٹوں کی سرزمیں میں ہم اور برہنہ پائی
پہچانتا نہیں وہ، مجھ آستاں نشیں کو
تو نے جو ساتھ چھوڑا اے داغِ جبہہ سائی
غیرت یہ دوستوں کی کس طرح تاب لائے دیکھیے؟
تو اور عدو سے رکھیے یوں راہِ آشنائی

رہ و رسمِ دوستی را چہ تفاوت است باہم
کہ منم چناں کہ بودم، تو چناں کہ می نمائی
دل و جانِ دوستاں را کہ مقامِ خویش گفتی
تو بخود ہمی پسندی کہ بہ خانہ در نہ آئی
بہ جزائے جرمِ عشقت تہِ تیغِ تیز اعدا
رگِ گردنم جدا شد، رگِ جانِ من کجائی

مرا حال سننے والے جو ستم نہیں تو کیا ہے ؟
یہ مرا سکوتِ پیہم ، یہ بُتوں کی کبریائی
یہ ستم کے کارخانے ، یہ حرم کے کارنامے
"سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی"

ہم تیری راہ بھولے ، یہ ہے درست ، لیکن
کب چشمِ عاشقی کو دیتا ہے کچھ دکھائی
پھر تیرے پاس پہنچیں گھستے ہوئے جبیں ہم
رہبر بنے ہمارا ، پھر داغِ آشنائی
اے صرصرِ حوادث بخرامِ ناز تاکے
کہتے ہیں جس کو مُسلم ہے وہ شمع آشنائی
آئیں تو آنے والے کیفی تلاشِ حق میں
اسلام میں ہے اب تک وہی ضرب کہربائی

اس نظم کے تاثر نے اقبال کو خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ آپ نے نظم کی رسید پیش کرتے ہوئے مولانا کو تحریر فرمایا :

"لاہور ، ۲۱ ستمبر ۱۹۲۰ء
بخدمت حضرت علامہ کیفی چریا کوٹی ایڈیٹر "سحبان" گورکھپور۔
آپ کی مرسلہ نظم پہنچی۔ میری عزت ہوئی۔ میں اس پر کیا اظہارِ خیال کروں ؟ ہم لوگ آپ کے زلہ رُبا ہیں۔ آپ کے خاندان سے ایک عالَم فیض یاب ہے اور آپ کی ذات سے بھی ہو رہا ہے۔ اس شعر نے خدا جانے

مجھے کس عالم میں پہنچا دیا :

پہچانتا نہیں ہے مجھے آستاں نشیں کو
تو نے جو ساتھ چھوڑا اے داغِ جبہہ سائی

محمد اقبال''

اس کے بعد اٹھارہ سال تک خاموشی رہی ۔ اس طویل خاموشی کی وجہ بظاہر یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس عرصے کی خط و کتابت ضائع ہوگئی ۔ آخری زمانے میں مولانا نے ایک اَور نظم اقبال کو بھیجی ، جو افسوس ہے کہ دستیاب نہیں ہو سکی ۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب حضرت علامہ بیمار تھے اور اُنھوں نے لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا تھا ۔ مگر آپ نے خط کا جواب دینا ضروری سمجھا اور مولانا کو لکھوایا :

''۱۸ فروری ۱۹۳۸ع

جنابِ علامہ صاحب ! آپ کا خط مع نظم موصول ہوا ۔ علالت کی وجہ سے ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہے ۔ آپ کی نظم ایک دوست نے پڑھ کر سنائی ، جس کے لیے میں آپ کا بہت شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ خدا کرے آپ رسالہ ''العلم'' دوبارہ جاری کر سکیں ۔

اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے ۔ والسلام

محمد اقبال''

اس خط کے دو ہی ماہ بعد ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ع کو حضرتِ علامہ اپنے رفیقِ اعلٰی سے جا ملے ۔ مولانا نے اس المیے پر ساٹھ شعر کی جو غیرفانی نظم کہی اس میں اقبال کی گوناگوں عظمتوں

اور رفعتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ''طائرِ طوبیٰ'' قرار دیا۔ یہ بلند پایہ نظم ان دونوں بزرگوں کے اخلاص و مودّت کی یادگار کے طور پر ہمیشہ زندہ رہے گی :

طائرِ طوبیٰ

(۱)

نفس نفس کو جو سمجھا ہو دامِ صیّادی
سکونِ موت ہے اس کو پیامِ آزادی
وہ بوئے گل کہ جو پہنچی ہے اڑ کے جنّت میں
کہاں یہ تاب کہ سمجھے چمن کی بربادی
اسیرِ عمر کی کل زندگی اسیری ہے
کہ حرّیت کی تو فطرت نہیں ہے میعادی
حبابِ بحر کی موجوں میں کچھ نہیں بنیاد
ہے اعتبارِ طبیعت، الم ہو یا شادی
وہ موج، ہاتھ میں جس کے کوئی سفینا ہے
اسی کے ذوق سے مرنا ہے اور جینا ہے

(۲)

قفس کی راہ میں جب بند آب و دانہ ہوا
جناں کو طائرِ لذّت نوا روانہ ہوا
قفس کے پاس اسیرِ الم، ادھر صیّاد
ادھر چمن کے غمِ ہجر میں روانہ ہوا

رگِ فضا سے جو اُٹھتا تھا نغمۂ دل دوز
زبانِ درد و الم پر وہی فسانہ ہوا
اُتر گیا کوئی بامِ نفس سے مرقد میں
کمالِ زیست ہی خود موت کا بہانہ ہوا
وہ روحِ پیکرِ ''اقبال'' غیرتِ اسلام
فرشتے لے چلے جب اس کو سوئے ربِ انام

(۳)

ندا یہ آئی کہ اے عندلیب سحر نواز
حقیقتوں سے بھری ہے تری نوائے حجاز
وہ مشتِ خاک میں تیری تھی برق سامانی
کہ اس نے دی ہے فرشتوں کو سرعتِ پرواز
ہوئی ہے دم سے ترے سرفراز پامالی
سکھائی مور کو پروانگیٔ بزمِ گداز
تری نوا سے رگِ جاں کے تار لرزاں ہے
نۓ عجم میں سنائی صدائے مستِ حجاز
دکانِ کفر کو دی دیں کی گرم بازاری
بُتانِ ہند سے پوچھے کوئی حرم داری

(۴)

بگاڑ کارِ وفا کے ، بتا دیا تُو نے
جو تجھ سے روٹھ گیا تھا ، منا دیا تُو نے

نہیں ہے لفظِ تعیّن حرم پرستوں میں
مقام و بُعد کا پردہ اُٹھا دیا تُو نے
وہ دل کہ دور تھا خود دانشِ غلامی سے
نظر کے سامنے لا کر دکھا دیا تُو نے
جو پی کے سوئے تھے مغرب کا جامِ خواب سرشت
انہی کا شانہ پکڑ کر جگا دیا تُو نے
نئی لگن یہ ترے سوز نے لگائی ہے
لگا کے دل میں نمِ اشک نے بجھائی ہے

(۵)

وہی ہے ایک ہی سودا ، کہیں ہو سودائی
سوادِ غرب کو دی ایشیا کی بینائی
نظر ہو جانبِ قبلہ ، قدم کنشت میں ہو
بہ راہِ ہوش تھی مغرب کی گام فرمائی
کہاں مزاجِ محبّت ، کہاں جنونِ خرد
نگاہِ عشق میں ہے فلسفے کی گہرائی
شکست عقل کو دی ، ذوق سے عقیدت کے
بہت بلند خرد سے ہے ، کیفِ دانائی
جو تار و پود تھا مغرب کا وہ بکھیر دیا
غرض کہ تُو نے زمانے کے رُخ کو پھیر دیا

(۶)

وہ شاعری کہ بنی رسم کی پرستاری
متاع جس کی تھی ذلّت ، مآل تھا خواری
شراب رنگ تھا ساغر سرور سے خالی
یہی فریب تھا کُل اہلِ بزم پر طاری
تمام اہلِ نظر کو دکھا دیا تُو نے
کہ شاعری ہے حقیقت میں شانِ سرداری
جو لفظ میں نہیں طاقت تو ہیچ ہے معنی
کہاں ہو لفظ میں قوت جو دل ہو بیماری
تُو شمع بن کے جلا ، داغِ دل دکھانے کو
دکھا دیا جو دکھانا تھا کُل زمانے کو

(۷)

طریقِ برق تڑپنے میں اختیار کیا
کہ خود تڑپ کے زمانے کو بے قرار کیا
مآلِ کفر ، دکھانا تھا کفر والوں کو
تمام عمر ، قیامت کا انتظار کیا
یہی ہے غیرتِ ایمانِ عشق کا حاصل
کہ حسن نے جو کہا ، اس کا اعتبار کیا
تری نظر میں ، مقامِ بلند اُلفت تھا
عدو سے چھیڑ ہوئی ، دوستوں کو پیار کیا

عبودیت کو بنایا مقامِ آقائی
یہی ہے ہوشِ مسلماں کی اصل دانائی

(۸)

بجائے خویش تو خود اپنا اعتبار رہا
خزاں کے دور میں بھی دامنِ بہار رہا
مجاہدانہ تھا اقدام سرفروشی کا
قلم کے سیف سے دائم ستیزہ کار رہا
ادا بتائی زمانے کو گلفشانی کی
تو دشمنوں کی نظر میں اگرچہ خار رہا
بھلا دیا تھا قفس تو نے قیدِ ہستی کا
کہ جنبشِ پرِ پرواز روزگار رہا
تری زباں پہ تھا ہر دم سبق اخوّت کا
یہی ہے راز مسلماں کی اصل قوّت کا

(۹)

سمجھ گیا تھا تو طرزِ شرارِ بو لہبی
یہی ہے شیوۂ عشقِ محمدؐ عربی
مدارِ زیست سمجھتا تھا عشقِ سوزاں کو
تمام عمر ترے دل میں تھی یہ آگ دبی
سکونِ نفس جُدا تھا معاش جوئی سے
کہاں جگر کی تراوٹ، کہاں یہ تشنہ لبی

ادب حیات کا ہے ذوقِ طرزِ نالہ کشی
سکونِ ضبط کو سمجھا تھا تُو نے بے ادبی
تمام فرشِ زمیں کو ہلا دیا تُو نے
عرب سے ہند کا ڈانڈا ملا دیا تُو نے

(۱۰)

ہر ایک لفظ سے ظاہر تڑپ محبّت کی
ہر ایک بات میں رنگینیاں قیامت کی
ہر ایک حرف میں پہلوئے دردِ بے تابی
ادا ادا تھی کہ چنگاریاں تھیں حسرت کی
تری نگاہ نے ظرفِ طلب کو پہچانا
بقدرِ جیبِ ادب بخششیں تھیں قسمت کی
بشر تھا اور مقامِ ملک کو جان لیا
اسی شعور کو کہتے ہیں داد فطرت کی
جمالِ شعر میں ہے نازِ حسنِ دل داری
بشرطِ آں کہ نگاہوں میں ہو طلب گاری

(۱۱)

وہی ہے شعر کہ جو آئنہ ہو فطرت کا
وہی سخن ہے کہ جو دل بنے طبیعت کا
وہی ہے بات کہ جو قلب میں اُتر جائے
وہی ہے طرز کہ طوفاں ہو بحرِ حکمت کا

وہی کلام ہے ، جو خود کلیم بن جائے
وہی ہے زور کہ ہو جس میں ہاتھ قدرت کا
وہی ہے شان کہ جس پر نظر نہ ٹھہر سکے
وہی نظر ہے کہ جس میں ہو رُخ حقیقت کا
غرض کہ ذوقِ نظر نے ترے کمال کیا
کہ ذرے ذرے کو نظّارۂ جمال کیا

(۱۲)

تو روحِ ”طائرِ طوبیٰ“ تھا پیکرِ اقبال
نہیں ہے صورتِ انساں میں تیری کوئی مثال
زمیں کو چھوڑ کے آیا ہے آسماں کی طرف
کہ پست ہو کے رہے کیوں ترا بلند خیال
تو آ کے خُلد میں اب عیشِ جاودانی کر
مقام جسم ، تری روح کر چکا ہے نڈھال
چمک تو شاخ پہ طوبیٰ کی دل اگر چاہے
کہ اہلِ خلد کو بھائی ہے تیری طرزِ مقال
اُدھر کہ خلد کی رونق بڑھائی جاتی ہے
ادھر ہے خاک کہ کیفی اڑائی جاتی ہے

☆ ☆ ☆

۳۴

مولوی نجف علی خاں

(؟؟ ۱۹ء)

گزشتہ صدی کے آخری ربع میں ، جب عیسائی مشنریوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو تیز کرنے کے لیے ملک کے طول و عرض میں مشن سکولوں کا جال پھیلایا ، تو جلالپور جٹاں (ضلع گجرات) سے تین میل دور دریائے چناب کے کنارے واقع موضع لمہوڑ میں بھی ایک مدرسہ قائم کیا ، جس کے پہلے ہیڈ ماسٹر مولوی دسوندھی خاں مقرر ہوئے - یہ جلالپور جٹاں کے جنجوعہ خاندان کے ایک ذی علم فرزند تھے - انھوں نے اپنے بیٹوں کو عربی ، فارسی اور انگریزی میں نہایت اعلیٰ تعلیم دلائی - بڑے صاحبزادے ڈاکٹر عبدالغنی خاں کو ، جو علم و فضل میں بے حد ممتاز تھے ، امیر عبدالرحمٰن والیِ افغانستان نے کابل میں ایک باوقار منصب عطا کیا - انھوں نے امیر کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی مولوی نجف علی خاں کو بھی ، جو پنجاب میں منصفی کے جلیل القدر عہدے پر ممتاز تھے ، اپنے پاس بلا لیا اور وہ شہزادہ امان اللہ خاں کے اتالیق مقرر ہو گئے -

ڈاکٹر عبدالغنی خاں نے انگریزی میں کئی کتابیں تصنیف کیں جو شائع ہو کر ان کی شہرت اور ناموری کا باعث بنیں ۔ مولوی نجف علی خاں عربی فارسی کے عالم تھے ۔ وہ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے اور عاصی تخلص کرتے تھے ۔ دونوں بھائیوں کو کابل میں خاص عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ان کو تین ہزار روپیہ کلدار ماہانہ تنخواہ ملتی تھی ۔ ان کے تیسرے بھائی مولوی چراغ دین کو نمایاں شہرت حاصل نہ ہو سکی ۔

۱۹۰۹ع/۱۳۲۷ھ میں یکایک خراسان میں انقلابِ عظیم برپا ہوا اور باغیوں کے سرغنوں کے ساتھ ان دونوں بھائیوں کو بھی دارالسلطنت کے ایک شاہی قلعے میں نظربند کر دیا گیا ۔ پھر نہ داد نہ فریاد ، نہ کوئی شنوائی ۔ اس انقلاب کی تفصیلات شیخ کرامت اللہ کی کتاب ''آئینۂ گجرات'' کی جلد پنجم میں دیکھی جا سکتی ہیں ، جو انھوں نے ۱۰ اپریل اور ۲۶ اپریل ۱۹۰۹ع کے روزنامہ ''پیسہ اخبار'' اور ۱۲ اپریل ۱۹۰۹ع کے اخبار ''ہندوستان'' کی خبروں سے اخذ کی ہیں ۔ شہزادہ امان اللہ خاں کچھ عرصہ تو مولوی نجف علی خاں سے سبق پڑھنے زندان ارک (شاہی قلعہ) میں جاتے رہے ، پھر وہ دوسرے کاموں میں مصروف ہوگئے اور مولوی صاحب تغافل کا شکار ہو کر قیدِ تنہائی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیے گئے ۔ اس طرح دس بارہ سال گزر گئے اور : ع

شامتِ اعمالِ عاصی صورتِ نسیاں گرفت

محرم ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵ع میں مولوی نجف علی خاں نے اپنے فرزند ارجمند عبدالمجید کو مخاطب کر کے اس کی تعلیم و تربیت کی

خاطر چند نصیحتیں کیں ۔ یہ پند نامہ پونے چھ سو اشعار پر مشتمل ہے ۔ اس میں تحصیلِ علمِ ادیان پر زور دیا گیا ہے ، علم کے فضائل بیان کیے گئے ہیں ، پابندیٔ فرائضِ دین ـــــ نماز ، روزہ ، زکوٰۃ ، حج و زیارتِ حرمین شریفین ـــــ کی تلقین کی گئی ہے اور تحصیلِ معاش ، آدابِ لباس ، قربِ سلاطین سے احتراز ، تدبیر و توکل ، قناعت و سیرچشمی ، ادب و تواضع ، اپنے سے چھوٹوں اور عزیزوں سے شفقت ، انتخابِ احباب بعد از امتحان ، نیکوں کی صحبت اختیار کرنے اور بدوں کی صحبت سے بچنے کے سلسلے میں ایسی کارآمد باتیں ایسے موثر پیرایے میں بتائی گئی ہیں کہ آج بھی ہر مسلمان نوجوان کا لائحۂ عمل بننے کے لائق ہیں ۔

اس کے دو سال بعد جمادی الاول ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء میں مولوی صاحب نے ''فغانِ مضطر'' کے نام سے ایک قصیدہ لکھا اور کسی ذریعے سے شہزادہ امان اللہ خاں کی خدمت میں بھجوایا ۔ اس میں اپنی کس مپرسی کا شکوہ ، اپنی بے گناہی کا اظہار اور ناکردہ گناہ کی پاداش میں محبوس کیے جانے کا ذکر کرنے کے بعد لطف خاص سے نوازے جانے کی استدعا کی ہے ۔ چند شعر یہ ہیں :

عینِ دولت نورِ چشم خسرو روشن ضمیر
حضرتِ اعلیٰ سراجِ ملّت و دینِ منیر
قرۃ العینِ جنابِ حضرتِ علیا لقب
کو بہ عصمت بے عدیل است و بہ عفّت بے نظیر
با دعائے مخلصانہ اکثرت آرم بیاد
کو فراموش کردہ ای از باعثِ شغلِ کثیر

این دهم سال است کافتادم دریں دارالمحن
بےکس و بیچارہ ، بےیار و مددگار و ظہیر

من ز تو دارم امیدِ شفقت و الطافِ خاص
زانکہ دارم در دعاگوئیت اخلاصِ کثیر

می کنی زندانیاں را اکثر از زندان خلاص
من عجب زندانیم ہستم بہ سہ زنداں اسیر

آں یکے زندانِ غربت واں دگر زندانِ فقر
سوئم اندر کلبۂ تاریک و تیرہ ہمچو قیر

گر بلطفِ خاص بنوازی مرا ، نبود عجب
زانکہ لطفِ عام تو جاری است بر برنا و پیر

عرض کن در حضرتِ قبلہ[1] کہ از بہرِ خدا
بگذر از سہوِ اخی و عذرِ ایں داعی پذیر

از پئے عفوِ خطایش گر شفاعت خواہ شوی
شافعت گردد شفیعِ استاں یوم العسیر

جب امیر امان اللہ خاں تختِ کابل پر جلوس فرما ہوئے تو مولوی نجف علی خاں نے ۱۳ جمادی الثانی ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء کو زندانِ ارک سے تہنیت نامہ روانہ کیا جس کے چند شعر حسبِ ذیل ہیں :

۱- امیر حبیب اللہ خاں جنہوں نے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے حبیبیہ ہال کا سنگِ بنیاد رکھا تھا ۔

ایا فرزندِ شاهِ کشور آرا
کہ بادا جنّت الماوا ش ماوا

ایا اے زادۂ عصمت مآبے
جنابِ حضرتِ علیا خطابے

ز دیدارِ تو چشمش باد پرنور
روانش تازہ و دل باد مسرور

مبادا سایہ اش کم از سرِ تو
دعایش باد یار و یاورِ تو

مبارک بادت اے ظلِّ الٰہی
برغمِ دشمنانت تاجِ شاہی

رعیّت پرورے ، لشکر نوازے
ز بس بے چارگاں را چارہ سازے

حلیم و بردبار و با تحمّل
بری از شیوۂ جاہ و تجمّل

بہ افرادِ رعایا مہربانے
نکوطینتے ، نکو محضر جوانے

غلاماں را بہ حرّیت سرافراز
نمود و با نجابت کرد دمساز

تو شکرِ نعمتِ باری ادا کن
اسیراں را بہ لطفِ خود رہا کن

تو باشی فی امان اللہ دائم
ز گردش ہائے چرخِ نا ملائم

آخر دونوں بھائیوں کو رہائی نصیب ہوئی اور وہ مراجعت فرمائے وطن ہوئے ۔ علامہ اقبال سے بھی ان کی میل ملاقات تھی ۔ مولوی صاحب نے جب اپنی حبسیات جمع کر کے ''تحفۂ امانیہ'' کے نام سے شائع کیں ، تو ایک کاپی حضرتِ علامہ کی خدمت میں بھی پیش کی ۔ آپ نے اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا :

''میں نے یہ نظمیں سرسری نظر سے دیکھی ہیں ۔ مصنّف کا جوشِ عقیدت قابلِ داد ہے ۔''

میر امان اللہ خاں کے تخت چھوڑنے کے بعد جب نادر شاہ نے بچہ سقہ کو شکست دے کر کابل پر قبضہ کر لیا تو ۱۹۳۲ء کے جشنِ استقلال کے موقع پر مولوی صاحب نے باریابی کا شرف حاصل کیا اور ۱۳۹ اشعار کا ایک قصیدہ ''درۂ نادرہ'' پیش کیا ، جس کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں :

شادباش اے حامیِ دینِ رسولِ ؐ نامدار
شادباش اے ماحیِ آثارِ الحاد از وطن
شادباش اے پادشاہِ خلق پرور حق پرست
تابعِ فرمانِ حق داری ھوائے خویشتن

اس کے صلے میں بادشاہ نے تین سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا ، جو مولوی صاحب کو ان کی حیات تک ملتا رہا ۔ ان کے انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی ۔

☆ ☆ ☆

۳۵

وحشت کلکتوی

(۱۹۵۶ء)

سیّد رضا علی وحشت کلکتوی کے جدِ بزرگوار حکیم غالب علی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اپنے آبائی وطن دہلی سے نکل کر ہگلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ وحشت کے والد حکیم شمشاد علی بھی شعر و سخن کا ذوق رکھتے اور اردو فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرماتے تھے۔ وحشت ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ مدرسۂ عالیہ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۹۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد کچھ عرصے تک امپیریل ریکارڈس ڈیپارٹمنٹ کے شعبۂ فارسی و اردو میں چیف مولوی کے عہدے پر فائز رہے۔

۱۹۲۷ء میں جب اسلامیہ کالج کلکتہ قائم ہوا تو آپ اردو اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۶ء میں پنشن حاصل کی۔ حسنِ خدمات کے صلے میں حکومتِ ہند نے انہیں ۱۹۲۴ء میں ’’خان صاحب‘‘ کا اور پھر ۱۹۳۰ء میں ’’خان بہادر‘‘ کا خطاب

عطا کیا ۔ پنشن حاصل کرنے کے بعد ۱۹۴۱ع سے ۱۹۵۰ع تک لیڈی برابورن گرلز کالج کلکتہ میں پروفیسری کے منصب پر فائز رہے ۔

قیامِ پاکستان کے بعد وہی برادرانِ وطن ، جن کو وہ ساری عمر اُردو فارسی میں محبّت کا درس دیتے رہے تھے ، ان سے آنکھیں چرانے لگے :

وطن میں آنکھ چراتے ہیں ہم سے اہلِ وطن
تڑپتے رہتے تھے غربت میں ہم وطن کے لیے

اور جب وہ ان کے خون کے پیاسے ہوکر آزار پہنچانے کے درپے ہوئے تو مئی ۱۹۵۰ع میں یہ کہتے ہوئے بادلِ نخواستہ کلکتے سے ہجرت کرکے ڈھاکے چلے آئے :

بہار آئی تو کیا دیکھی ہے چشمِ باغباں میں نے
نظر آتی نہیں ہے خیر اب اپنے نشیمن کی

لیکن یہاں آکر بھی پریشانیوں اور بیماریوں نے پیچھا نہ چھوڑا ۔ آخر ۲۰ جولائی ۱۹۵۶ع کو اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے ۔

وحشت کو علومِ مشرقیہ کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب سے بھی خاص دلچسپی تھی ۔ ان کی کئی کتابیں انگریزوں کو اُردو سکھانے میں مددگار ثابت ہوئیں ۔ اُنھوں نے علامہ شبلی نعمانی ، خواجہ الطاف حسین حالی اور شیخ علی حزیں کو انگریزی خواں طبقے سے روشناس کرایا ۔ ڈاکٹر اے ۔ ایچ ۔ ہارلے پرنسپل اسلامیہ کالج کلکتہ نے ان کے بعض انگریزی مضامین کا انتخاب رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے زیرِ اہتمام شائع کیا ۔ وحشت ایک نقاد اور انشاپرداز کی حیثیت سے بھی ممتاز تھے ۔

وحشت نے پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنے شروع کیے ۔ انھیں ابوالقاسم مظہرالحق شمس فریدپوری سے شرفِ تلمّذ تھا۔ شمس صاحب عبدالغفور نسّاخ مصنّفِ تذکرۂ ''سخنِ شعرا'' کے صاحبزادے اور میرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے ۔ وحشت استاد داغ کی زبان سے تو متاثر تھے ہی ، میر و مومن سے بھی استفادہ کیا ، لیکن غالب کے اتبّاع میں ایک خاص روش اختیار کی جس میں اُنھیں خاصی کامیابی ہوئی ۔ چنانچہ مولانا حالی اس کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''اگر انصاف سے دیکھیے تو میرزا کا تتبّع کرنا دراصل ہم لوگوں کا حصہ تھا مگر آپ نے (وحشت نے) ہمارا یہ حق ہم سے چھین لیا ۔ سچ ہے ''دُوران باخبر در حضور و نزدیکان بے بصر دُور'' تکلّف برطرف ، اگر میرزا صاحب کے ان بلند اور اچھوتے خیالات کو ، جن میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے ، مستثنٰی قرار دیا جائے تو آپ کے اُردو دیوان کو بلا شائبۂ تصنّع ان کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخلِ مبالغہ نہیں ہو سکتا ۔''[1]

وحشت کے اُردو فارسی کلام کے تین مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں :

(۱) دیوانِ وحشت : (۱۹۱۰ع) ، ستارۂ ہند پریس ، کلکتہ ۔
(۲) ترانۂ وحشت : (۱۹۵۳ع) ، مکتبۂ جدید ، لاہور ۔
(۳) نقوش و آثار : (۱۹۵۷ع) ، قرآن منزل ، ڈھاکہ ۔

۱۔ ادبی دنیا ، لاہور (وحشت نمبر) ، ص ۴۴ ۔

وحشت نے اُردو غزل کی تہذیب ایسے انداز سے کی اور اس کی نوک پلک اس سلیقے اور ہنرمندی سے سنواری کہ آج کی غزل کے سراپا میں ان کی مشاطگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے اور بنگال میں اُردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا:

پھلی پھولی اسی اک ذات سے بنگال میں اُردو
عوض کاغذ کے لوحِ دل پہ ہوگا نام وحشت کا

۱۹۱۰ء میں جب حضرتِ وحشت کا پہلا مجموعۂ کلام ''دیوانِ وحشت'' کے نام سے شائع ہوکر اقبال کے پاس پہنچا تو حضرتِ علامہ نے یہ تحسین آمیز مکتوب مولانا وحشت کو لکھا:

''میں ایک عرصے سے آپ کے کلام کو شوق سے پڑھتا ہوں اور آپ کا غائبانہ مداح ہوں۔ دیوان قریباً سب کا سب پڑھا اور خوب لطف اُٹھایا۔ ماشاء اللہ! آپ کی طبیعت نہایت تیز ہے اور فی زمانہ بہت کم لوگ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی مضمون آفرینی اور ترکیبوں کی چستی خاص طور پر قابلِ داد ہے۔ فارسی کلام بھی آپ کی طبّاعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ شعر کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ ایک مستقل اثر پڑھنے والے کے دل پر چھوڑ جائے، تو یہ بات آپ کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔''[1]

☆ ☆ ☆

۱۔ ''نقوش و آثار''، مطبوعہ قرآن منزل، ڈھاکہ، ص ۹۶۔

٣٦

اسد ملتانی

(١٩٥٩ء)

محمد اسد خاں ، جو بعد میں اسد ملتانی کے نام سے مشہور ہوئے ، قوم افغان شیرانی سے تعلق رکھتے اور خان غلام قادر خاں کے فرزند تھے۔ ١٣ دسمبر ١٩٠٢ء کو کڑی افغاناں ملتان میں پیدا ہوئے ۔ میٹرک تک تعلیم چرچ مشن ہائی اسکول ملتان میں حاصل کی ۔ ١٩٢٠ء میں گورنمنٹ کالج سے بی ۔ اے پاس کیا ۔ سائنس اور فلسفے سے خاص دلچسپی تھی ۔ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ ملتان کے اسلامیہ ہائی سکول میں مدرس رہے اور ایک ہفت روزہ ''الشمس'' اور سائنسی ماہنامہ ''روشنی'' جاری کیا ۔ مگر ١٩٢٦ء میں حکومت ہند کی سیکریٹریٹ میں ملازم ہو کر دہلی چلے گئے ۔ پہلے فارن اینڈ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ اور پھر سپرنٹنڈنٹ رہے ۔ ملک تقسیم ہونے کے بعد پاکستان چلے آئے اور گیارہ برس کراچی میں رہے ۔ مرکزی صدر مقام کی تبدیلی کے ساتھ راولپنڈی آئے اور نومبر ١٩٥٩ء میں وزارتِ خارجہ میں ریاست ہائے سرحدات کے ڈپٹی سیکریٹری کی

حیثیت سے وہیں انتقال کیا ۔

شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا جو کالج میں آ کر پروان چڑھا اور پھر عمر کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا گیا ۔ اسد بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے مگر انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں جو زیادہ تر اقبال کے رنگ میں ہیں ۔ خود اعتراف کرتے ہیں :

شعر میں حضرتِ اقبال کا پیرو ہونا
ہے اگر جرم تو بے شک اسد اقبالی ہے

علامہ اقبال نے ان کی ایک طالب علمانہ کوشش کو مقابلے میں اوّل انعام کا مستحق قرار دے کر حوصلہ بڑھایا اور اپنے قلم سے بعض سُست بندشوں کو چُست کر کے ذرے کو آفتاب بنا دیا ۔ اس کے بعد اسد نے اپنی ریاضت سے ملک گیر شہرت حاصل کی ۔ علامہ اقبال تک رسائی کا دلچسپ حال انھوں نے خود بیان کیا ہے ۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۳ع کو نئی دہلی سے لکھتے ہیں :

"معلوم نہیں یہ سلسلہ اب تک جاری ہے یا نہیں ، لیکن بیس پچیس برس پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں ہر سال تقسیمِ انعامات کے موقع پر ایک انعام اردو میں بہترین نظم لکھنے والے طالب علم کو ملا کرتا تھا ۔ چنانچہ ۱۹۲۱ع میں ، جب میں جماعت سال اوّل میں تعلیم پاتا تھا ، کالج کے طلبہ کو حسبِ معمول نظمیں پیش کرنے کی دعوت دی گئی ۔ میں ابھی کالج میں نو وارد تھا ۔ کالج کی ادبی مجالس میں بھی کوئی عملی حصہ نہیں لیا تھا اور چند احباب کے سوا کسی کو میرے ذوق شعر و شاعری کا علم نہ تھا ۔

انھی میں سے بعض احباب نے مجھے انعامی مقابلے کے لیے نظم لکھنے کا مشورہ دیا ، مگر اُن دنوں کالج میں کچھ ایسی مشہور ادبی شخصیتیں موجود تھیں کہ ان کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہ ہوئی ۔ ایک دوست ایسے تھے جن کا مشورہ اصرار کی حد تک پہنچ گیا اور اُن کے اصرار میں ''خود را پیش کن'' سے زیادہ ''امتحانِ خویش کن'' کا جذبہ کارفرما نظر آتا تھا ۔ آخر ان کا اصرار کامیاب ہوا ۔ اُنھی دنوں ایک مضمون ذہن میں گردش کر رہا تھا ۔ اسی کو میں نے ''شبنم کا قطرہ'' عنوان دے کر نظم میں ڈھال دیا اور یہ نظم کالج کے دفتر پہنچا دی ۔

کوئی مہینہ بھر کے بعد ایک دن اچانک انھی اصرار کرنے والے دوست نے آ کر مبارک باد دی کہ آپ کی نظم اوّل قرار دی گئی ہے اور اس کا اوّل انعام آپ کو ملے گا ۔ میں اسے مذاق سمجھا مگر جب ان کے کہنے پر خود جا کر تختہ اعلانات پر اعلان پڑھا تو مسرت آمیز تعجب ہوا کیونکہ مجھے اس کی بالکل اُمید نہ تھی ۔ کالج کے طلبہ میں تو یہ ایک طے شدہ امر تھا کہ اوّل انعام بزمِ سخن کے سیکریٹری کا حصہ ہے جو کالج کے ''ملک الشعرا'' کہلاتے تھے ۔ اُس وقت لاہور کے ادبی حلقوں میں خاصی شہرت کے مالک تھے اور کئی برس سے متواتر انعام لے رہے تھے ۔ اعلان میں درج تھا کہ میری نظم اوّل اور ان کی نظم دوسرے درجے پر قرار دی گئی ہے ۔ فلاں تاریخ کو کالج کا

ایک خاص جلسہ منعقد ہوگا جس میں ہم دونوں یہ نظمیں پڑھ کر سنائیں گے - اس کامیابی پر میرے احباب کی اور خاص طور پر میری خوشی کا سب سے بڑا باعث یہ تھا کہ انعامی مقابلے کا فیصلہ حضرتِ علامہ اقبال نے فرمایا تھا - جس روز جلسہ ہوا ، میری نظم میرے حوالے کر دی گئی - یہ دیکھ کر میری مسرّت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ نظم پر جابجا اصلاح بھی موجود تھی - اس وقت تو میں اس اصلاح کو نہ پوری طرح پڑھ سکا اور نہ اچھی طرح سمجھ سکا ، اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس جلسے میں مَیں نے کہیں اصل اور کہیں اصلاح کے مطابق نظم پڑھ دی تھی ، لیکن بعد میں جب غور سے دیکھا تو اصلاح کی اہمیت محسوس ہوئی -

چند روز کے بعد میں خود علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا - ان دنوں وہ انارکلی والے بالاخانے میں قیام فرما تھے - میں جھجکتے جھجکتے اوپر پہنچا - انھوں نے پاس کی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا - میں بیٹھ گیا - وہ خود ایک آرام کرسی پر لیٹے ہوئے حقّہ پینے میں مصروف تھے - سامنے ان کے ایک ہم عمر بزرگ تشریف رکھتے تھے ، جو سیالکوٹ کے رہنے والے اور غالباً ان کے ہم جماعت یا بچپن کے دوست تھے - ان کے ساتھ وہ اپنے طالب علمی کے زمانے کے واقعات کی یاد تازہ کر رہے تھے کہ وہ سیالکوٹ میں کس طرح مدرسے کے اوقات کے بعد مساجد و مکاتب میں مختلف مولوی صاحبان کی خدمت میں حاضر ہو کر فارسی پڑھا کرتے تھے-

ایک استاد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کا (اپنا یا شاید ان کا بتایا ہوا) یہ شعر اب تک نہیں بھولتا :

از قدِ رعنائے او من دردمند آفتادہ ام
دوستاں رحمے کہ از بامِ بلند افتادہ ام

اس انداز کے دلچسپ واقعات کے بعد فرمانے لگے : لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ اقبال کو فارسی کیونکر آ گئی جب کہ اس نے سکول یا کالج میں یہ زبان نہیں پڑھی ۔ انھیں یہ معلوم نہیں کہ میں نے فارسی زبان کی تحصیل کے لیے سکول ہی کے زمانے میں کس قدر محنت اٹھائی اور کتنے اساتذہ سے استفادہ کیا ۔

فارسی زبان کے سلسلے میں مولانا گرامی (مرحوم) کا ذکر آ گیا ۔ ان کے غیر معمولی حافظے کی تعریف کرتے ہوئے بتایا کہ کسی کو اشعار یا غزلیں یا نظمیں یاد ہوں گی مگر مولانا کو مثنویاں تک مسلسل یاد ہیں ۔ وہ اس وقت اسی کمرے کے ایک گوشے میں پلنگ پر دراز تھے ۔ فرمایا : ''لیجیے ابھی ان کے حافظے کا کرشمہ دیکھیے ۔'' یہ کہہ کر مولانا کو آواز دی ۔ وہ اٹھ بیٹھے ۔ کہا کہ مولانا ! حضرتِ نظامی نے وہ کیا فرمایا ہے : ع

ز گرد بیاباں بیاباں گرد

بس اس مصرع کا سننا تھا کہ مولانا گرامی دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں اٹھا کر جھومنے لگے اور کہنے لگے ''اللہ اللہ اللہ !'' اس کے بعد ایک دو بار اس مصرع

کو دہرایا اور پھر وہیں سے مثنوی شروع کر دی ۔ مزے لے لے کر شعر ہر شعر پڑھتے گئے ۔ میں نے مولانا گرامی کو پہلی اور آخری بار جبھی دیکھا ۔ ان کا منڈا ہوا سر ، آٹھی ہوئی انگلیاں ، نیم وجد کا عالم ، جھوم جھوم کر زور دار اور پُر جذب آواز کے ساتھ شعر پڑھنا ، یہ تمام منظر اب تک میرے تصور پر نقش ہے ۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا اور شاید بہت دیر جاری رہتا ، لیکن آخر حضرتِ علامہ نے نہایت حسنِ اسلوب سے موضوع بدل کر گفتگو کا رُخ کسی اَور طرف پھیر دیا ۔

کچھ دیر بعد میری طرف مستفسرانہ انداز میں توجہ فرمائی تو میں نے اپنا تعارف اس طرح کرایا کہ وہ اصلاح شدہ نظم ان کی خدمت میں پیش کر کے ان کی توجہِ خاص کا شکریہ ادا کیا ۔ دیکھ کر فرمایا کہ ہاں یہ نظم مجھے پسند آئی تھی ۔ اس خیال سے کہ یہ کہیں شائع ہوگی ، میں نے جہاں جہاں ضروری سمجھا ، اصلاح کر دی ۔ اس کے بعد کچھ وقت اصلاح کے متعلق باتیں ہوئیں ۔ چونکہ دیر بہت ہوگئی تھی ، آخر میں نے اجازت طلب کی اور اس محفلِ خاص سے با دلِ ناخواستہ رخصت ہوا ۔

یہ تھی حضرتِ علامہ کی خدمت میں میری پہلی حاضری اور یہ تھی وہ صورتِ حالات جس کے ماتحت میری نظم کو حضرتِ علامہ کے قلم سے اصلاح کا شرف حاصل ہوا ۔ اس اصلاح کی عکسی تصویر ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ

میں شامل ہے - فنی حیثیت سے یہ اصلاح شاید کچھ زیادہ اہم نہ سمجھی جائے ، کیونکہ نظم بالکل مبتدیانہ ہے ، اس لیے زیادہ تر اس میں غلطیوں کو صحیح اور سست بندشوں کو درست کرنے ہی کی ضرورت تھی ، لیکن چند مقامات ایسے بھی ہیں جہاں اصلاح میں نوکِ قلم کی استادانہ جنبش صاف نمایاں ہے - مثلاً :

اس طرح پھرتا پھراتا جستجوئے یار میں
تھک کے آخر گر پڑا ہوں گوشۂ گلزار میں

ع : کیا کہوں پوشیدہ تھی فطرت میں از خود رفتگی
ع : کوہ میں بھی دل نہ بہلا ، ہمرہِ دریا ہوا

ان مصرعوں میں تھوڑی سی تبدیلی سے اشعار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا گیا ہے ، لیکن ان سب سے بڑھ کر نظم کا پہلا شعر خاص طور پر قابلِ توجہ ہے - کیونکہ اس میں حضرتِ علامہ نے میرے دو مصرعوں کو ایک مصرع میں سمو کر اور دوسرا مصرع اپنی طرف سے بڑھا کر نظم کی تمہید کو مکمل کر دیا ہے - علاوہ ازیں نظم کے ابتدائی چند اشعار کا قلمزد ہو جانا بھی حضرتِ علامہ کے خاص نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے - اُن دنوں تو مجھے بھی تعجب اور افسوس ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے ایسی عمدہ تشبیہات کو بحال نہ رہنے دیا ، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ، اصلاح کی مصلحت واضح ہوتی گئی اور آخر صاف محسوس ہونے لگا کہ حضرتِ علامہ کے نزدیک

بے جان فن کاری اور مصنوعی شاعری کس قدر بے کار اور بے معنی چیز ہے - بہرصورت فن کے لحاظ سے اس اصلاح کی قدر و قیمت کا اندازہ کچھ بھی لگایا جائے ، جہاں تک مجھے علم ہے ، حضرتِ علامہ نے کبھی کسی کی نظم کی اصلاح اپنے قلم سے نہیں فرمائی ۔ اگر یہ درست ہے تو پھر اس حیثیت سے یہ اصلاح یقیناً اہلِ ذوق کے لیے نوادرِ ادبیہ میں سے ہے اور میرے لیے بجا طور پر باعثِ فخر و مباہات ۔"[۱]

اسد ملتانی کی وہ ابتدائی کوشش ، جس کو اقبال نے اپنی اصلاح سے سنوارا ، حسبِ ذیل ہے :

شبنم کا قطرہ

قطرۂ بے رنگ ہوں یا قلزمِ نیرنگ ہوں
سننے والے سن کہ میں بھی اک خموش آہنگ ہوں
وقفِ بے تابی ہے میری جانِ مضطر کے لیے
میں بنا ہوں چرخ کی مانند چکّر کے لیے
گردشِ ہفت آسماں پنہاں ہے میرے سینے میں
زندگی کا راز پوشیدہ ہے میرے جینے میں
سن ذرا غافل مری آوارگی کی داستاں
میں کہاں تھا ؟ کس لیے اور کس طرح پہنچا یہاں ؟

۱- اقبال نامہ ، مرتبۂ شیخ عطاء اللہ ، جلد اوّل ، صفحات ۳۴۰ - ۳۴۷ -

پہلے پہلے تھا ٹھکانا اک سمندر میں مرا
تھا نہایت خرّم و شاداں دل اس گھر میں مرا
یاد ہیں لہریں جو سطحِ آب پر آوارہ تھیں
ہاں یہی لہریں ، یہی موجیں مرا گہوارہ تھیں
یاد آتی ہیں مجھے رہ رہ کے وہ آزادیاں
جن کی خاطر اب ترستا ہے دلِ ناشاد یاں
گاہ سونے کے لیے تہہ میں چلا جاتا تھا میں
سطح پر بہرِ تماشا گاہ آ جاتا تھا میں
اتفاقاً ایک دن آیا جو سطحِ آب پر
جا پڑی میری نگہ خورشیدِ عالم تاب پر
دیکھ کر اس شعلہ رُو کو آگ سی دل میں لگی
کیا کہوں ، پوشیدہ تھی فطرت میں از خود رفتگی
دل مرا تیرِ نگاہِ مہر نے گھائل کیا
اور وفورِ شوق نے پرواز پر مائل کیا

چھوڑی شکلِ اشک اور آہِ رسا بن کر اڑا
میں ہوائے وصلِ جاناں میں ہوا بن کر اڑا

شام آئی جس گھڑی ، میرا مقدّر سو گیا
میری قسمت کی طرح تاریک منظر ہو گیا
جس سے ملنے کے لیے میں ڈھونڈتا تھا کوئی راہ
اس کے نظّارے سے بھی آنکھیں ہوئیں محروم آہ !
ابر کے ہمراہ سرگرداں رہا میں رات بھر
تارے دیکھے ، چاند دیکھا ، پر نہ وہ آیا نظر

میں جو تھا ناکام بھی ، مایوس بھی ، بے صبر بھی
میرے حالِ زار پر رونے لگا خود ابر بھی
مل گیا بوندوں میں ، اشکِ مضطرب بن کر گرا
رفعتِ گردوں سے آخر اک پہاڑی پر گرا
کوہ میں بھی دل نہ بہلا ہمرہِ دریا ہوا
جوشِ وحشت میں روانہ جانبِ صحرا ہوا
جب مرا بے مہر دلبر پھر نظر آیا مجھے
اور کمندِ حسنِ دل آویز سے کھینچا مجھے
آبِ دریا سے مجھے فوراً جُدا ہونا پڑا
پھر سوارِ توسنِ بادِ صبا ہونا پڑا
اس طرح پھرتا پھراتا جستجوئے یار میں
تھک کے آخر گر پڑا ہوں گوشۂ گلزار میں
ہوں وہی قطرہ جو تھا اک دن سمندر میں نہاں
ہوں وہی قطرہ جو تھا ہمراہِ دریائے رواں
ہوں وہی قطرہ کہ جو تھا ابرِ گوہربار میں
ہوں وہی قطرہ جو برسا تھا کبھی کہسار میں
میں وہی قطرہ ہوں جو کالی گھٹا کے ساتھ تھا
میں وہی قطرہ ہوں جو اک دن ہوا کے ساتھ تھا
بات یہ ہے ، اہلِ دنیا جانتے ہیں کم مجھے
یہ سمجھتے ہیں فقط اک قطرۂ شبنم مجھے
قطرۂ ناچیز ہوں ، لیکن جہاندیدہ ہوں میں
تجربہ کار ، انقلابِ آسماں دیدہ ہوں میں

میری ہستی ہستیِ انسان سے کچھ کم نہیں
غافل انساں لیکن ان اسرار سے محرم نہیں
مجھ میں پوشیدہ ہے رازِ زندگیِ بے ثبات
مجھ سے پوچھو نکتہ سربستہ موت و حیات
محرمِ رازِ بلندی، واقفِ پستی ہوں میں
بہرِ انساں رہنمائے منزلِ ہستی ہوں میں
ہاں مجسّم تجربہ ہوں، اور سراپا ہوش ہوں
ہوں ذرا سا قطرہ لیکن بحر در آغوش ہوں

۱۲ فروری ۱۹۲۱ء

اسد صاحب دہلی میں مقیم تھے کہ مارچ ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال غازی رؤف پاشا کی تقریر کے موقعے پر جلسے کی صدارت کے لیے جامعۂ ملیّہ دہلی تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی ''دارالسلام'' میں قیام تھا۔ اسد صاحب اپنے دوستوں امداد حسین اخگر مراد آبادی اور مولوی محمد احمد خاں ندوی مرحوم (متوفی ۱۹۳۶ء) کی معیت میں ۱۴ مارچ کو علامہ سے ملنے ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوئے۔ یہ محفل تین گھنٹے تک جاری رہی۔ مختلف موضوعات پر دلچسپ باتیں ہوتی رہیں، جنھیں اسد صاحب نے اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا۔ اس روزنامچے کے چند اوراق اختر راہی صاحب نے مجلہ ''اقبال'' لاہور بابت اپریل ۱۹۷۶ء میں شائع کرائے ہیں، جن سے زبان، وضعِ الفاظ و تراکیب، اردو میں پنجابی کے استعمال، مغرب کی تقلید، ترکوں کے رویے، اسلام کے مستقبل، فلسفہ اور مذہب، غیر معمولی انسان، عالمِ اسلام، مردِ منتظر، مکتوباتِ مجدد

سرہندی؎، مقصدِ حیات اور فہمِ قرآن کے بارے میں اقبال کی رائے معلوم ہو سکتی ہے۔ اقبال نے فرمایا:

''زبان کی کچھ پروا نہیں۔ زبان تو اہلِ فکر خود پیدا کرتے ہیں۔ اہلِ زبان کے متعلق تو اتنا سمجھتا ہوں کہ انھیں چکی چولھے کے الفاظ کافی تعداد میں معلوم ہوتے ہیں ورنہ علمی خیالات کے اظہار کے لیے اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان دونوں برابر ہیں۔ دونوں کو خیالات کے مطابق الفاظ تراشنے پڑتے ہیں۔ مرزا بیدل کی فارسی کو اہلِ زبان نے کبھی تسلیم نہیں کیا کیونکہ وہ محاورات تک نئے پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً ان کا مصرع ہے:

''ابر ہر قدمے خرام می کاشت'' — ''خرام کاشتن'' فارسی میں کوئی محاورہ نہیں مگر جو خیال بیدل کے ذہن میں تھا، اس کو ادا کرنے کے لیے لازمی تھا کہ یہی الفاظ استعمال کیے جاتے کیونکہ ان کے علاوہ اور کوئی الفاظ فارسی زبان میں اس مفہوم کو ادا نہیں کر سکتے — میرا ہمیشہ ایسا خیال رہا ہے کہ پنجاب میں طلبا کے لیے جو اردو کورس ہوں ان میں، حسبِ ضرورت، پنجابی کے الفاظ استعمال ہونے چاہئیں؛ مثلاً مولانا آزاد نے اپنے قاعدے میں ایک جگہ لکھ دیا ہے کہ ''لیزم ہلاؤ'' (مگدر ہلاؤ)۔ دہلی میں تو یہ لفظ بچے بآسانی سمجھ سکتے ہیں مگر پنجاب میں بچے تو کیا سمجھیں گے، استاد بھی اس کے معنے دریافت کرتے رہتے ہیں۔ اگر اس کے بجائے کوئی ایسا نام استعمال ہوتا

جو اُردو کا نہ سہی لیکن پنجاب میں عام ہوتا تو یقیناً زیادہ مفید رہتا ۔ اسی امر کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے پنجاب میں یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ زراعت کی کتابوں میں بالخصوص پنجابی کے الفاظ بے تکلف استعمال کیے جائیں ۔"[1]

عام شاعروں کی نسبت اسد کا خیال تھا کہ :

شاعر اک نغمۂ رنگیں جو سنا دیتا ہے
جام مے کان کے رستے سے پلا دیتا ہے

عیش و آرام کے دامن میں دکھا کر رحمت
روح کو جسم کی تربت میں سلا دیتا ہے

زندگی میں نہ رہے کچھ بھی حرارت باقی
اشکِ حسرت سے دل اس طرح بجھا دیتا ہے

ہے دمِ سرد تو کیا اور نفسِ گرم تو کیا
شعلۂ تند ہوس ہی کو ہوا دیتا ہے

کھیلتا ہے فقط اُبھرے ہوئے جذبات کے ساتھ
ان کی تیزی کو ذرا اور بڑھا دیتا ہے

اہلِ محفل کے خیالات کے لیے کر پرتو
اپنے الفاظ کے پردے میں سجا دیتا ہے

پھر عجب کیا ہے جو ٹھہرے یہ سخن کا معیار
شعر اچھا ہی وہی ہے جو مزا دیتا ہے

مگر علامہ کے اندازِ سخن کے متعلق ان کی رائے بالکل

۱۔ مجلہ اقبال ، لاہور ، اپریل ۱۹۷۶ع ، صفحات ۷۳ - ۷۶ ۔

مختلف تھی[1]:

مختلف ہے مگر اقبال کا اندازِ سخن
شاعری کو وہ حقیقت سے ملا دیتا ہے

ذوقِ تفریح و تفنّن سے اسے کر کے بلند
شعر کو لازمۂ زیست بنا دیتا ہے

ممکناتِ دلِ انساں کو نمایاں کر کے
اک نیا ولولۂ نشو و نما دیتا ہے

ڈال کر سوزِ تمنّا کی کوئی چنگاری
سرد سینے میں بھی اک آگ لگا دیتا ہے

دہر کے رنج و الم ہیچ نظر آتے ہیں
دل کو ایسا غمِ اندوہ رُبا دیتا ہے

موت کا خوف ہی دل میں نہیں رہتا باقی
ایسے انداز سے پیغامِ بقا دیتا ہے

کر کے انساں میں احساسِ خودی کو بیدار
دل کی سوئی ہوئی قوّت کو جگا دیتا ہے

فلسفے کو وہ بناتا ہے محبّت کا غلام
عقل کو عشق کے رستے پہ لگا دیتا ہے

پیکرِ خاک کو دیتا ہے شعورِ ہستی
اور پھر انساں کو مسلماں بنا دیتا ہے

جناب اسد کا زیادہ تر کلام اردو میں ہے ۔ کچھ فارسی اور کچھ

۱۔ مجلہ اقبال ، لاہور ، اپریل ۱۹۷۶ع ، صفحات ۷۳ - ۷۶ -

سرائیکی میں بھی ملتا ہے مگر ان کا مکمل مجموعۂ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا - ۱۹۳۸ء میں ایک چھوٹا سا رسالہ ''مرثیۂ اقبال'' اور ۱۹۵۴ء میں سفرِ حج کے دوران میں کہی گئی نظموں کا ایک مختصر سا گلدستہ ''تحفۂ حرم'' کے نام سے اشاعت پذیر ہوا تھا - حکیم سیّد عبدالمجید راحی اور جعفر حسن جعفر نے مظفر گڑھ اکادمی کی جانب سے ایک کتابچہ حال ہی میں شائع کیا ہے جس کا نام ''مطلعین'' ہے - اس میں مولانا عبداللہ نیاز اور اسد ملتانی کے کچھ حالات اور انتخابِ کلام ملتا ہے - اسد کی شعری خدمات کے سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ حکومت ہند کی ملازمت کے دنوں میں وہ بزمِ اُردو شملہ کے سیکریٹری رہے - اس بزم کے مشاعروں کو ملک بھر میں خاص شہرت حاصل تھی -

اسد کی نظموں میں اکبر کا طنز بھی ہے ، حالی کا پندِ سودمند بھی اور اقبال کا تفکّر اور جذبۂ حب الوطنی بھی - بعض اوقات تو ان کی شاعری کا مقصد ہی اقبال کا نورِ بصیرت عام کرنا اور سوزِ عشق پھیلانا معلوم ہوتا ہے - ان کی بہترین نظمیں وہی ہیں جن میں یہ رنگ نمایاں ہے - چند شعر دیکھیے :

زاہد شعورِ حسن سے بیگانہ ہی رہا
حسنِ نظر نہیں ہے تو حسنِ عمل کہاں

ہر شخص بنا لیتا ہے اخلاق کا معیار
خود اپنے لیے اَور ، زمانے کے لیے اَور

ذوق ایثار و عمل کا نہ تجھے ہے نہ مجھے
زیست اس طرح کی زیبا نہ تجھے ہے نہ مجھے

یہ شعر اقبال کے اس مصرع سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے : ع

ہوسِ منزلِ لیلیٰ نہ تو داری و نہ من

☆ ☆ ☆

۳۷

عبدالمجید سالک

(۱۹۵۹ء)

مولانا عبدالمجید سالک ، مدیرِ روزنامہ ''انقلاب'' لاہور ، کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں ۔ علم و ادب ، شعر و سخن ، سیاسیات اور صحافت کے میدانوں میں ان کے نام کے جھنڈے گڑے ہیں ۔ وہ ۱۳ دسمبر ۱۸۹۳ء کو بٹالہ (ضلع گورداسپور) میں پیدا ہوئے اور ۲۷ دسمبر ۱۹۵۹ء کو لاہور کی خاک میں سما گئے ۔ مرحوم بے شمار خوبیوں کے مالک تھے ۔ اخلاص و مروّت اور انسانی ہمدردی کے جوہر ان کی ذات میں کُوٹ کُوٹ کر بھرے ہوئے تھے ۔ خوش گفتاری ، حاضر جوابی ، شگفتہ مزاجی اور طنز و مزاح کے معاملے میں بھی ان ک کوئی حریف نہ تھا ۔ طبیعت باغ و بہار پائی تھی ۔ ان کی باتوں میں ایسی مٹھاس تھی کہ سننے والا پہروں مزے لیتا رہتا ۔ ''افکار و حوادث'' کا انتخاب چھپ جاتا تو وہ زندۂ جاوید ہو جاتے ۔

آنھوں نے بیسیوں کتابیں تصنیف اور ترجمہ کیں ۔ اپنی خود نوشت سوانح حیات ''سرگزشتِ سالک'' میں نہایت تفصیل سے اپنے حالات بیان

کیے۔ اس میں علامہ اقبال سے ملنے اور ان کی صحبتوں میں شریک ہونے کے واقعات بھی جگہ جگہ ملتے ہیں۔ میں نے اس پوری کتاب کا خلاصہ بارہ صفحوں میں کر کے "نقوش" لاہور کے "آپ بیتی نمبر" میں شائع کرایا ہے۔ تفصیلات جاننے کے شائقین ان کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب "ذکرِ اقبال" کی تصنیف سے بہت پہلے، حضرتِ علامہ کی وفات سے کوئی ڈیڑھ ماہ بعد، مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کی فرمائش پر ان کے اخبار "شیرازہ" کے "اقبال نمبر" میں ایک مختصر سا مضمون "علامہ اقبال" کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا۔ یہ مضمون اور "سرگزشتِ سالک" کے بعض متعلقہ حصے اس قابل ہیں کہ انھی کے الفاظ میں یہاں نقل کر دیے جائیں۔ فرماتے ہیں:

"حضرتِ علامہ کے ساتھ مجھے بدوِ شعور ہی سے انتہائی عقیدت تھی۔ ۱۹۰۸ع میں، کہ میری عمر بمشکل چودہ سال ہوگی، مجھے شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے شعر کہنا شروع کیے اور پٹھانکوٹ اور بٹالہ کے مشاعروں میں غزلیں پڑھیں۔ میں نے مولانا حالی کی خدمت میں تلمّذ کے لیے لکھا۔ آپ نے اپنی ضعیفی کا عذر پیش کر کے ڈاکٹر اقبال کا نام تجویز کیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو ایک خط لکھا جس میں تلمّذ کے لیے درخواست کی اور ایک غزل بطورِ نمونہ بھیجی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے خط لکھا:

"آپ کے اشعار اچھے ہیں۔ یاد رکھیے کہ ہر شخص کو طبیعت آسمان سے ملتی ہے اور زبان زمین سے۔ اگر آپ کی طبیعت شعر گوئی کے لیے موزوں ہے، تو

آپ خود بخود اس پر مجبور ہوں گے - رہا زبان کا
مسئلہ ، تو میں اس کے لیے موزوں استاد نہیں ہو سکتا۔
مثل مشہور ہے کہ شاعری ایک ''بے پیرا'' فن ہے -
لوگ اس مثل کو شاعری کی تحقیر کے لیے استعمال
کیا کرتے ہیں لیکن میرے نزدیک یہ حقیقت ہے کہ
شاعری میں کسی پیر یا استاد کی ضرورت نہیں ۔ آپ کے
کلام سے ہونہاری ٹپکتی ہے ۔ اگر آپ کا یہ شوق قائم
رہا تو آپ کسی دن بہت اچھے شاعر ہوں گے ۔''

اس عبارت کے نیچے ایک نوٹ لکھا تھا کہ اگر آپ شاگردی
پر مصر ہی ہیں ، تو داغ کے شاگردوں میں سے دو کے نام
لکھتا ہوں ۔ ان سے رجوع کیجیے ۔ سیّد محمد احسن مارہروی
(مارہرہ ضلع ایٹہ) اور منشی حیات بخش رسا صاحب دربار
رام پور ۔

خط کے آخری صفحے پر مجھے مشورہ دے رکھا تھا کہ
''مفیدالشعرا''، رسالۂ ''تذکیر و تانیث'' (جلال لکھنوی)
اور ''تحفۃ العروض'' ضرور دیکھ لیجیے ۔ میں نے حضرت کے
مشورے کے مطابق یہ کتابیں بھی دیکھیں اور منشی
حیات بخش صاحب رسا مرحوم کو چند غزلیں بھی دکھائیں ،
جنھوں نے اصلاحِ اشعار میں کامل مہارت اور پوری شفقت
کا ثبوت دیا ۔''

۱۹۱۲ء میں سالک صاحب لاہور آ گئے ۔ اُس وقت ان کی عمر
اٹھارہ اُنیس برس تھی ۔ خود فرماتے ہے کہ حضرتِ علامہ کی خدمت

کارروائی نہ کرتے ۔ تو پھر اس غریب ماہنامے کے خلاف عتاب کی وجہ ؟ اور اگر آپ اجازت پر مُصر ہوں تو میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ میرے پاس آپ کی تین غیرمطبوعہ نظمیں اَور موجود ہیں اور میں انہیں ''کہکشاں'' میں درج کرنا چاہتا ہوں ۔ اس پر تکدّر کا بادل ایک دم چھٹ گیا اور آپ نے ہنسی خوشی اجازت دے دی ۔

۱۹۲۰ع میں میں ''زمیندار'' کا ایڈیٹر مقرر ہوا ۔ کبھی کبھی مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ اور کبھی تنہا حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا ۔ آخر ۱۹۲۱ع میں سال بھر کے لیے قید ہو گیا ۔ رہا ہو کر آیا تو آپ انارکلی بازار والی بیٹھک چھوڑ کر میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں منتقل ہو چکے تھے ۔ حاضرِ خدمت ہوا تو ایک دم اُٹھ کھڑے ہوئے اور بڑھ کر بغل گیر ہوئے ۔ آبدیدہ ہو کر فرمایا : ''کہیے جیل میں کوئی خاص تکلیف تو نہیں ہوئی ؟''

میں نے جیل کے حالات ، اس کی زندگی کے ضبط و نظم ، اس کی محنت اور روکھی سوکھی روٹی کا ذکر کیا تو فرمانے لگے :

''الدنیا سجن المومن و جنّۃ الکافر

کا فلسفہ تو آپ کی سمجھ میں اچھی طرح آ گیا ہوگا ؟'' میں نے عرض کی ''ارشاد فرمائیے'' کہنے لگے ''دنیا میں مومن

کو چاہیے کہ پوری پابندی اور ضبط و نظام کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ ایک لمحے کے لیے دین و آئین کے دائرے سے باہر قدم نہ رکھے۔ مشقّت دن رات کرے۔ روکھا سوکھا کھائے اور موٹا جھوٹا پہنے۔ تعیّش مومن کا کام نہیں ہے۔ یہ کافروں کا شیوہ ہے کہ دنیا کو جنّت سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جنّت میں نہ کوئی پابندی ہوگی، نہ محنت مشقّت۔ اعلٰی درجے کی خوراک و پوشاک ملے گی۔ اگر آپ سال بھر کی اسیری سے اس نکتے کو سمجھ گئے ہیں تو اس قید کو نعمتِ الٰہی سمجھیے۔"

جیل سے واپس آنے کے بعد بھائی مہر (غلام رسول مہر) کی رفاقت حاصل ہوئی جو میری زندگی کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ ہم دونوں حضرتِ علامہ کے عاشق تھے۔ وہ مجھ سے زیادہ اور میں اُن سے زیادہ۔ اب ہم دونوں اکٹھا حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ "انقلاب" ۱۹۲۷ء کے اپریل میں جاری ہوا اور حضرتِ علامہ نے اس کی طرف اپنی مشفقانہ توجّہات بر حال میں مبذول رکھیں۔ ہم دونوں نے حضرت کی صحبت میں جو کچھ حاصل کیا، اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ شعر و ادب، تاریخ و فلسفہ اور مذہب کے جو غوامض و اسرار حل ہوئے، مختلف مسائلِ ملکی کے متعلق جو مکالمات ہمارے درمیان ہوئے،

مجلسی و دوستانہ تعلقات کی جو منزلیں طے ہوئیں ، ان کے
متعلق صدہا واقعات ہیں ، جو تشنۂ بیان ہیں اور انشاء اللہ
کسی موقع پر ضرور بیان کیے جائیں گے ۔''[۱]

☆ ☆ ☆

۱۔ مقتبس از مضمون مولانا عبدالمجید سالک مرحوم ، جو پہلے ''شیرازہ'' کے اقبال نمبر میں ''علامہ اقبال'' کے عنوان سے شائع ہوا ۔ پھر مولانا چراغ حسن حسرت کی مرتّب کردہ کتاب ''اقبال نامہ'' میں شامل ہوا ۔ (دیکھیے اقبال نامہ ، مطبوعہ تاج کمپنی لاہور ، صفحات ۳۲ - ۴۲ ۔

۳۸

دل شاہجہانپوری

(۱۹۵۹ع)

اعتبار الملک حکیم ضمیر حسن خان دل شاہجہانپوری کا سلسلۂ نسب آٹھ واسطوں سے شاہ قاسم سلیمانی تک پہنچتا ہے ، جو سلسلۂ قادریہ کے نہایت مشہور بزرگ تھے اور سیّد عفیف الدینؒ کے خلیفۂ اجل سمجھے جاتے تھے ۔ اخیر عمر میں جب آپ ہندوستان تشریف لائے تو لوگ اس کثرت سے مرید ہوئے کہ حکومت ڈرگئی اور عہدِ جہانگیری میں آپ کو قلعۂ چنارگڑھ میں قید کر دیا گیا ۔ اسی قید کی حالت میں ۱۰۱۶ھ (۱۶۰۷ع) میں آپ واصل بحق ہو گئے ۔

اس کے بعد آپ کا خاندان شاہجہانپور میں سکونت پذیر ہوا ۔ یہیں ۱۸۷۵ع میں حضرتِ دل پیدا ہوئے ۔ صغر سنی ہی میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا ۔ آپ نے اپنی والدہ محترمہ اور ماموں کی نگرانی میں درسِ نظامیہ کی تمام کتابیں (معقول و منقول) مختلف اساتذہ سے پڑھیں ، جن میں مولوی محمد علی خیال ، مولوی نادر الدین پشاوری ، مولوی بشیر احمد مراد آبادی اور مولوی عبدالباسط شاہجہانپوری

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ فارسی میں بھی تکمیل حاصل کی اور اس کے بعد فنِ طب میں کمال پیدا کر کے اپنا مطب نہایت خوش سلیقگی سے چلایا اور عزت کی زندگی بسر کی ۔

حضرتِ دل نے فنِ شعر میں امیر مینائی کی شاگردی اختیار کر کے شاگردانِ امیر میں امتیاز حاصل کیا ۔ وہ ایک ایسے شاعر تھے ، جو "اپنے مقتضائے ماحول سے بلند ، اپنے منشائے تعلیم و تربیت سے ارفع ، اپنے حدودِ مشاغل سے علیحدہ اور اپنے گرد و پیش کے حالات سے بالکل مختلف اور متمایز تھے ۔" آپ کے کلام کا پہلا مجموعہ "نغمۂ دل" ۱۹۳۲ء میں اور دوسرا مجموعہ "ترانۂ دل" ۱۹۵۵ء میں سرفراز پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ۔ ۱۹۳۶ء میں ماسٹر جگت سنگھ نے اپنے رسالے "رہنمائے تعلیم" لاہور کا نہایت شاندار "دل نمبر" شائع کیا تھا جس میں مشاہیر ادب نے حضرتِ دل کے کمالات کا کھلے دل سے اعتراف کیا تھا ۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی رائے تھی کہ :

"میں کلامِ دل کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں ۔ یو ۔ پی میں اصغر گونڈوی اور دل شاہجہانپوری کا دم غنیمت ہے ۔"[1]

افسوس کہ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۹ء (۱۳۷۹ھ) کو ہفتہ کے روز حضرت دل کا انتقال ہوگیا ۔ ان کے شاگرد کسریٰ منہاس نے تاریخ وفات کہی :

۱۔ ترانۂ دل ، ص ۳ ۔

۳۹

تمکین کاظمی

(۱۹۶۱ع)

سیّد مصباح الدین تمکین کاظمی مرحوم ، حضرتِ داغ کے حیدر آبادی شاگرد ابوالمعنی سیّد منتجب الدین تجلی (۱۸۸۳ع — ۱۹۲۷ع) کے نورِ نظر تھے ۔ آپ ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ع میں حیدرآباد دکن میں تولّد ہوئے ۔ مدرسے کی تعلیم کے علاوہ عربی ، فارسی اور حدیث و تفسیر کا علم بھی حاصل کیا ۔ ۱۹۲۸ع میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد صوبہ داری گلبرگہ میں ملازم ہوگئے اور مختلف دیوانی ، مالی اور ملکی دفتروں میں کام کرتے رہے ۔[1] شاعری میراث میں پائی تھی ۔ نمونۂ کلام یہ ہے :

یا تُو نظر سے کہہ دے ، یا میں زباں سے کہہ دوں
یہ رازِ عشق ورنہ کس طرح فاش ہوگا

۱۔ سخنورانِ دکن ، از سید تسکین عابدی ، حیدر آباد دکن (۱۹۳۸ع) ، صفحات ۱۳۶ - ۱۳۸ ۔

تیوری چڑھی ، بل کھائی کمر ، کھل گئے گیسو
و اللہ کس انداز سے تلوار نکالی

جو درد سے واقف ہیں ، درماں کے جو طالب ہیں
وہ لاکھ چھپیں لیکن زنہار نہیں چھپتے

دل وہ دے اللہ جو پُر غم رہے
آنکھ وہ دے جو ہمیشہ نم رہے
گر ہوس ہو تو فنا کی ہو ہوس
غم رہے تو زندگی کا غم رہے

حباب بھوٹ کے ، کُملا کے پھول کہتے ہیں
ہر ایک چیز یہاں آئی ہے فنا کے لیے

شعر و شاعری کے سلسلے میں علامہ اقبال سے مراسلت بھی کی تھی اور مثنوی ''اسرارِ خودی'' کا منظوم اردو ترجمہ کرنے کی اجازت بھی چاہی تھی ۔ لیکن اقبال نے انہیں لکھا :

''جنابِ من !

تسلیم ۔ نوازش نامہ ابھی ملا ہے ۔ میں ذاتی طور پر ترجموں کا قائل نہیں ہوں ۔ تاہم آپ چند اشعار ترجمہ کر کے بھیجیے تو میں رائے دینے کے قابل ہو سکوں گا ۔ اس سے پہلے جو نمونے تراجم کے وصول ہوئے ، بہت ناقص تھے ۔ میں نے خود ''اسرارِ خودی'' پہلے اردو میں لکھنی شروع

کی تھی مگر مطالب ادا کرنے سے قاصر رہا۔ جو حصہ لکھا گیا تھا اس کو تلف کر دیا گیا۔ کئی سال بعد پھر یہی کوشش میں نے کی۔ قریباً ڈیڑھ سو اشعار لکھے مگر میں ان سے مطمئن نہیں ہوں۔[1]

محمد اقبال ، لاہور

۱۶ اگست ۲۸ء"

سیّد تمکین کاظمی صاحب نے ترجمے کا نمونہ بھیجا جسے دیکھ کر اقبال نے انھیں ترکِ شعر کا مشورہ دیا:

"جنابِ من!

تسلیم۔ میں نے آپ کا ترجمہ دیکھا ہے۔ افسوس کہ ناقص اور بعض بعض جگہ غلط ہے۔ میری رائے میں اس ترجمے سے اردو لٹریچر کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ محض لفظی ترجمہ ادبی اعتبار سے بے سود بلکہ مضر ہے۔ میری دوستانہ رائے یہ ہے کہ آپ اپنے اوقات کے لیے کوئی بہتر مصرف تلاش کریں۔ امید ہے کہ اس بے لاگ رائے سے آپ ناخوش نہ ہوں گے۔[2]

محمد اقبال ، لاہور

۴ ستمبر ۲۸ء"

۱- انوار اقبال ، مرتبہ بشیر احمد ڈار ، ص ۱۵۶ -
۲- ایضاً۔

اس مشورے کو سیّد صاحب نے قبول کر کے نثر کی طرف توجہ کی اور حضرتِ علامہ سے ''زبورِ عجم'' پر ایک تنقیدی مضمون لکھنے کی اجازت چاہی - آپ نے جواب میں لکھا :

''جنابِ من !

تسلیم ! نوازش نامہ مل گیا ہے - ''زبورِ عجم'' پر شوق سے مضمون لکھیے ، میری طرف سے اجازت ہے - فی الحال علالت کی وجہ سے بہت کم لکھتا پڑھتا ہوں - دردِ گردہ نے دو ماہ تک بے قرار کیا - اب خدا کے فضل سے اچھا ہوں اور صحت کے خیال سے چند روز کے لیے شملہ میں مقیم ہوں - لاہور جاتے ہی فرصت کے اوقات الٰہیاتِ اسلامیہ پر لکچر لکھنے میں صرف ہوں گے ، جن کا وعدہ میں مسلم ایسوسی ایشن مدراس سے کر چکا ہوں - اگر فروری ۲۹ع تک یہ لکچر لکھ سکا تو مدراس میں پڑھے جائیں گے - امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے -[1]

محمد اقبال ، شملہ

۱۸ ستمبر ۲۸ع''

اس کے بعد تمکین کاظمی صاحب نے چند کتابیں تصنیف و تالیف کیں ، جن میں ''داغ'' بہت مشہور ہے - وہ مزاح نگار کی حیثیت سے بھی سامنے آئے - ''غنچۂ تبسّم'' ان کے چند مزاحیہ مضامین کا

۱- انوارِ اقبال ، مرتبہ بشیر احمد ڈار ، ص ۱۵۷ -

مجموعہ ہے - ان کی تصانیف میں سے ''تذکرۂ ریختی''، ''ارنسٹ'' اور ''معاشقۂ نپولین'' بھی شائع ہو چکی ہیں - انھوں نے اعظم الامراء ارسطو جاہ کی سوانح عمری بھی مرتب کی تھی - ان کا انتقال ۱۹۶۱ء میں ہوا -

☆ ☆ ☆

۴۰

شوکت تھانوی

(۱۹۶۳ع)

شوکت تھانوی کا شمار عام طور پر اردو کے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے ، مگر ان کی ادبی زندگی کا آغاز غزل گوئی سے ہوا ۔ انھوں نے علی برادران کی شہرت سے متاثر ہوکر شوکت تخلص اختیار کیا اور مولانا عبدالباری آسی سے مشورۂ سخن لے کر شاعری میں نام پیدا کرنا چاہا مگر وہ آپ کی مزاح نگاری کے نیچے ہمیشہ دبی دبی رہی ۔

شوکت کے بزرگوں کا وطن تھانہ بھون ضلع مظفر نگر تھا مگر وہ ۲ فروری ۱۹۰۴ع کو بندرا بن ضلع متھرا میں پیدا ہوئے ، جہاں ان کے والد منشی صدیق احمد شہر کے کوتوال تھے ۔ عقیقہ کے روز محمد عمر نام رکھا گیا ۔ تاریخی نام تسخیر احمد نکلا مگر شہرت شوکت تھانوی کے نام ہی سے ہوئی ۔ ابتدائی تعلیم بھوپال کے الگزنڈرا ہائی سکول میں پائی ۔ ۱۹۱۴ع میں جب آپ کے والد پولیس کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر بھوپال سے لکھنؤ آ گئے تو آپ کو مدرسۂ فرقانیہ میں بھیج دیا گیا جہاں قرآن مجید کی تعلیم دی جاتی تھی ۔ انگریزی کی

ایک آدھ کتاب ماسٹر چھوٹے لال سے اور فارسی کی کتب مولوی عبدالرحیم کلیم سے گھر پر پڑھیں - پھر چرچ مشن ہائی سکول سے چھٹا درجہ پاس کر کے گورنمنٹ ہائی سکول حسین آباد میں داخل ہوئے - کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک پاس کرنے کے بعد علی گڑھ کالج چلے گئے مگر ابھی ایک سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ان کے والدِ محترم کا انتقال ہوگیا اور انہیں تعلیم ادھوری چھوڑ کر فکرِ معاش میں مصروف ہو جانا پڑا -

پہلے پہل لکھنؤ کے رونامہ ''ہمدم'' میں ملازمت اختیار کر کے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور سیّد جالب دہلوی کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اس میں مہارت حاصل کی - امین سلونوی اور نسیم انہونوی سے مل کر ایک مزاحیہ ہفت روزہ اخبار ''سرپنچ'' جاری کیا - پھر منشی نولکشور کے ''اخبار اودھ'' کی ادارت سنبھالی اور اس وقت چھوڑی جب نولکشور اسٹیٹ کورٹ آف وارڈس میں چلی گئی -

۱۹۳۰ء میں رسالہ ''نیرنگ خیال'' لاہور کے سالنامے میں ایک مزاحیہ مضمون ''سودیشی ریل'' لکھا ، جو اتنا مقبول ہوا کہ سارے ہندوستان میں شوکت تھانوی کی مزاح نگاری کی دھوم مچ گئی - کچھ عرصہ روزنامہ ''ہند'' کی ادارت کی - خود بھی ایک روزنامہ ''طوفان'' کے نام سے جاری کیا مگر چل نہ سکا -

تقسیمِ ملک کے بعد پاکستان چلے آئے اور ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے - پھر روزنامہ ''جنگ'' میں چلے گئے اور مرتے دم

تک اسی سے وابستہ رہے - ہر جگہ اپنی خداداد صلاحیتوں کے جوہر دکھائے - ۴ مئی ۱۹۶۳ء کو ذی الحجہ کے متبرک عشرۂ اول میں عین حج کے دن سفرِ آخرت اختیار کیا اور لاہور کے قبرستان میاں میر میں دفن ہوئے -

شوکت تھانوی بے شمار کتابوں کے مصنّف تھے - مزاحیہ مضمونوں اور ناولوں کے علاوہ ''گہرستان'' کے نام سے انہوں نے ایک شعری مجموعہ بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے - بقول نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی :

''ذہین شخص جو کام کرتا ہے ، اس میں دل کشی کے ساتھ آپج اور انوکھا پن ہوتا ہے - شوکت کا دیوان ان صفات سے مالامال ہے - ان کی طبیعت کا نمایاں رنگ شوخی و ظرافت ہے - تاہم غزل کہتے وقت ان کا ہر خیال مجسمۂ متانت و سنجیدگی ہوتا ہے - شوکت نے اپنے ذوقِ سلیم کی راہبری میں سمجھ لیا ہے کہ تغزّل کسے کہتے ہیں ، اس کا معیار کیسا ہونا چاہیے اور اس میں دل آویزی کیونکر پیدا کی جا سکتی ہے ؟ ان کے تخیّل اور اسلوبِ ادا دونوں میں تازگی و ندرت پائی جاتی ہے -''[1]

شوکت کے نزدیک محبوب کو دیدار کے لیے آکسانا بھی ہوس ہے - اس سے انسان محویتِ خیال کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے :

۱- نقوش ، لاہور ، شوکت نمبر ، ص ۳۳ -

ہوس جس کو سکھا دے طالبِ دیدار ہو جانا
اسے کیا آئے گا محوِ خیالِ یار ہو جانا

وہ سامنے کی بات بھی اس طرح کہتے تھے کہ گہرائی اور بانکپن پیدا ہو جاتا تھا :

وہ کس خطا پہ ہوئے دشمنی کو آمادہ
انھیں تو میں نے کبھی دوست بھی نہ جانا تھا

دوسرے مصرع میں انوکھے انداز سے معشوق کو جلی کٹی سنا کر شوخیوں میں بجلیاں بھر دی ہیں ۔ ذیل کے اشعار میں بالکل مومن کا سا رنگ ہے :

جان دے دیں گے ہم اے ہمّتِ دشوار پسند
مرضِ عشق اگر قابلِ درماں نکلا
موت برحق تھی مگر کاش نہ آتی شبِ غم
یہ تو کہنے کو نہ ہوتا کہ اک ارماں نکلا

شوکت مسلمانوں کے حال پر کڑھتے ، ان کے عروج و زوال کی تاریخ پر نظر ڈال کر طبائع کو غور و فکر کی دعوت دیتے اور حقیقی نفع و نقصان سمجھنے پر آمادہ کرتے ۔ وہ کہتے ہیں کہ روحانیت چھوڑ کر مادیّت کی طرف بڑھنا آزادی نہیں ۔ غلامی خود اختیار کی جائے یا زبردستی مسلّط ہو جائے ، بہرحال غلامی ہے :

یہ سچ ہے ایک حالت پر کبھی دنیا نہیں رہتی
قفس کو آج میں ترجیح دیتا ہوں گلستاں پر

محبّت ہو گئی ہے چار دیوارِ عناصر سے
اسیرِ آب و گِل عاشق ہوئے ہیں اپنے زنداں پر

اثر لکھنوی نے بالکل درست فرمایا ہے :

''غزل اسی کا نام ہے اور مجھے بے حد مسرّت ہے کہ باوصف نوجوان ہونے کے شرکت نے وہ غلط راستہ اختیار نہیں کیا ، جس کو بعض حضرات ''رقصِ الفاظ'' اور ''رندی و مستی'' سے تعبیر کرتے ہیں مگر اہلِ نظر محض اس کو ڈھکوسلا سمجھتے ہیں ۔''[1]

شوکت کے یہ اشعار یقیناً کئی طویل نظموں پر بھاری ہیں :

سچ ہے ان کو مجھ سے کیا اور میرے افسانے سے کیا
کر دیا دیوانہ ، تو اب کام دیوانے سے کیا
جس طرح گزری ہے اب تک اب بھی گزرے گی یونہی
ہم نہیں بدلے تو دنیا کے بدل جانے سے کیا

علامہ اقبال نے ''گہرستان'' ملاحظہ فرما کر ۲۴ ۔ اگست ۱۹۳۴ع کو شوکت تھانوی کے کلام کی نسبت مندرجہ ذیل رائے ظاہر کی :

''جنابِ من !

آپ کے مجموعۂ اشعار کے چند مقام میں نے دیکھے ہیں ۔

۱۔ نقوش ، لاہور ، شوکت نمبر ، ص:۳۴ ۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ آپ کے اسلوبِ بیان میں جدت ہے اور بعض جگہ بہت خوب کہا ہے -

زیادہ لکھنے سے قاصر ہوں کہ کئی ماہ سے علیل ہوں -

والسلام !

محمد اقبال

۲۴ اگست ۱۹۳۴ع"[۱]

☆ ☆ ☆

۱- انوار اقبال ، مرتبہ بشیر احمد ڈار ، ص ۲۴۶ -

۲۱

شیخ غلام مصطفیٰ حیرت

(۱۹۶۷ء)

۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے کہ لاہور میں تحریکِ کشمیر بڑے زوروں پر تھی۔ ڈوگرا مہاراجہ ہری سنگھ نے کشمیر کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ ہندو اقلیت پر مسلم اکثریت قربان کی جا رہی تھی۔ سارے ہندوستان کے مسلمان ان مظالم کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے۔ جلسے ہوتے تھے، احتجاجی جلوس نکلتے تھے اور ان مظاہروں کے ذریعے کشمیر کے بے زبان مظلوم انسانوں کے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کیا جاتا تھا۔

لاہور میں اس قسم کے جلسے موچی دروازے کے باہر میونسپل باغ میں ہوتے تھے، جن میں میاں نظام الدین، حاجی رحیم بخش اور سیّد محسن شاہ جیسے کشمیری اکابر کے علاوہ پروفیسر محمد علم الدین سالک سرگرم حصہ لیتے تھے۔ وہی ان مجالس کی روح و رواں (کنوینر) تھے اور جو قراردادیں یہاں منظور ہوتی تھیں، ان کی اطلاع تاروں کے ذریعے وائسرائے ہند، ریاستوں کے پولیٹیکل ایجنٹ، مہاراجہ کشمیر،

ریذیڈنٹ کشمیر اور دیگر متعلقہ حکام کو بھجواتے تھے۔

اسی تحریک سے متاثر ہو کر ہندوستان کے مقتدر سیاسی، مذہبی اور قانون داں رہنماؤں نے شملہ میں جمع ہو کر آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کی، جس کے پہلے صدر مرزا بشیرالدین محمود امیر جماعت احمدیہ اور آخری صدر علامہ ڈاکٹر محمد اقبال چنے گئے۔ یہ کمیٹی کشمیریوں کی آئینی خدمت کرتی تھی۔ اس نے بے شمار کشمیریوں کو، جو ریاست کے ستم کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے، جیلوں سے رہا کرایا اور قومی کارکنوں کی قانونی اور مالی مدد کی۔

بعد میں یہ تحریک مجلسِ احرار نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس کا مرکز لاہور میں دہلی دروازے کا باغ بن گیا۔ مجلسِ احرار ایک فعال جماعت تھی۔ اس کے شعلہ زبان اور آتش بیان مقرروں نے سارے ہندوستان میں آگ لگا دی اور چاروں طرف "کشمیر چلو، کشمیر چلو" کا نعرہ گونجنے لگا۔

اس زمانے میں ہر مسئلے کو فرقہ واریت کی عینک سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ کشمیر میں جمہوری طرز کی حکومت کے مطالبے کو بھی اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھا گیا اور ہندوؤں نے یہ محسوس کیا کہ مسلمان کشمیر کے مہاراجہ کے خلاف صرف اس واسطے تحریک چلا رہے ہیں کہ وہ ہندو ہے۔ اور اگر وہاں جمہوریت قائم ہو گئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلم اکثریت کا خطّہ عالمِ وجود میں آ جائے گا اور کشمیر میں مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہو جائے گا۔ اس بنا پر انھوں نے اس کی مخالفت شروع کردی اور اس مخالفت کا رخ حیدر آباد کی طرف موڑ کر "دکن چلو، دکن چلو" کا نعرہ بلند

کر دیا کیونکہ دکن کا حکمران مسلمان تھا ۔

۲۰ ۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو مجلسِ احرار کے زیرِ اہتمام کشمیر کی تحریک کے سلسلے میں لاہور کے مسلمانوں نے ایک عظیم الشان جلوس نکالا ۔ یہ جلوس بالکل پُرامن تھا مگر اس کو دیکھ کر ہندوؤں نے بھی جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا ۔ چنانچہ ۲۶ دسمبر کو ہندوؤں نے جلوس نکالا ۔ مچھی ہٹہ (شاہ عالمی دروازہ) کا بیلی رام تیل والا اس کا کرتا دھرتا تھا ۔ وہ بڑا متعصّب اور فرقہ پرست ہندو تھا ۔ یہ جلوس اشتعال انگیز نعرے لگاتا ہوا سرکلر روڈ سے گزر کر موچی دروازے کی طرف بڑھا اور پولیس کی چشم پوشی اور ڈھیل دینے کی وجہ سے موچی دروازے کے اندر گھس کر اونچی مسجد اور مسجد مُلاّ محمد صالح کنبوہ[1] کے نیچے کے چند مسلمان دکان داروں کو بے خبری میں پیٹنا شروع کردیا ۔

اس سے مسلمانوں میں بے حد برہمی پھیلی کیونکہ زیادتی سراسر ہندوؤں کی تھی ۔ جب مسلمان اکٹھا ہونا شروع ہوئے تو مسٹر سلیٹری ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کے حکم سے پولیس کی بھاری جمعیّت نے مسلمانوں کو بڑی سختی سے منتشر کر دیا ۔ یہ وہی مسٹر سلیٹری ہیں جو بعد میں پبلک سروس کمیشن پنجاب کے رکن نامزد ہوئے ۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر سیّد عبدالقادر مرحوم اور مولانا علم الدین سالک مرحوم نے مسٹر سلیٹری سے زبردست احتجاج کیا کہ آپ ظالموں کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں اور مظلوموں کو

۱۔ شاہجہانی دور کا مشہور مؤرخ جس نے کتاب 'عمل صالح' لکھی تھی ۔

دباتے ہیں ۔ بات بڑھ گئی اور تلخ کلامی تک نوبت جا پہنچی مگر جلوس آگے بڑھ گیا اور مسٹر سلیٹری کو بھی اس کے ساتھ جانا پڑا ۔

یہاں سے جب یہ جلوس انارکلی بازار میں پہنچا تو چند ہندو سر پھرے نوجوانوں نے ایک مسلمان نور محمد پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا ۔ یہ نور محمد چوک وزیر خاں کے قریب کوچہ ککے زئیاں کا رہنے والا تھا ۔ یہ خبر آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی اور ہندو مسلم فساد کا بگل ثابت ہوئی ۔ اسی وقت شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی ۔ جلوس زبردستی منتشر کر دیا گیا اور نعش پوسٹ مارٹم کے لیے پولیس میو ہسپتال لے گئی ۔

دوسرے دن پولیس نے نعش مقتول کے وارثوں کو ان کے قبرستان واقع گھوڑے شاہ میں حوالے کی ، جہاں دفعہ ۱۴۴ کے باوجود ہزاروں مسلمان نماز جنازہ میں شریک ہوئے ۔ ڈپٹی کمشنر لاہور پولیس کی زبردست نفری کے ساتھ وہاں موجود تھا ۔ اس نے میاں عبدالعزیز بار ایٹ لا سابق ایم ۔ ایل ۔ اے اور اوّلین میئر لاہور کارپوریشن سے درخواست کی کہ وہ ہجوم سے منتشر ہو جانے کی اپیل کریں لیکن اس وقت نقّارخانے میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا ۔ چنانچہ ہجوم غم و غصّے سے بھرا ، جلوس ہی کی صورت میں واپس آیا اور شہر میں فساد اور خون ریزی کی وارداتیں ہونے لگیں ۔ ہندوؤں کو موقع ملتا تو وہ مسلمانوں پر حملہ کر دیتے اور مسلمانوں کا داؤ چلتا تو وہ ہندوؤں کو چھرا گھونپ دیتے ۔

۲۷ - دسمبر ۱۹۳۱ء کو تین ساڑھے تین بجے کے قریب رنگ محل کے چوک میں گوٹہ کناری بیچنے والے ایک ہندو دکاندار لال چند کو

کسی نے راہ چلتے چھرا گھونپ کر زخمی کر دیا ۔ واردات کرنے والا بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور اردگرد کے بہت سے ہندو دکاندار وہاں جمع ہو گئے ۔ پولیس بھی موقع پر پہنچ گئی ۔ زخمی لال چند کو فی الفور وچھو والی کے گنگا رام ہسپتال میں پہنچایا گیا ، جہاں ایک مجسٹریٹ کہر سنگھ[1] کے روبرو اس کا آخری بیان قلم بند ہوا ۔ اس بیان میں اس سے کہلوایا گیا کہ مجھے غلام مصطفیٰ نے مارا ہے جو رنگ محل کے قریب دکان کرتا تھا ۔ یہ بیان دینے کے بعد وہ زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا اور پولیس اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے میو ہسپتال لے گئی ۔

غلام مصطفیٰ کا نام مقتول کے منہ میں ہندو راہنماؤں نے ڈالا تھا ورنہ قرائن و شواہد کی رُو سے اس بات کا کوئی ثبوت نہ تھا ۔ دراصل یہ اس وقت کی سیاسی اور سماجی فضا کا رد عمل تھا ۔ رنگ محل کے چوک میں مولوی فضل الٰہی مرحوم کی مسجد کے نیچے چند چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں ۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا کہ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۵ء کے درمیان ایک دکان میں شیخ غلام مصطفیٰ سٹیشنری اور کتابوں کا کاروبار کیا کرتا تھا ۔ اس کی ذات بڑی ہی من موہنی تھی ۔ اس کی دکان ہر وقت سیاسی کارکنوں اور لکھنے پڑھنے والوں کا اچھا خاصا مرکز بنی رہتی تھی ۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر ، ماسٹر محمد بخش مسلم ، ملک لال دین قیصر ، ڈاکٹر نذیر احمد (ریٹائرڈ پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور) ، کرنل مجید ملک ، ابوالاثر

1- Kehar Singh, Magistrate Ist Class, Lahore.

حفیظ جالندھری ، غلام عباس (مشہور افسانہ نگار) ، پروفیسر محمد علم الدین سالک مرحوم ، استاد عشق لہر (مشہور پنجابی شاعر) ، پروفیسر جمیل واسطی اور فیروز الدین نظامی بھی اکثر یہاں آتے اور گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے ۔ علم دین شہید کا بھی یہاں آنا جانا تھا ۔ وہ چوہٹہ مفتی باقر میں رہتا تھا ۔ ۱۹۳۰ع تک مجلس احرار کا سرگرم کارکن رہا ۔ جب جیوش احرار کی تنظیم ہوئی تو اس میں عملی حصہ بھی لیا ۔[1]

شیخ غلام مصطفٰی خود پنجابی زبان کا شاعر تھا اور حیرت تخلص کرتا تھا ۔ اردو کا ماہانہ رسالہ ''فردوس'' اور ہفتہ وار مزاحیہ اخبار ''آکا باکا'' بھی نکالا کرتا تھا ۔ ''فردوس'' کی ادارت کچھ عرصہ بدر الدین بدر نے ، پھر چند ماہ سراج الدین نظامی نے اور زیادہ عرصہ راقم الحروف نے کی ۔ پنجاب کے تمام معروف ادیب ، شاعر اور افسانہ نگار اس میں لکھتے تھے ۔ علامہ اقبال اور مولانا گرامی بھی اپنے تازہ کلام سے اس کو زینت دیتے تھے اور یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو اس چھوٹے سے رسالے کو حاصل تھا ۔ چنانچہ ''فردوس'' کے دسمبر ۱۹۲۸ع کے خاص نمبر کے لیے حضرت علامہ نے یہ چند غیرفانی شعر ''پیغام سروش'' کے عنوان سے اشاعت کے لیے عنایت فرمائے تھے :

تمدّن ، تصوّف ، شریعت ، کلام
بتان عجم کے پجاری تمام

۱۔ یادوں کے مزار ، از عبداللہ ملک ، مطبوعہ 'لیل و نہار' لاہور ، ۱۰ جنوری ۱۹۶۰ع ۔

طلسمِ معانی ، بیانِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
حقیقت روایات میں کھو گئی
یہ اُمّت خرافات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ ، اندھیر ہے
مسلماں نہیں ، راکھ کا ڈھیر ہے

اسی زمانے میں شیخ غلام مصطفیٰ حیرت اور ملک لال دین قیصر نے چھپّن فی صد حقوق تحریک ، نماز کمیٹی ، ورزش کمیٹی ، علم دین شہید کی لاش کی بازیابی ، ساردا ایکٹ اور ظفر وال میں بندشِ اذان کے خلاف تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا تھا ۔ ہندو ان سے سخت بیزار تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح ان کو مصیبت میں مبتلا کر دیں ۔ اب انھیں ایک موقع ہاتھ آ گیا تھا اور انھوں نے اس سے فائدہ اُٹھا لیا ۔

مقتول لال چند نے غلام مصطفیٰ کا اور استغاثے کے گواہوں نے لال دین اور علم دین کے نام تو لے دیے مگر پولیس کو یہ کیسے معلوم ہوتا کہ لال دین سے مراد ملک لال دین قیصر ہے ۔ انھوں نے شیخ غلام مصطفیٰ حیرت کو ، جو رنگ محل کے قریب ہی کوچہ چابک سواراں میں رہتا تھا اور اس سارے علاقے میں مشہور تھا ، نیز وہاں دکان بھی کر چکا تھا اور اُس وقت میونسپل کمیٹی میں داروغۂ صفائی تھا ، پکڑ لیا اور لال دین قیصر کی جگہ ایک اور لال دین کو ، جو پیشے کے لحاظ سے معمار تھا ، گرفتار کر لیا ۔ چنانچہ شیخ غلام مصطفیٰ کے خلاف زیر دفعہ ۳۰۲ اور لال دین

کے خلاف زیر دفعات ۳۲۳ اور ۵۰۴ تعزیراتِ ہند مقدمات قائم کیے گئے -

سرسری ابتدائی کارروائی کے بعد مقدمہ سیشن سپرد ہوا تو شیخ غلام مصطفٰی حیرت کی بریت ثابت کرنے کے لیے شہر کے اکثر مقتدر مسلمانوں کو عدالت میں حاضر ہونا پڑا - کُل چھیالیس گواہ طلب کیے گئے جن میں چند قابلِ ذکر نام یہ ہیں :

۱- حاجی میر شمس الدین مرحوم ، جو شمالی ہندوستان کی سب سے بڑی تعلیمی انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سیکریٹری اور اس کے بانیوں میں سے تھے -

۲- مولانا شوکت علی -

۳- نواب سر ذوالفقار علی خاں ، جو سنٹرل اسمبلی کے رکن تھے -

۴- علامہ سر محمد اقبال -

۵- مولانا ظفر علی خاں ، مالک و مدیر اخبار ''زمیندار'' -

۶- میاں عبدالعزیز بار ایٹ لاء ، جو اُس زمانے میں لاہور میونسپل کمیٹی کے صدر تھے اور پھر لاہور کارپوریشن کے پہلے میئر بنے -

۷- شیخ صادق حسن ، ایم - ایل - اے ، امرتسر -

۸- مسٹر مجید ملک ، ایڈیٹر ''مسلم آؤٹ لک'' و ''سن رائز'' لاہور -

۹- مولانا غلام رسول مہر } مدیرانِ روزنامہ ''انقلاب''
۱۰- مولانا عبدالمجید سالک } لاہور -

۱۱- سید حبیب شاہ ، ایڈیٹر روزنامہ ''سیاست'' لاہور -
۱۲- مولانا محمد یعقوب خاں ، ایڈیٹر ''لائٹ'' لاہور -
۱۳- مولانا دوست محمد ، ایڈیٹر ہفتہ وار ''پیغامِ صلح'' لاہور-
۱۴- شمس الدین حسن ، ایڈیٹر ''خاور'' لاہور -
۱۵- حکیم محمد یوسف حسن ، مدیر ''نیرنگِ خیال'' و ''تازیانہ'' لاہور -
۱۶- قاضی عبدالمجید قرشی ، مدیر ایمان پٹی -
۱۷- چودھری عبدالکریم ، میونسپل کمشنر و آنریری مجسٹریٹ لاہور -
۱۸- چودھری سردار علی ، میونسپل کمشنر و آنریری مجسٹریٹ لاہور -
۱۹- خان صاحب چودھری فتح شیر ، میونسپل کمشنر و آنریری مجسٹریٹ لاہور -
۲۰- شیخ حسن الدین ، وکیل و میونسپل کمشنر لاہور -
۲۱- چودھری دین محمد ، میونسپل کمشنر لاہور -
۲۲- شیخ عظیم اللہ ، وکیل و میونسپل کمشنر لاہور -
۲۳- خواجہ دل محمد ، پروفیسر اسلامیہ کالج و میونسپل کمشنر لاہور -
۲۴- سید عبدالقادر ، پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور -
۲۵- مولانا محمد علم الدین سالک ، پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور-
۲۶- محمد دین تاثیر ، پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور -
۲۷- ماسٹر محمد بخش مسلم -

۲۸- خلیفہ شہاب الدین ، سیکریٹری انجمن خدام الدین لاہور۔

۲۹- حکیم محمد شریف ، سیکریٹری انجمن معین الاسلام لاہور۔

باقی لوگ بھی اسی طرح کے اکابر اور محلے کے معززین تھے۔
سماعت کے دوران میں ایک عجیب اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ صفائی کی طرف سے ملک نبی بخش ایک سن رسیدہ بزرگ موقعے کا گواہ تھا۔ لال چند زخمی ہونے کے بعد سب سے پہلے اسی کے پاس پناہ لینے کے لیے پہنچا تھا۔ اس کے بتائے ہوئے وقت اور استغاثے کے بیان کردہ وقت میں شدید اختلاف تھا۔ استغاثہ اسے ضعیف اور سٹھیایا ہوا ثابت کرنا چاہتا تھا اور جرح میں اس پر اُلٹے سیدھے سوال کرتا تھا، مگر وہ صحیح جواب دیتا رہا اور اپنے موقف سے ذرا نہ ڈگمگایا۔ جرح کا کوئی حیلہ کارگر نہ ہوا اور اس کے قدم نہ اکھیڑ سکا۔

اس پر عدالت کی طرف سے پوچھا گیا کہ جب تم اتنے اعتماد اور تیقّن کے ساتھ کہتے ہو تو کیا تمھارے پاس گھڑی تھی؟

گواہ نے جواب دیا: ”میں گھڑی دیکھنا نہیں جانتا۔ میں نے عمر بھر گھڑی رکھی ہی نہیں۔“

عدالت نے پھر پوچھا ”تو تم نے وقت کا اندازہ کیسے لگایا؟“

گواہ نے کہا ”میں سورج، چاند اور ستاروں کی مدد سے وقت کا اندازہ لگایا کرتا ہوں۔“

سیشن جج نے امتحان لینے کی غرض سے دریافت کیا ”بھلا بتاؤ اس وقت کیا بجا ہے؟“

گواہ نے فی الفور جواب دیا کہ اب یہ وقت ہے۔ گھڑی گواہ کی پشت پر تھی۔ دیکھا گیا تو وقت بالکل ٹھیک تھا۔ اس واقعے

نے عدالت کو بہت متاثر کیا اور اسے یقین ہو گیا کہ گواہ جو بیان دے رہا ہے ، بالکل صحیح ہے ۔

مقدمے کی سماعت کئی دن جاری رہی ۔ شیخ غلام مصطفٰی حیرت کی طرف سے خواجہ فیروز الدین بیرسٹر ایٹ لاء پیروی کر رہے تھے جو علامہ اقبال کے ہم زلف تھے ۔ یہ بڑا معرکے کا مقدمہ تھا ۔ مسٹر جے ۔ کے ۔ ایم ۔ ٹیپ (Mr. J. K. M. Tapp) آئی ۔ سی ۔ ایس سیشن جج تھے ۔ یہ وہی مسٹر ٹیپ ہیں جو کچھ عرصہ لاہور میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری رہ چکے تھے اور بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے قائم مقام جج مقرر ہوئے تھے ۔ سیشن جج کی عدالت آن دنوں مسجد شاہ چراغ میں ہوتی تھی جو ابھی تک مسلمانوں کو واگذار نہیں ہوئی تھی ۔

سب سے قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس مقدمے کی کارروائی میں علامہ اقبال خود ذاتی طور پر دلچسپی لیتے تھے ۔ انھوں نے شیخ غلام مصطفٰی حیرت کو جیل میں تسلی آمیز خطوط لکھے ، اپنی طرف سے امداد کا یقین دلایا بلکہ ایک خط میں ''یا حیّی یا قیوم'' کا وظیفہ پڑھنے کی ہدایت بھی کی ۔ افسوس کہ خطوط کا یہ ذخیرہ شیخ غلام مصطفٰی کے مکان کو آگ لگ جانے سے ضائع ہو گیا ورنہ ان سے اقبال کی زندگی کا ایک نیا رخ سامنے آتا ۔

علامہ اقبال دو تین روز متواتر عدالت میں جاتے رہے اور خواجہ فیروز الدین بیرسٹر ایٹ لاء کو مفید مشورے بھی دیتے رہے ۔ ۲ ۔ اگست ۱۹۳۳ء کو انھوں نے سیشن جج کے روبرو مندرجہ ذیل شہادت دی :

''میں ملزم غلام مصطفٰی کو چند برسوں سے جانتا ہوں ۔

میری اس سے واقفیت ایک ادبی رسالے کے مدیر کی حیثیت سے ہوئی ، جس کا نام ''فردوس'' تھا ۔ اس کے بعد وہ ایک ہفتہ وار اخبار کا ایڈیٹر ہوا ۔ میں اسے مسلمانوں کی عام پبلک تحریکوں کے تعلق سے بھی جانتا ہوں ۔ غلام مصطفیٰ میری موجودگی میں سیاسی اور سماجی اجتماعات میں تقریریں کرتا رہا ہے ۔ میں اسے چھپّن فیصد حقوق کی تحریک کے سلسلے میں بھی جانتا ہوں ۔ یہ تحریک لاہور کے مسلمانوں نے چلائی تھی[1] اور غلام مصطفیٰ نے ان جلسوں میں بھی حصہ لیا تھا جو میکیگن انجینئرنگ کالج کے متعلق ہوتے تھے ۔[2] غلام مصطفیٰ نے علم دین شہید کی لاش دفن کرنے کے سلسلے میں (۱۹۳۰ء میں) میری اور مرحوم سر محمد شفیع کی بھی بڑی مدد کی تھی ۔ غلام مصطفیٰ کو ایک مشہور قومی کارکن (رضا کار) سمجھنا چاہیے ۔''

جرح کے جواب میں علامہ اقبال نے مزید فرمایا :

''غلام مصطفیٰ نے ذاتی طور پر سیاسی معاملات میں میری مدد نہیں کی ۔ غلام مصطفیٰ دوسرے لوگوں کی طرح

۱- چھپن فی صد حقوق کی تحریک علامہ اقبال ہی کے اشارے سے چلی تھی ۔ اس کے لیے یہ نعرہ بھی اقبال ہی نے تجویز کیا تھا :
''تینوں جتھے کتھے وِتھ ملے توں اپنا پھانا ٹھوکی جا'' ۔

۲- میکیگن انجینئرنگ کالج کے پرنسپل اس زمانے میں مسٹر ویٹکر تھے ۔ ان کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ اچھا نہیں تھا ۔ مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ پرنسپل کو اس عہدے سے ہٹایا جائے ۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس (منعقدہ ۱۹۳۰ع) میں بھی
میرے ہمراہ الہ آباد گیا تھا ۔ اس اجلاس کی صدارت میں
نے کی تھی ۔''[۱]

اقبال کی اس شہادت کے بعد مزید کسی صفائی کی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی ۔ اقبال ہی کے سمجھانے پر خواجہ فیروز الدین بیرسٹر ایٹ لاء نے اپنی بحث میں اس بات پر زور دیا کہ مقتول کے اس بیان کی کہ ''غلام مصطفٰی رنگ محل میں دکان کرتا رہا ہے'' استغاثے کے کسی گواہ نے تائید نہیں کی ۔

انجام کار مقدمہ خارج کر دیا گیا ۔ دونوں ملزم بے گناہ ثابت ہوئے اور تقریباً آٹھ ماہ کی صعوبتوں کے بعد ۶ ۔ اگست ۱۹۳۲ع کو غلام مصطفٰی حیرت اور لال دین جیل سے رہا ہوئے ۔ لاہور کے مسلمانوں نے خوشی کے شادیانے بجائے ۔ مولانا ظفر علی خاں نے شیخ غلام مصطفٰی حیرت کی باعزت براءت ''پر زمیندار'' میں ایک زبردست مقالۂ افتتاحیہ لکھا اور اخبار کے پہلے صفحے پر ''فیصلۂ تقدیر'' کے عنوان سے ایک نظم بھی شائع کی جو اس واقعے کی یادگار سمجھ کر ذیل میں نقل کی جاتی ہے :

ٹل گیا انگریز کے دارالقضا کا فیصلہ
کیونکہ تھا کچھ اور ہی رب العلا کا فیصلہ
جو فنا کے گھاٹ اترنے کے لیے تیّار تھے
عرشِ اعظم پر ہوا ان کی بقا کا فیصلہ

۱۔ مقدمہ سیشن نمبر ۳۷ ، سال ۱۹۳۲ع ۔

بے گناہوں کو کیا جائے گا عزت سے بری
پہلے ہی دن ہو چکا تھا یہ خدا کا فیصلہ
مصطفیٰؐ کی عمر کی قرآن میں کھا کر قسم
خود کیا اس نے غلامِ مصطفیٰؐ کا فیصلہ
سال بھر تک جس نے کاٹی قید جرمِ عشق میں
ہو گیا آج اس گرفتارِ بلا کا فیصلہ
آ پڑی ہے اکثریت اور اقلیت کی بحث
ہونے والا ہے بھتیجے اور چچا کا فیصلہ
ہم دکھا دیں گے کہ کرتا ہے مسلماں کس طرح
اپنی امیدوں کے خونِ ناروا کا فیصلہ[1]

شیخ غلام مصطفیٰ حیرت اس واقعے کے بعد ۳۵ برس تک زندہ رہ کر اکتوبر ۱۹۶۷ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئے، مگر جب تک اقبال کا یہ بیان موجود ہے وہ زندہ رہیں گے۔

☆ ☆ ☆

۱- ماہنامہ فردوس، لاہور، نومبر ۱۹۳۲ء۔

۴۲

امین حزیں سیالکوٹی

(۱۹۶۸ء)

خواجہ محمد مسیح پال ، جو امین حزیں کے نام سے مشہور ہیں ، سیالکوٹ کے رہنے والے ایک متوسط گھرانے کے چشم و چراغ تھے ۔ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد مولوی احمد دین پال اپنے علم و فضل ، دیانت و امانت ، زہد و تقویٰ ، دین داری اور پاکبازی ، حلم و انکسار ، عبادت گزاری و خدمتِ خلق اور حق گوئی کے لیے نہایت ممتاز تھے ۔ امین حزیں اور ان کے چھوٹے بھائی خواجہ عبدالسمیع پال اثر صہبائی نے اسی مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی اور یہ اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ دونوں نے تنگی ترشی کے باوجود اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ادب و شعر کا نہایت پاکیزہ مذاق پایا ۔

آن ایّام میں غالب اور اقبال کی شاعری سارے پنجاب پر چھائی ہوئی تھی ۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح ان دونوں بھائیوں نے بھی اپنے بچپن میں اردو شاعری کا مطالعہ انھی دو بزرگ شاعروں کے کلام سے شروع کیا ۔ اثر صہبائی کے کلام کے تو کئی مجموعے شائع

ہوئے جن میں "جامِ صہبائی" ۱۹۲۸ء میں ، "خمستان" ۱۹۳۳ء میں ، "جامِ طہور" ۱۹۳۷ء میں اور "روحِ صہبائی" ۱۹۴۵ء میں منظرِ عام پر آئے اور پسند کیے گئے ۔ وفات سے قبل نعتوں کا ایک مجموعہ بھی شائع کر کے بارگاہِ رسالت میں اپنی عقیدت و محبت کا نذرانہ پیش کیا تھا ۔ لیکن امین حزیں حکومت کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہونے کے باعث شاعری کی طرف پورے انہاک سے توجہ نہ کر سکے ۔ ان کے فارسی کلام کا ایک مجموعہ "نوائے دل" کے نام سے ۱۹۲۴ء میں مرتب ہو گیا تھا ، جو مولانا گرامی کی نظر سے بھی گزرا تھا اور انھوں نے اس کی دلآویزی کی تعریف کی تھی ، مگر وہ چھپ نہ سکا ۔ البتہ اردو کلام کا پہلا مجموعہ "گلبانگِ حیات" کے نام سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا ۔ اس کا مقدمہ سر شیخ عبدالقادر مرحوم نے لکھا تھا ۔ شاعر کا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے علامہ اقبال سے ان کے نیازمندانہ روابط پر اس طرح روشنی ڈالی ہے :

> "اقبال کی شاعری کا جو گہرا اثر اس دور کے شاعروں پر ہوا ہے ، کلامِ امین اس اثر کی ایک نمایاں مثال ہے ۔ ہم‌وطنی کے علاوہ جو بات دونوں میں مشترک ہے ، وہ یہ ہے کہ دونوں نے اپنی عمر کی ابتدا میں ایک ہی استاد سے فیض پایا ہے ۔ دونوں شمس العلما مولوی سیّد میر حسن مرحوم کے شاگرد ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ آپ ۱۸۸۴ء[1] میں پیدا ہوئے۔

۱۔ تذکرۂ شعرائے پنجاب (از خواجہ عبدالرشید ، ص ۶۱) کے مطابق ۱۳ اوت ۱۸۸۳ء ۔

آپ نے سیالکوٹ کے مشن ہائی سکول میں اور بعد میں وہاں کے مشن کالج میں تعلیم پائی ۔ پہلے ڈاکٹر بننے کا ارادہ تھا مگر سائنس سے طبیعت کی مناسبت نہ پا کر ملازمت اختیار کی اور گلگت میں پولیٹیکل محکمے کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ وہیں سے ترقی کرتے کرتے خطاب 'خان بہادر' پایا ۔ زمانۂ ملازمت میں بھی علمی مشاغل کا شوق رہا اور اب سبکدوش ہو کر ادبِ اردو کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہیں ۔ آپ کا اردو کلام بہت سے رسائل میں طبع ہوتا رہتا ہے اور پسند کیا جاتا ہے ۔''

آگے چل کر شیخ صاحب فرماتے ہیں :

''امین حزیں کو اپنی موزونیٔ طبع کا احساس تو زمانۂ طالب علمی ہی میں ہو گیا تھا اور کبھی کبھی اردو غزل لکھتے تھے - ۱۹۰۲ء میں ان کی ایک غزل لکھنؤ کے ''پیامِ یار'' میں چھپی اور پسند کی گئی ۔ اس وقت ان کو خیال ہوا کہ اقبال کی شاگردی کریں ۔ ان سے ملے اور اپنے ارادے کا اظہار کیا ۔ انھوں نے کہا : ''شاعری خداداد چیز ہے ۔ اگر شعر گوئی کا جذبہ سچا ہے تو مشقِ سخن کیے جائیے اور اساتذہ کا کلام بغور پڑھیے تاکہ کان بحروں سے مانوس ہو جائیں اور زبان میں کوئی سقم باقی نہ رہے ۔'' اس دن سے امین صاحب اس مشورے پر عامل ہیں ۔ ابتدا میں مولوی ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی (جوہر) کے رنگ سے متاثر تھے ، لیکن بعد ازاں ان کی طبیعت پر اقبال

کا رنگ بالکل چھا گیا ۔''[1]

امین حزیں نے ۱۴ اگست ۱۹۶۸ع کو بروز سہ شنبہ انتقال کیا ۔ وہ ساری عمر اقبال کے رنگ میں شعر کہتے اور انھی کے پیغام کی تفسیر و تشریح کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رہے ۔ ''ان کے خیالات فکرِ اقبال سے اس درجہ متاثر ہیں کہ انھیں اقبال کا معنوی شاگرد کہنا غلط نہ ہوگا ۔''[2] مگر وہ اقبال کی بلندیوں کو نہ چھو سکے ۔ وہ اپنے کلام کو نکھارتے اور سنوارتے تو رہے مگر اس میں کوئی انفرادیت پیدا نہ ہوئی ۔ یہی بات ان کے تشخص میں روک ثابت ہوئی اور وہ کوئی خاص مقام یا اہمیت حاصل نہ کر سکے ۔ ویسے وہ پختہ کار شاعر تھے اور صاف ستھرے شعر کہتے تھے ۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں آپ کو ''زندگی کی تفسیر اور قوتِ عمل کی اہمیت ، یقینِ محکم کی توضیح اور چراغِ خودی کی تنویر نظر آئے گی ۔''[3] ان میں وہ صلاحیت بھی موجود تھی ، جو بالآخر منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی ہے ، مگر وہ اقبال کے چھتنار کے سائے میں دب کر رہ گئے اور ابھر نہ سکے ۔

اقبال نے ''خودی'' کی ترقی پر زور دیا ہے اور اسے سرمایۂ زندگی کہا ہے ۔ امین حزیں ایقان کو منتہائے زندگی سمجھتے ہیں ۔ وہ اقبال کی اصطلاح خودی کا مطلب عام فہم الفاظ میں واضح کرتے ہوئے

۱۔ مقدمہ ''گلبانگِ حیات'' ، مطبوعہ ، لاہور ۱۹۴۰ع ۔
۲۔ تذکرۂ جدید شعرائے اُردو (فیروز سنز) ، دوسرا حصہ ، ص ۴۸۹ ۔
۳۔ ایضاً ۔

ایک غزل میں کہتے ہیں :

دلیلِ راہ "چراغِ خودی" اگر ہو جائے
قدم مسافرِ ہستی کا تیز تر ہو جائے
مقامِ عالیٔ عرفانِ ذات ہے ، معنی
خودی یہی ہے کہ تجھ کو تری خبر ہو جائے
تری نگہ کو رفعت کا خوف ہے ورنہ
نہیں محال کہ تو زیر سے زبر ہو جائے

زندگی کے سمندر میں کنارے کی بجائے طوفان کی جستجو اقبال کو پسند تھی اور ان کے معنوی شاگرد کا یہ شعر اسی کی صدائے بازگشت ہے :

ہے طوفاں در بغل جس موجِ مضطر کا ہر اک قطرہ
اسے کیوں جستجو ہو راحتِ آغوشِ ساحل کی

مندرجہ ذیل غزل میں اقبال کی ایک بلند پایہ غزل کے مفہوم کو اردو جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے :

آدمی بن آدمی پہلے ، خدا مل جائے گا
آپ اپنا آشنا ہو ، آشنا مل جائے گا
شاخِ تر ہی تجھ کو دے سکتی ہے آبِ زندگی
اس صبا سے اے گلِ پژمردہ کیا مل جائے گا
خونِ دل ہی کے دو قطرے ہیں جنھیں کہتے ہیں مشک
تجھ کو اے آہو ! حرم ہی میں خطا مل جائے گا
فقر کا دعویٰ غلط ہے ، تختِ کسریٰ کے بغیر
گوشۂ عزلت میں کیا اے بے نوا مل جائے گا

کیا بتاؤں کیا ہوئے وہ خوں شدہ نالے مرے
لالہ زارِ دشت سے ان کا پتا مل جائے گا
عقل کے اندھے ! کہیں سے ڈھونڈ روشن دل کوئی
اس کے ہاں سے تجھ کو تیرا مدّعا مل جائے گا
میں قلندر ہوں ، جہاں بینی کرامت ہے مری
جز نگہ تجھ کو سہوس مجھ سے کیا مل جائے گا

مگر اقبال کی بلند اقبالی اپنی جگہ قائم ہے اور اس کا احساس ان کے معنوی شاگرد کو بھی ہے۔ چنانچہ وہ اقبال کی یاد میں اس طرح فریاد کرتے ہیں :

مئے باقی کا جام تھے اقبال
زندگی کا پیام تھے اقبال
مومنوں کے امام تھے اقبال

ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے

قلزمِ علم کے شناور تھے
حکمتِ نادرہ کے دفتر تھے
ان کے جوہر عجیب جوہر تھے

ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے

ہند میں ایک ہی مسلماں تھے
اہلِ مشرق کے مہرِ تاباں تھے
یعنی دانائے راز انساں تھے

ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے

قوم کیوں آج بے قرار نہ ہو
قوم کیوں آج اشکبار نہ ہو
قوم کیوں آج سوگوار نہ ہو ؟

ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے

پیرِ ہندی ترا نیاز آگیں
تیرا شیدا ترا امینِ حزیں
نوحہ گر کیوں نہ ہو بصدق و یقیں

ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے

رحمتِ ذوالجلال تھے اقبال
آپ اپنی مثال تھے اقبال

☆ ☆ ☆

۴۳

حفیظ ہوشیارپوری

(۱۹۷۳ء)

شیخ عبدالحفیظ سلیم ، جو حفیظ ہوشیارپوری کے نام سے معروف ہیں ، ۵ جنوری ۱۹۱۲ء (۱۵ محرّم ۱۳۳۰ھ) کو جھنگ کے قریب ایک قصبے دیوان پور میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد شیخ فضل محمد خاں ہوشیار پور کے رہنے والے تھے ۔ گھرانا پڑھا لکھا اور ادب و شعر کا دل دادہ تھا ۔ آپ کے نانا شیخ غلام محمد ایک فاضل بزرگ تھے اور فارسی کے ناسور شاعر مولانا شیخ غلام قادر گرامی کے ہم جلیس تھے ۔ حفیظ کے بڑے بھائی شیخ عبدالرشید راحل بھی شاعر اور تاریخ گو تھے ۔ حفیظ کی ابتدائی ذہنی تربیت میں ان دونوں بزرگوں کا کافی دخل رہا ۔ وہ خود بھی نوعمری میں مولانا گرامی کی صحبت میں اُٹھتے بیٹھتے رہے ۔ بی ۔ اے اُنھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۳۳ء میں کیا اور وہیں سے ۱۹۳۶ء میں فلسفے میں ایم ۔ اے کی ڈگری لی ۔ یہاں فیض احمد فیض اور ن ۔ م ۔ راشد ان کے ہم عصر تھے اور پطرس بخاری اور صوفی تبسّم ان کے استاد ۔ ان کی علمی صحبتوں

سے انھوں نے خوب فائدہ اٹھایا ۔

۱۹۳۶ع میں میاں بشیر احمد مدیرِ ''ہمایوں'' نے انجمنِ اردو پنجاب کی بنا ڈالی تو حفیظ اس کے نائب معتمد مقرر ہوئے ۔ کچھ عرصہ ''ادبی دنیا'' کی ادارت میں مولانا صلاح الدین احمد کا ہاتھ بٹایا اور مولانا چراغ حسن حسرت کے ہفت روزہ اخبار ''شیرازہ'' میں بھی معاون رہے ۔ پھر دہلی جا کر چند مہینے سردار دیوان سنگھ مفتون کے مشہور اخبار ''ریاست'' میں کام کیا ۔ ۱۹۳۸ع میں سیّد امتیاز علی تاج نے اپنے اخبار ''پھول'' اور ''تہذیبِ نسواں'' کی ادارت انھیں سونپ دی ۔ یہ سلسلہ اکتوبر ۱۹۳۹ع تک جاری رہا ۔ اس کے بعد حفیظ آل انڈیا ریڈیو میں پہنچے اور دلی میں ان کی تقرری ہوئی ۔ اسی سلسلے میں بمبئی گئے اور پھر ۱۹۴۷ع میں لاہور آ گئے ۔ رفتہ رفتہ ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائرکٹر بن کر ۱۹۶۷ع میں ریٹائر ہوئے اور ۱۰ جنوری ۱۹۷۳ع کو پورے ساٹھ سال کی عمر پا کر کراچی میں اللہ کو پیارے ہوگئے ۔[1]

حفیظ خوش گو بھی تھے اور زود گو بھی مگر وہ بھرتی کے شعر نہیں کہتے تھے ۔ یہی ان کی پختگی کی دلیل ہے ۔ انھوں نے اپنے پیچھے غزلیات ، قطعاتِ تاریخ اور نظموں کا ایک انبار چھوڑا ہے ۔ غزلیات کا مجموعہ ''مقامِ غزل'' کے نام سے ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا ۔ انگریزی زبان و ادب سے عمدہ واقفیت رکھتے تھے ۔ فارسی پر بھی عبور حاصل تھا ۔ سندھی اور پنجابی ادب سے بھی ذوق تھا ۔ انھوں

۱- مقدمہ 'مقامِ غزل' مرتبہ شان الحق حقی اور نقوش ، غزل نمبر ۔

نے انگریزی ادب سے اُردو میں چند منظوم ترجمے بھی کیے - چنانچہ شیلے کی نظم A Widow Bird کا ترجمہ ''طائرِ مہجور'' کے نام سے کیا - انھوں نے بچوں کے لیے بھی کچھ نظمیں انگریزی سے اُردو میں منتقل کیں جو ''دو رنگی'' کے نام سے ایک کتابچے کی صورت میں اصل انگریزی نظموں کے پہلو بہ پہلو شائع ہوئیں - اُنھوں نے تاریخ گوئی میں بڑا نام پیدا کیا اور ایسی ایسی تاریخیں کہیں کہ تاریخ گوئی کی روایت میں ایک نیا باب کھل گیا - ان کی شخصیت بہت دل نواز تھی - کتابوں اور بچوں سے محبّت ان کے کردار کا ایک نمایاں وصف تھا -

حفیظ ہوشیارپوری اپنے ایک مضمون ''عمرِ عزیز کے بہترین لمحے[1]'' میں لکھتے ہیں :

''میں بعض لوگوں سے اس قسم کی باتیں سنا کرتا تھا کہ اقبال کے فلسفے میں کوئی نئی بات نہیں - اس کے تمام افکار اصل میں مغربی فلسفیوں کے افکار ہیں - ان مغربی فلسفیوں میں نٹشے اور برگساں کا نام وہ اکثر لیا کرتے تھے - مثلاً ایک صاحب کہا کرتے تھے کہ اقبال نے انسانیت کی تکمیل یا خودی کے ترقّع کا مسئلہ نٹشے کے نظریۂ فوق البشر سے لیا ہے - اسی طرح قوتِ عمل یا حرکت اور مکان و زمان کے نظریے، جو اقبال کے ہاں پائے جاتے ہیں، وہ برگساں کی کاوشِ طبع کا نتیجہ ہیں - ایک صاحب نے، جنھوں نے شوپنہار کے ''عزم للحیات'' (Will To Be) کا

۱- ملفوظاتِ اقبال، مرتبہ محمود نظامی، صفحات ۱۲۷ - ۱۳۸ -

نام سن رکھا تھا اور اس لفظ کے معانی اور شوپنہار کے مایوس کن فلسفۂ حیات سے بے بہرہ معلوم ہوتے تھے ، یہاں تک کہہ دیا کہ خودی کی بنیاد اسی پر رکھی گئی ہے - یہ سن کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور میں نے اسی روز سے تہیہ کر لیا کہ فلسفیانہ نظموں کا ایک سلسلہ شروع کروں ، جس میں فلسفے کے کسی خاص موضوع کے متعلق علامہ اقبال اور ایک مغربی فلسفی کے نظریے مکالمے کی صورت میں پیش کیے جائیں ، تاکہ اُن لوگوں پر ، جنھیں مغربی فلسفیوں تک رسائی کے مواقع نہیں ملتے ، وہ اختلافات واضح ہو جائیں جو علامہ اقبال کو فلسفۂ مغرب سے ہیں -

چنانچہ میں نے اس سلسلے میں تین نظمیں لکھیں - ایک کا موضوع ''خدا'' تھا جس میں ذاتِ مطلق کے متعلق نٹشے اور اقبال کا مطالعہ تھا - باقی دو نظموں ''عزمِ للحیات'' اور ''عزم للقوت'' میں علی الترتیب ''شوپنہار اور اقبال'' اور ''نٹشے اور اقبال'' کے مکالمے تھے - میں نے یہ سلسلہ جاری رکھنے کے لیے علامہ سے اجازت طلب کی اور ایک خط کے ساتھ یہ تینوں نظمیں ان کی خدمت میں بذریعہ ڈاک ارسال کیں -''[1]

۱- مقالاتِ یومِ اقبال ، مرتبہ انٹر کالجیئیٹ مسلم برادر ہڈ ، صفحات ۱۰۲ - ۱۰۵ - ملفوظاتِ اقبال ، صفحات ۱۲۷ - ۱۳۸ -

اس سلسلے کی پہلی دو کڑیاں یہ ہیں :

عزم للحیات

شوپنہار :

دنیا فریب و مکر و ریا ، درد و رنج و غم
حرص و ہوا و کشمکشِ ''عزم للحیات''
تسکینِ جاں ہیں فلسفہ و علم و شعر و فن
ممکن نہیں ہے آہ مگر ان کو بھی ثبات
فطرت ہے طفل ، اور جہاں بلبلوں کا کھیل
کھلتا نہیں ہے مقصدِ تخلیقِ کائنات
اندوہِ بے کراں سے عبارت ہے زندگی
شاید کہ بعدِ مرگ بشر کو ملے نجات

اقبال :

اے ''عزم للحیات'' کے معنی سے بے خبر
آ میں بتاؤں رازِ سراپردۂ حیات
افسانۂ زبونیٔ ہمّت ہیں علم و فن
حاصل ہیں فلسفے کا پریشاں توہّمات
تیغِ خودی سے جوہرِ ہستی کی ہے نمود
تیغِ خودی سے زندہ حقیقت ہے کائنات
اس تیغ میں ملے گی اماں تجھ کو بالیقیں
کیوں ڈھونڈتا ہے موت میں اپنے لیے نجات ؟

خدا

نشتر :

عالمِ امکاں کی ہر شے بے ثبات
زندگی کیا ہے؟ فقط افسانہ ہے
اک معمّا ہے شبستانِ حیات
تیرہ و تاریک یہ کاشانہ ہے
مجھ کو بوئے آشنا آتی نہیں
کس قدر اس کی فضا بیگانہ ہے
کیا وہی ہے اہلِ مذہب کا خدا؟
جس کی صنعت آہ یہ ویرانہ ہے
ہائے وہ شب زندہ دارِ سادہ دل
شمعِ ناپیدا کا جو پروانہ ہے

اقبال :

زندگانی کی حقیقت کو سمجھ
یہ صدف تو گوہرِ یک دانہ ہے
تیرے سینے میں نہیں شمعِ یقیں
اس لیے تاریک یہ کاشانہ ہے
کس طرح پائے سراغِ آشنا
تو کہ اپنے آپ سے بیگانہ ہے
اس کے دل پر فاش ہے سرِّ نہاں
شمعِ ناپیدا کا جو پروانہ ہے

تو تلاشِ جلوۂ جاناں میں گم
وہ شہیدِ جلوۂ جانانہ ہے

حفیظ کے خط کے جواب میں حضرتِ علامہ کا یہ گرامی نامہ موصول ہوا :

"لاہور
یکم نومبر ۱۹۳۶ء

جناب حفیظ صاحب ! السلام علیکم

آپ کا خیال بہت اچھا ہے مگر اردو میں خیالات کا ادا کرنا مشکل ہے ، اس کے لیے آپ کو بہت غور و فکر کرنا ہوگا۔ بحیثیتِ نظم "عزم للحیات" اوروں سے بہتر ہے۔ آپ جس وقت چاہیں تشریف لا سکتے ہیں۔

محمد اقبال"

حفیظ صاحب کی علامہ اقبال سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ دو تین مرتبہ پروفیسر صوفی تبسّم کے ساتھ ، ایک دفعہ عرشی صاحب کے ساتھ ، اکثر اپنے کالج کے دوستوں کی معیت میں اور کبھی کبھی تنہا بھی ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ کئی موضوعات پر گفتگو کرنے کا موقع بھی ملا۔ لیکن افسوس کہ گوناگوں مصروفیتوں کے سبب حفیظ صاحب نظموں کا یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے اور بات یہیں ختم ہوگئی۔

ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے حفیظ صاحب فرماتے ہیں :

"میں گورنمنٹ کالج کی "مجلسِ فلسفہ" کے لیے "بیسویں صدی میں فلسفہ اور سائنس" کے موضوع پر ایک مقالہ لکھ

رہا تھا ۔ چند کتابیں پڑھنے کے بعد مزید استفادے کے لیے علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ میں نے جدید سائنس کے فلسفیانہ اور روحانی رجحانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا کہ اس ''روحانیت'' کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جو مغرب کے موجودہ سائنس دانوں خصوصاً سر آرتھر اڈنگٹن اور سر جیمز جینز کی تحریروں سے منسوب کی جاتی ہے اور کیا موجودہ سائنس واقعی مذہب کی طرف آ رہی ہے ؟

ڈاکٹر صاحب نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ہمیں ان حالات سے خوش نہیں ہونا چاہیے ۔ موجودہ سائنس انیسویں صدی کی سائنس کے خلاف ، جس کی بنیاد ''میکانیت'' اور ''مادیت'' پر تھی ، ایک ردِ عمل ہے ۔ چونکہ مادے کی ماہیت کے متعلق اب سائنس کا نظریہ بدل گیا ہے ، اس لیے موجودہ انقلاب کو بعض لوگ ''روحانیت پرستی'' پر محمول کرتے ہیں ۔ ممکن ہے مادے کے متعلق پھر ہمارا نظریہ بدل جائے اور ''روحانیت آمیز'' خیالات کی یہ عارضی رَو خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے ۔ ہم زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ تحقیقات کے انتہائی مراحل پر سائنس کا حیرت و استعجاب سے دوچار ہوکر فلسفے اور روحانیت کے دامن میں پناہ لینا اس کے اعترافِ عجز و شکست کی دلیل ہے ، اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے حقیقت کو پا لیا ہے ۔ جہاں سائنس ختم ہوتی ہے ، وہاں سے فلسفہ شروع ہوتا

ہے - اور حیرت و استعجاب ، جو سائنس کا انجام ہے ، فلسفے کا آغاز ہے - یہ کوئی نئی بات نہیں ، ہمیشہ سے ایسا ہوتا رہا ہے -

اس سلسلے میں آپ نے ایک لطیفہ بھی ارشاد فرمایا ، جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا - جب میں نے عرض کیا کہ جیمز جینز "قادرِ مطلق" کو ایک بڑے ریاضی دان سے تشبیہ دیتا ہے اور اس کے نزدیک یہ عالمِ امکان ریاضی کے ایک مسئلے کی مانند ہے ، جو اس کے "ذہنِ لا محدود" کی تخلیق ہے ، تو آپ نے ہنس کر جواب دیا کہ اس طرح آپ بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا "شاعرِ مطلق" ہے ، اور یہ دنیا جو اس کی تخلیق ہے ، ایک ایسی نظم ہے جس کا مطلع اور مقطع ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے -"

کچھ عرصہ بعد کالج کی اسی مجلس کے لیے حفیظ صاحب ایک اَور مقالہ تیار کر رہے تھے ، جس کا موضوع تھا "فلسفۂ جدید میں قدر کا تصور -" یعنی :

The Conception of Value in Modern Philosophy

اس مقالے کے بیشتر حصے کی بنیاد ان کے پہلے مقالے پر تھی لیکن مختلف کتابوں کے مطالعے کے بعد بھی "قدر" (یعنی Value) کی ماہیت ایک معمّا ہی تھی جو ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی - خصوصاً یہ مسئلہ کہ قدر کا وجود "خارجی" ہے یا "داخلی" - اس کے متعلق متضاد نظریے ان کی نظر سے گزرے تھے اور وہ کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکے تھے - اپنے شکوک رفع کرنے کے لیے انہوں نے

پھر "حضرتِ علامہ سے رجوع کیا ۔ چنانچہ اپنی یادداشت کی بنا پر لکھتے ہیں :

''میں نے اس مسئلے پر دو نظریے پڑھے تھے :

(۱) ''قدر'' ایک خارجی حقیقت کے انکشاف کا نام ہے ، جس کا منبع نفسِ انسانی کی حدود سے باہر ہے -

(۲) ''قدر'' نفسِ انسانی کی تخلیق ہے اور اس سے باہر اس کا وجود نہیں -

پروفیسر رادھا کرشن نے، جو پہلی بات کے قائل معلوم ہوتے ہیں ، ان متضاد نظریوں کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا :

(۱) قدر اُس حقیقت کے انکشاف کا نام ہے جس کا منبع روحِ مطلق ہے -

(۲) قدر نفسِ غیر مطلق کی استعداد کا انتہائے کمال ہے -

میں نے علامہ مرحوم سے دریافت کیا کہ اس مسئلے پر آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں ؟ آپ نے جواب دیا کہ دونوں نظریے درست ہیں !

میں نے کہا ''وہ کس طرح ؟''

آپ نے فرمایا کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں اور تصویر ان میں سے کسی ایک کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی- ''قدر'' کا وجود بہ یک وقت خارجی اور داخلی ہے اور اس کو ''محض خارجی'' یا ''محض داخلی'' تصور کرنے کی بنیاد اس غلطی پر ہے جس میں مغرب اور مشرق دونوں شریک ہیں ۔ کوئی خالص ''مادی'' یا کوئی خالص ''روحانی''

نقطۂ نظر قدر کی ماہیت کی تسلی بخش تشریح نہیں کر سکتا۔ فلسفے کی یہ روایت ہے کہ وہ عام طور پر ''روح اور مادہ'' دونوں میں ایک کو ''حقیقت'' تصور کر کے دوسرے کو ''سراب'' سمجھ کر ترک کر رہا ہے، حالانکہ دونوں کے امتزاج کا نام ''حقیقت'' ہے۔ یہی روایتی غلطی مسئلۂ قدر پر بھی اثر انداز ہوئی ہے اور اس لیے دو متضاد نظریے پیدا ہو گئے ہیں۔ قدر کا سرچشمہ خارجی ہے لیکن اس کی تخلیق میں انسانی استعداد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ کوئی دو آرٹسٹ بعینہ ایک ہی چیز نہیں بنا سکتے۔ دونوں کے عمل سے اپنی اپنی انفرادیت (Individuality) نمایاں ہوگی۔ اس کے برعکس دو سائنس دانوں کے لیے اپنے اپنے مشاہدات و تجربات سے ایک ہی ''قانونِ فطرت'' اخذ کرنا ممکن ہے۔

پھر جدید سائنس کی روشنی میں اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ دنیا ایک اتفاقی ظہور ہے یا اس کی تخلیق کا کوئی مقصد بھی ہے۔ مجھے اس کے متعلق سر جیمز کے نظریوں میں تضاد نظر آتا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے علامہ سے کہا کہ جیمز کے نزدیک ایک طرف تو دنیا کسی مقصد کے پیشِ نظر پیدا کی گئی ہے کیونکہ وہ ''خلاق'' (Creator) کا قائل ہے، اور جہاں خلاق کا تصور ہوگا وہاں مقصد کا ہونا ضروری ہے، لیکن دوسری طرف وہ اس عالمِ امکان کی ہیبت ناک وسعتوں میں انسان کو ''اسٹرونومی'' کی رُو سے

ایک نہایت ہی غیر اہم اور بے بس چیز تصور کرتا ہے۔
''غیر محدود قوتِ تخلیق'' کا عقیدہ رکھنے کے باوجود اس کا نظریہ نہایت مایوس کن ہے۔
اس تضاد کے متعلق آپ نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا کہ اس قسم کی متضاد باتیں تمام موجودہ سائنس دانوں کے ہاں پائی جاتی ہیں، اور کہا کہ اسٹرونومی کا مطالعہ واقعی انسان کو پست ہمت کر دیتا ہے۔ میں ہمیشہ نوجوانوں کو اس سے منع کرتا ہوں۔''

۲۱ فروری ۱۹۳۷ء کو انجمنِ اردو پنجاب کی طرف سے ''یومِ غالب'' منایا گیا۔ حفیظ صاحب اس تقریب پر پیغام لینے کے لیے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کا اپنا بیان ہے:
''صبح کا وقت تھا۔ آپ جاوید منزل کے صحن کے مغربی کونے میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹانگیں چارپائی سے نیچے لٹکائی ہوئی تھیں اور ان پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان میں درد یا اسی قسم کی کوئی اور تکلیف ہے۔ مجھے دیکھ کر فرمایا: ''نیازی صاحب ہیں؟'' میں نے جواب دیا: ''نہیں، میں حفیظ ہوں۔'' یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایک دو مرتبہ پہلے بھی انہیں مجھ پر نیازی صاحب کا شبہ ہوا تھا۔ خیر میں چارپائی کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مزاج پُرسی کی۔
تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور ''یومِ غالب'' کے لیے پیغام کی درخواست کی۔ اس پر آپ

لیٹ گئے اور کچھ دیر خاموش رہے ۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ مجھے تکلیف ہے ۔ آپ جس قسم کا پیغام چاہتے ہیں خود لکھ لیں ، میں دستخط کردوں گا ۔ چنانچہ میں نے غالب کے متعلق چند اس قسم کی سطور لکھ لیں جو عام طور پر ایسی رسمی تقریبوں کے لیے لکھی جاتی ہیں ۔ اس وقت یاد نہیں رہا کہ میں نے کیا لکھا تھا ۔ میں نے یہ پیغام انھیں پڑھ کر سنایا اور دستخط کے لیے ان کی خدمت میں پیش کرنے ہی کو تھا کہ آپ جوش کے عالم میں فوراً اٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے : ''معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے غالب کا کلام پڑھا ہی نہیں ۔ آپ اس کے فلسفۂ شعر سے بے بہرہ ہیں ۔'' اگر یہ الفاظ کسی اَور کی زبان سے نکلتے تو شاید مجھے اپنی علمی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا احساس نہ ہوتا لیکن مجھے معلوم تھا کہ میں کس کے سامنے ہوں اور یہ الفاظ کس کی زبان سے نکلے ہیں ۔ اس لیے ندامت کے احساس سے چُپ ہو رہا ۔ کوئی دو منٹ کی خاموشی کے بعد آپ نے فرمایا ''لکھیے''۔ آپ بولتے گئے اور میں لکھتا گیا ۔ پھر جو کچھ لکھا تھا پڑھ کر سنایا اور آپ نے دستخط کر دیے ۔''

چونکہ یہ پیغام غالب اور بیدل کے فلسفۂ شعر اور ان کے روحانی تعلق کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہے اور اس کا محفوظ رکھنا بھی نہایت ضروری ہے ، اس لیے میں اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں :

''اپنا پیغام تو میں کیا دوں گا ، البتہ غالب ک پیغام

آن لوگوں تک پہنچا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں جو آج یومِ غالب منا رہے ہیں - ان کا پیغام یہ ہے :

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

مرزا آپ کو اپنے فارسی کلام کی طرف دعوت دیتے ہیں - اس دعوت کا قبول کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے ، لیکن اگر آپ اسے قبول کرنے کا فیصلہ کر لیں تو ان کے فارسی کلام کی حقیقت اور ان کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے دو باتوں کا جاننا ضروری ہے : اوّل یہ کہ عالم شعر میں مرزا عبدالقادر بیدل اور مرزا غالب کا آپس میں کیا تعلق ہے - دوم یہ کہ مرزا بیدل کا فلسفۂ حیات غالب کے دل و دماغ پر کہاں تک موثر ہوا اور مرزا غالب اس فلسفۂ حیات کو سمجھنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے - مجھ کو یقین ہے کہ اگر آج کل کے وہ نوجوان ، جو فارسی ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں ، اس نقطۂ نگاہ سے غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ کریں تو بہت فائدہ اٹھائیں گے -"

اس واقعے کے ذکر کے بغیر یہ مضمون ختم نہیں کیا جا سکتا جو ڈاکٹر صاحب کے روحانی تصرّف کی دلیل ہے - حفیظ صاحب کہتے ہیں :

حضرتِ علامہ کی وفات سے دو سال پہلے کی بات ہے کہ میں ہوشیارپور میں اپنے برادرِ اکبر شیخ عبدالرشید صاحب راحل

کے پاس بیٹھا مثنوی ''مسافر'' کا مطالعہ کر رہا تھا ۔ ہم نظم کے آخری حصے پر پہنچے تو برادرِ محترم اس مصرع پر آ کر رک گئے :

صدق و اخلاص و صفا باقی نہ ماند

اور دو تین منٹ کی خاموشی کے بعد فرمانے لگے کہ اس مصرع کے اعداد ۱۳۵۷ ہیں ، دیکھیں دو سال کے بعد اس مصرع سے کس کی تاریخِ وفات نکلتی ہے ۔ میں یہ بات سن کر ہنس دیا اور اس مصرع کے اعداد گنے تو واقعی ۱۳۵۷ تھے ۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ اس الہامی مصرع کے اندر خود مصنّف کی تاریخِ وفات مضمر ہے ۔ اس واقعے کی یاد میرے ذہن سے بالکل محو چکی تھی ۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد جب میں نے اس مصرع سے تاریخ نکالی تو بھائی صاحب نے اپنے خط میں یہ قصّہ یاد دلایا ۔[1]

اقبال فی الحقیقت ''صدق و اخلاص و صفا'' کا مجسّمہ تھے ۔ وہ ہماری نگاہوں سے روپوش ہیں لیکن ان کی یہ صفات ہمیشہ باقی رہیں گی ۔ اقبال زندۂ جاوید ہیں ۔ مرنے کے بعد ان کے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک موت کی بظاہر کامیاب یورش پر ایک لطیف طنز تھی ۔ کیونکہ :

چشمِ عالم سے وہ چھپ سکتے ہیں ، مر سکتے نہیں

☆ ☆ ☆

۱۔ ملفوظاتِ اقبال ، صفحات ۱۲۷ - ۱۳۸ ۔

۲۲

کپٹن منظور حسن

(۱۹۷۳ء)

کپٹن منظور حسن پنجاب یونیورسٹی کے ایم - اے، ایم - او - ایل اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے ممبر تھے - وہ گوجرانوالہ کے ایک ذی علم جنجوعہ گھرانے کے چشم و چراغ تھے - آپ کے والد مولوی عزیز الدین عزیز، نواب صاحب بہاولپور صادق محمد خاں چہارم کے مصاحب، درباری شاعر اور ممتاز خوش نویس تھے - ان کو فن تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا - انھوں نے اپنے بیٹے منظور حسن (۱۳۱۴ھ) اور پوتوں سلیم اختر (۱۳۴۱ھ) اور سعید اختر (۱۳۴۵ھ) کی ولادت پر ان کے تاریخی نام رکھے -

کپٹن منظور حسن ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۷ء) میں پیدا ہوئے - آپ نے کم سنی ہی میں اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھانے شروع کر دیے تھے - ۱۹۱۳ء میں سکول کی نویں جماعت میں تھے کہ شاعری کی چاٹ لگ گئی اور اسی سال آپ کی پہلی نظم جھنگ کے ہفتہ وار اخبار ''المنیر'' میں شائع ہوئی - ''المنیر'' سے وہ نظم مراد آباد کے

ہفت روزہ اخبار ''البشیر'' میں نقل کی گئی ۔ اس سے حوصلہ بڑھ گیا ۔ ۱۹۱۵ء میں مولانا ظفر علی خاں نے گوجرانوالہ میں ایک سیاسی جلسے کی صدارت کی تو نوجوان منظور حسن نے ایک پُرجوش نظم پڑھی ، جسے مولانا نے پسند کر کے ''زمیندار'' میں شائع کر دیا ۔ اس زمانے میں ''زمیندار'' میں چھپنا بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا ۔ اس سے پڑھنے لکھنے کا شوق اور بڑھ گیا ۔

۱۹۱۸ء میں، جب کہ آپ گھر سے دُور بی ۔ اے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے ، تو اپنے دوستوں کی فرمائش پر اپنی چند نظموں کا مجموعہ ''پیامِ غربت'' کے نام سے شائع کیا اور تمام نسخے اپنے احباب میں تقسیم کر دیے ۔ دیباچے میں سرمۂ مفت نظر کا حوالہ موجود تھا اور سرورق پر علامہ اقبال کا یہ شعر درج تھا :

اَوروں کا ہے پیام اَور ، میرا پیام اَور ہے
غربت کے دردمند کا طرزِ کلام اَور ہے

آپ نے ایک نسخہ حضرتِ علامہ کی خدمت میں بھی بھیجا ۔ بیس اکیس سال کے ناپختہ ذہن طالب علم کا کلام کیا ہو سکتا تھا ؟ خیالات میں جدّت اس لیے مفقود تھی کہ غالب اور اقبال کا کلام حافظے میں محفوظ تھا ۔ داغ ، امیر اور حالی کی شاعری بھی اپنے نقش جمائے ہوئے تھی ۔ نصاب کی کتابوں میں میر ، سودا اور انیس کے منتخبات زیرِ مطالعہ رہے تھے ۔ وہی رنگ طبیعت پر چھایا ہوا تھا ۔ مگر اقبال نے محض حوصلہ افزائی کے خیال سے تعریف کی اور لکھا :

''لاہور

۸ جون ۱۹۱۸ء

مخدومی ، السلام علیکم

آپ کا خط مع نسخہ ''پیامِ غربت'' مل گیا ہے - آپ کی نظمیں بہت اچھی ہیں - مجھے یقین ہے کہ لوگ انھیں پسند کریں گے اور یہ چھوٹا سا مجموعہ مقبولِ عام ہوگا - آج کل وہ زمانہ ہے کہ مسلمان کو اپنی کوئی قوت اپنے نفس کی خاطر صرف نہ کرنی چاہیے - حضرتِ جنید نے ایک دفعہ بیماری میں قرآن شریف کی ایک سورۃ اپنے اوپر پڑھ کے دم کی تھی - بارگاہِ ایزدی سے انھیں ملامت ہوئی کہ 'تو ہمارا کلام اپنے نفس کی خاطر صرف کرتا ہے - آج یہ حالت ہے کہ خدا کا کلام تو ایک طرف اپنا کلام بھی اپنے نفس کی خاطر صرف نہیں ہونا چاہیے -

سرِ عنوان شعر (اَوروں کا ہے پیام . . . الخ) جہاں تک مجھے یاد ہے ، میرا ہے - اس نظم میں بہت سے اغلاط چھپ گئے تھے - دوسرے مصرع میں ''غربت'' کی جگہ لفظِ ''عشق'' ہے - ''غربت'' سے بحر شعر کا درست نہیں رہتا - نظرثانی میں میں نے اسے درست کر دیا ہے - آپ بھی دوسرے ایڈیشن میں تصحیح کر لیں - خط میں جو حسنِ ظن آپ نے میری نسبت اظہار فرمایا ہے ، اس کے لیے سراپا سپاس ہوں - میرا مقصود شاعری سے شاعری

نہیں بلکہ یہ ہے کہ اوروں کے دلوں میں بھی وہی خیالات موج زن ہو جائیں جو میرے دل میں ہیں اور بس ۔ والسلام
محمد اقبال ، لاہور[۱]''

۱۹۱۹ء میں منظور صاحب کو سرکاری ملازمت مل گئی جو ۱۹۵۲ء تک جاری رہی ۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ اور ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم ۔ اے فارسی میں آپ کے ہم درس تھے ۔ یہ دونوں تو تعلیم و تعلّم کے میدانوں میں اپنی شہرت کے جھنڈے گاڑتے رہے ۔ منظور حسن صاحب کو بھی اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ میں فارسی کے اوّل مدرس کی حیثیت سے اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا تھا مگر وہ بہت جلد پہلے کچہری کی دلدل میں پھنس گئے ، وہاں سے نکلے تو انکم ٹیکس کے محکمے میں چلے گئے ۔ پھر محکمۂ امداد باہمی میں لے لیے گئے ۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۸ء تک فوج سے منسلک رہے ۔ وہاں سے واپس آ کر ۱۹۵۲ء میں محکمۂ امداد باہمی سے سول کی پنشن کے حقدار ہوئے ۔

اس سارے عرصے میں اپنے دل کی مرضی سے شعر کہتے اور نظم لکھتے رہے مگر چھپنے چھپانے کے پھیر میں نہیں پڑے ۔ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے مسئلے میں بھی کبھی نہیں اُلجھے ۔ نہ اپنے شعر کسی کو سنانے کی عادت تھی ، نہ داد و بے داد کی خواہش ۔ اس لیے گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے اور ان کا کلام بھی تنقید و ستائش سے بچا رہا ۔ البتہ ۱۹۲۳ء میں آپ نے علامہ اقبال کی نظم ''خضرِ راہ'' کو فارسی میں منتقل کرنے کا ارادہ کیا اور نمونے کے

۱۔ انوار اقبال ، مرتبہ بشیر احمد ڈار ، ص ۲۸۷ ۔

طور پر ایک آدھ بند حضرتِ علامہ کی خدمت میں ارسال کر کے ان سے اجازت طلب کی ، مگر حضرتِ علامہ نے اس پھیر میں پڑنے سے منع فرماتے ہوئے لکھا :

''مکرم بندہ! السلام علیکم

اس نظم (خضرِ راہ) کا فارسی ترجمہ سردار عبدالہادی سفیرِ افغانستان مقیم لندن نے کیا ہے جس کے چند بند ، جو انھوں نے انگلستان سے میرے ملاحظہ کے لیے ارسال کیے تھے ، میں دیکھ چکا ہوں ۔ یہ ترجمہ بمع اصل اُردو کے افغانستان میں شائع ہوگا ۔ میں ان کو اس کے چھاپنے کی اجازت دے چکا ہوں ۔ اب آپ کو یہ زحمت گوارا کرنے کی ضرورت نہیں ۔ اس کے علاوہ آپ کے ترجمے میں محاورہ اور الفاظ کے بعض بعض اغلاط ہیں ۔ بندش بھی چست نہیں ۔ اُمید کہ اس بے لاگ رائے سے آپ ناخوش نہ ہوں گے ۔ ایک صاحب نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی کیا ہے اور ساتھ اس کے شرح اور قریباً سو صفحے کا ایک دیباچہ بھی لکھا ہے ۔ وہ بھی غالباً عنقریب شائع ہونے والا ہے ۔ اس کی اجازت بھی میں دے چکا ہوں ۔ تسلیم

مخلص محمد اقبال ، لاہور

۱۳ اکتوبر ۲۳ع''

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ نے چار سال تک گوجرانوالہ میونسپل کمیٹی میں ایگزیکٹو آفیسر کی حیثیت سے فرائض انجام دیے ۔ اور جب تک جیے ڈسٹرکٹ ریڈ کراس سوسائٹی کے اعزازی

سیکرٹری اور شہر کے کئی علمی ، دینی اور ادبی اداروں کے روح و رواں رہے ۔ انھوں نے گوجرانوالہ سے ایک ہفتہ وار دینی اخبار ''العدل'' بھی جاری کیا ، جو ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۵ء تک حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی سرپرستی میں شائع ہوتا رہا ۔ اس میں علمائے دیوبند اور دیگر مقتدر علمائے احناف کے مضامین شائع ہوتے تھے ۔

۱۹۴۵ء میں آپ نے ایک رسالہ ''سلف و خلف'' شائع کیا ، جس میں خاندانی شجرۂ نسب اور ضلع گوجرانوالہ کے راجپوت گھرانوں کا تذکرہ مندرج ہے ۔ ''مجرمِ عشق'' آپ کا ایک مختصر سا ناول ہے جس میں معاشرے کی ناہمواریوں پر طنز کی گئی ہے ۔

۱۹۶۵ء میں آپ نے اپنا منتشر کلام جمع کر کے ایک مجموعہ مرتب کیا اور اس کا تاریخی نام ''دیوانِ منظور حسن'' (۱۳۸۵ھ) رکھا ، مگر اس کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی ۔ فنِ تاریخ گوئی جیسے مشکل اور پیچیدہ موضوع پر ایک بسیط مضمون رسالہ ''نورالتعلیم'' گکھڑ میں مسلسل شائع کرانے کے بعد ۱۳۸۷ھ (۱۹۶۷ء) میں کتابی صورت میں مرتب کیا ۔ یہ کتاب ، جس کا نام ''فنِ تاریخ گوئی'' ہے ، ۱۹۷۲ء میں لاہور سے شائع ہو چکی ہے اور ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے ۔

دسمبر ۱۹۷۳ء میں کیپٹن منظور حسن ۷۶ برس کی عمر پا کر راہیِ ملکِ بقا ہوئے ۔ آپ کے نام علامہ اقبال کے تین خط اب اقبال اکیڈمی کے ذخیرۂ نوادر میں محفوظ ہیں ۔

☆ ☆ ☆

۴۵

محمد عبدالعلی شوق سندیلوی

(؟؟ ۱۹ء)

سندیلہ کے شرفا میں سے ایک صاحب محمد عبدالعلی ، خلفِ مولوی علی حسن نے شوق تخلص اختیار کر کے ۱۹۱۲ء میں شعر کہنے شروع کیے ۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی شاعری کا بچپن کس استادِ فن کی آغوشِ تربیت میں گزرا لیکن طبیعت میں شعریت ضرور تھی ۔ انھوں نے بہت کم کہا ہے مگر جو کچھ بھی کہا ہے اچھا کہا ہے ۔ کلام جان دار ہے ۔ ان کے نانا منشی عاشق علی ، اٹاوہ میں کلکٹری کے سررشتہ دار تھے : ''وہاں ان کی مِلک کچھ مکان تھے ، جن کے مالک بعد میں شوق صاحب ہوئے ۔ یہ پہلے سندیلہ کے بنک گھر میں ، پھر میونسپل کمیٹی میں ملازم رہے ۔ وہاں سے مستعفی ہو کر ایک وقف کے مدرسے میں ، جو سندیلہ میں ہے ، معلّمِ اعلیٰ ہوئے ۔ تعلیم انٹرنس تک ہے ۔ طبیعت میں مزاح اور دل لگی کا مادہ از حد ہے ، جو کبھی کبھی ستم ظریفی کی حد تک پہنچ

جاتا ہے۔"[1]

شوق سندیلوی جب شعور کی حدوں میں داخل ہو کر خود ایک خوش فکر شاعر بن گئے تو انھیں ادب کی خدمت کرنے اور فنِ غزل گوئی کو ترقی یافتہ صورت میں دیکھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ اس شوق کی تکمیل کے لیے انھوں نے ایک عجیب منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کا طریقہ انھوں نے یہ سوچا کہ اپنے عصر کے تمام صاحبِ کمال شعرائے آردو کی شاگردی اختیار کر کے سب سے اصلاح لی جائے اور ان کی درس گاہِ ادب سے فائدہ آٹھا کر اس امر کو آشکار کیا جائے کہ:

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ہر شاعر اور استادِ سخن کی زبان اور اس کے مذاق میں کتنا اختلاف ہوتا ہے۔ انھوں نے مختلف اوقات میں اپنی پندرہ سولہ غزلیں اس زمانے کے پینتیس نامور اور مستند شعرا کی خدمت میں بغرضِ اصلاح بھیجیں اور سب سے ادب آموزی کا فخر حاصل کیا۔ کچھ عرصہ تو یہ کاروبار چلتا رہا، پھر رفتہ رفتہ اس ہرجائی پن کا راز فاش ہوگیا اور بعض اساتذہ نے اصلاح سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس طرح یہ سلسلہ ختم ہوگیا مگر شوق سندیلوی نے غضب یہ کیا کہ نہ صرف ان سب اصلاحوں کو ۱۹۲٦ء میں یکجا کر کے ایک کتاب کی صورت میں شائع کر دیا[2] بلکہ اس سلسلے میں حضراتِ اساتذہ کے

۱- خم خانۂ جاوید، جلد پنجم، صفحات ۱۷٦-۱۷۷-

۲- باہتمام محمد عبدالمقتدر قریشی، مطلع النور پریس علی گڑھ (محلہ بنی اسرائیلاں) میں طبع ہوئی۔

جو نجی خطوط آئے تھے وہ بھی شائع کر دیے۔ شوق صاحب نے تو ان سادہ دل استادوں کو بنایا لیکن نقّادانِ سخن کو طبع آزمائی کا ایک مضمون ہاتھ آ گیا ۔ کتاب چھپنے کے بعد عرصے تک ان اصلاحوں پر نقد و نظر ہوتا رہا اور بعض خطوں کا مذاق اڑایا جاتا رہا کیونکہ ان میں طرح طرح کی فرمائشیں اور مطالبات تھے ۔

اس کتاب کا نام ''اصلاحِ سخن'' ہے - ۲۳۴ صفحات کی اس کتاب کے شروع میں نیاز فتح پوری مرحوم کی ''تقریب'' ، مولوی عبدالحلیم شرر کا ''دیباچہ'' ، سلطان حیدر جوش کا ''مقدمہ'' اور شوق کی اپنی ''التماس'' شامل ہے - پھر سولہ غزلیں اور ان پر اساتذہ کی اصلاحیں ہیں ۔ مشاہیر شعرا میں احسن مارہروی ، آرزو لکھنوی ، اطہر ہاپوڑی ، علامہ اقبال ، حضرتِ اکبر الہ آبادی ، بیخود دہلوی ، بیخود موہانی ، ثاقب لکھنوی ، جلیل مانکپوری ، ریاض خیرآبادی ، سائل دہلوی ، شاد عظیم آبادی ، شفق عماد پوری ، شوق قدوائی ، شوکت میرٹھی ، صفی لکھنوی ، عزیز لکھنوی ، فانی بدایونی ، محشر لکھنوی ، مضطر خیرآبادی ، ناطق لکھنوی ، نظم طباطبائی ، وحشت کلکتوی اور دیگر کئی اہم نام نظر آتے ہیں - ہر شعر کی اصلاح متعدد ناقدانِ سخن کے قلم سے پہلو بہ پہلو اور جداگانہ دکھائی دیتی ہے - نقوشِ الفاظ ومعانی کی گوناگوں قطع و برید ہر صاحبِ نظر کے سامنے کلامِ شوق کے محاسن و معائب کے علاوہ خود مصلحینِ سخن کے متعلق ایک لطیف موازنہ و مقابلہ بھی پیش کرتی ہے - اس موازنے اور مقابلے سے اگر کوئی دامن کشاں نکل گیا ہے ، تو وہ حضرت اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال ہیں ، جو کسی کو شاگرد بنانے کے

رواداد ہی نہ تھے - پھر بھی چلتے چلتے انھوں نے کوئی نہ کوئی مفید مشورہ دے دیا ہے۔ اصلاح کا یہ سلسلہ ۱۹۱۷ع سے ۱۹۲۳ع تک جاری رہا، پھر بند ہوگیا۔ بعض اساتذہ کے جو خطوط نکاتِ ادبیہ کا گنجینہ معلوم ہوئے، مرتب نے انھیں ضمیمے کے طور پر کتاب کے آخر میں درج کر دیا - یوں اقبال کے بھی تین چار خط محفوظ ہو گئے ہیں - وہی اس مضمون کی اساس ہیں۔

شوق سندیلوی کی پہلی غزل پر ہی، جس کا مطلع یہ تھا:

خواب میں ان کا گلے مل کے جدا ہو جانا
دل کے ارمانوں میں اک حشر بپا ہو جانا

اقبال نے معذرت کرتے ہوئے ۴ نومبر ۱۹۱۹ع کو لکھا:

''مکرم بندہ! سلام مسنون - میں اس رنگِ شاعری سے بے بہرہ ہوں - اس واسطے آپ کی تعمیلِ ارشاد سے قاصر ہوں - بظاہر کوئی غلطی اس میں نظر نہیں آئی -

مخلص محمد اقبال

۴ نومبر ۱۹ع''

لیکن شوق اس سے دل برداشتہ نہیں ہوئے اور مایوس ہو کر نہیں بیٹھ گئے - اس کورے جواب کے بعد بھی وہ برابر حضرت علامہ کو غزلیں بھیجتے اور اصلاح کا مطالبہ کرتے رہے - آخر ان کی استقامت اور مستقل مزاجی نے اقبال کو اس حد تک مائل کر لیا کہ جب مندرجہ ذیل غزل ان کے پاس اصلاح کے لیے پہنچی تو انھوں نے شروع سے آخر تک اسے پڑھا:

اب اپنا دلِ تنگ ہے زندانِ تمنّا
اللہ رے یہ جوشِ فراوانِ تمنّا

کیا ڈالیں کسی آرزوے تازہ کی بنیاد
نظروں میں ہے بربادیِ ایوانِ تمنّا

ہچکی کی صدا ، سب جسے سمجھے دمِ آخر
ٹوٹا تھا یہ قفلِ درِ زندانِ تمنّا

جز خواب نہیں وعدۂ باطل کی حقیقت
جز وہم نہیں موجۂ طوفانِ تمنّا

تیری نگہِ لطف تھی تمہیدِ محبّت
میری نگہِ شوق ہے عنوانِ تمنّا

اے قافلۂ یاس گذر دل میں نہ ہوکر
پامال نہ کر گورِ غریبانِ تمنّا

اے شوق ہے اب روح کو پرواز بھی دشوار
پیوست کلیجے میں ہے پیکانِ تمنّا

اقبال نے غزل ملاحظہ فرمانے کے بعد شوق کو لکھا :

”مخدومی ! السلام علیکم ۔ آپ کی غزل بہت اچھی ہے ۔ زبان کی اصلاح تو میں کیا کروں گا ، خیالات ماشاءاللہ خوب ہیں ۔

اے قافلۂ یاس . . . الخ

اس شعر کا پہلا مصرع پڑھ نہیں سکا ۔

مخلص محمد اقبال“

حضرتِ علامہ کا جواب اتنا مختصر تھا کہ شوق کی اس سے تسلی نہ ہوئی ۔ انھوں نے اپنے اشعار کی خامیوں پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے لیے دوبارہ لکھا مگر یہ شاہین پھر بھی زیرِ دام نہ آیا ۔ اقبال نے اپنی پہلی رائے کا اعادہ کرتے ہوئے اس میں ذرا سا اضافہ کر کے جواب دیا :

''مکرم بندہ ! تسلیم ۔ مجھے آپ کی غزل میں کوئی خامی نظر نہیں آئی ۔ اگر آتی تو کم از کم آپ کی توجہ ضرور دلاتا ۔ ''اے قافلۂ یاس . . . الخ'' مجھ سے پڑھا نہیں گیا اور نہ مصرع کسی طرح سمجھ میں آتا ہے ۔ یہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں ۔ باقی اشعار خوب ہیں :

جز خواب نہیں وعدۂ باطل کی حقیقت
جز وہم نہیں موجۂ طوفانِ تمنا

پرانا اور مبتذل مضمون ہے ۔ آپ کے باقی اشعار میں تازگی پائی جاتی ہے ۔

مخلص محمد اقبال''

جب شوق نے دیکھا کہ اقبال شاید ان کی اردو غزلوں پر اصلاح دینے سے کتراتے اور پہلوتہی کرتے ہیں اور وہ آسانی سے قابو میں نہیں آئیں گے تو آخری حربے کے طور پر ایک اور ترکیب لڑائی اور فارسی کی مندرجہ ذیل نعتیہ غزل اصلاح کے لیے ان کی خدمت میں روانہ کی :

دلا باش قربانِ آں ملک گیرے
کہ بے تاج و اورنگ بخشد سریرے

بہ حسن و جمالے عدیم المثالے
بوصف[1] و کمالے ندارد نظیرے

بہ رو ماهتابے ، بہ ضو آفتابے
بہ خو[2] لاجوابے ، فقید النظیرے

ہمہ[3] غیر محدود در ملکِ باطن
بظاهر بہ قیدِ تعیّن اسیرے

نبی[4] لاجوابے ، علیؓ انتخابے
عجائبِ شہنشہ ، غرائب وزیرے

ز صبحِ تو خامش بود شمعِ هستی
بیا شاہِ شاهاں کہ میرد فقیرے

بر آں شاہِ کونین اے شوق نازم
کہ خوش حال بودہ بہ فرشِ حصیرے

تیر نشانے پر بیٹھا ۔ اقبال نے توجہ سے غزل دیکھی ۔ اگرچہ یہ ان کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی ، پھر بھی انھوں نے مروت سے دو مصرعوں میں ذرا ذرا سی تبدیلی کی ۔ ایک شعر کو قلمزد کرنے کا مشورہ دیا اور غزل واپس کرتے ہوئے نہایت صاف بیانی سے لکھا :

۱۔ اقبال کا مشورہ : بوصف و کمالے فقید النظیرے ۔
۲۔ ایضاً : بہ خو لاجوابے ، ندارد نظیرے ۔
۳۔ خوب شعر ہے ۔ (اقبال)
۴۔ قلمزد ۔

''حسنِ اعتقاد کی داد دیتا ہوں ۔ زبانِ غزل میں فارسیّت
کی شان نہیں ہے :

ہمہ غیر محدود در ملکِ باطن
بظاہر بہ قیدِ تعیّن اسیرے

خوب شعر ہے ۔

محمد اقبال''

اس کے بعد یہ سلسلہ بالکل بند ہو گیا ۔ اگر اقبال انھی جھمیلوں میں پھنسے رہتے تو وہ مفید کام نہ کر سکتے جس کے لیے قدرت نے اُنھیں پیدا کیا تھا ۔ شوق بھی اپنی دل لگی ، شرارت اور ستم ظریفی سے بدنامی مول نہ لیتے تو اپنے اِس قسم کے اشعار کی وجہ سے قابلِ ذکر شعرا کی صف میں آ سکتے تھے :

زباں سے آف نہ کرنا ، شمع ساں جل جل کے مر جانا
بالآخر رفتہ رفتہ حدِّ ہستی سے گزر جانا
حیات و موت بیمارِ امید و بیم کی کیا ہے ؟
نہ جینا سہل ہے جس کا ، نہ ہے آسان مر جانا
یہی دو حرف آہِ سرد کے شرحِ غمِ دل ہیں
طویل اک داستاں ہے جس کو تم نے مختصر جانا
مآلِ کار اپنی ہستیِ موہوم کا یہ ہے
حیاتِ چند روزہ وہ بھی غفلت میں گزر جانا
زباں پر ذکر ، دل میں یاد اور سر میں ترا سودا
نظر کو جستجو تیری ، جہاں جانا ، جدھر جانا

جدھر نگاہ پھری ، سامنے وہ شکل تھی شوق
یہ رنگ آنکھ کا اب جوش انتظار میں ہے

نگاہِ شوق کی گرمی سے اُڑ جاتا ہے رنگ اس کا
تری تصویر تجھ سے بھی زیادہ نازنیں نکلی

ہستی کا کچھ آسرا نہیں ہے
یہ نقش تو دیرپا نہیں ہے
کشتی کا خدا تو ہے نگہباں
کیا ڈر ہے جو ناخدا نہیں ہے
بیجا ہے ہزار دن کا شکوہ
یہ کون کہے بجا نہیں ہے

غفلت سے آنکھ کھول کے دیکھا تو یہ کھلا
ساری خرابیوں کی بنا ما و من میں تھی[1]

☆ ☆ ☆

۱۔ 'خمخانۂ جاوید' ، جلد پنجم ، صفحات ۱۲۷ - ۱۲۸ -

۴۶

ڈاکٹر لمعہ حیدرآبادی

(۱۹۳۵ء)

ڈاکٹر لمعہ کا نام محمد عباس علی خاں ہے - ان کا خاندان مغلوں کے وقت میں فوجی مہمات کے سلسلے میں حیدر آباد گیا اور پھر وہیں بس گیا - ٹونڈہ پور (مشرقی خاندیش) میں ان کی جاگیر بھی ہے - لمعہ کے والد محمد ابراہیم علی خاں حیدر آباد میں سرکاری شکارگاہ اور موٹر خانہ کے مہتمم تھے - ان کا انتقال مئی ۱۹۳۰ء میں ہوا -

لمعہ اپنی زندگی کے ابتدائی چار سال جعفر آباد میں گزار کر مہرِ مادری کے بجائے شفقتِ پدری کے سائے میں پرورش پانے کے لیے حیدر آباد لائے گئے جہاں وہ اپنی پھوپھی کی نگرانی میں ایک شفیق استاد سے اردو، فارسی اور انگریزی پڑھنے لگے - پھر سٹی ہائی سکول سے انٹرنس پاس کر کے ۱۹۲۹ء میں ''کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز'' کے ڈپلومے کے لیے میڈیکل کالج بمبئی میں داخل ہوئے اور پانچ سال تک وہاں رہے - بمبئی کی رومان پرور فضا میں ان کی شاعری نے آنکھ کھولی اور دریائے نیپئن[1] کے دل فریب نظاروں میں پروان چڑھی - مگر ان کی

۱- بمبئی کے ایک دریا کا نام -

طبیعت شہرت سے نفور تھی ، اس لیے ان کی شاعری عوام تک نہ پہنچ سکی ، ان کی اپنی ذات تک محدود رہی۔ فارسی اور انگریزی میں بھی طبع آزمائی کی۔ موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ اپنے اشعار خود ہی گنگناتے اور اپنے ہی صفحۂ دماغ پر نقش کرتے تھے۔ چند چیزوں کے سوا چھپنے چھپانے کا دردِ سر مول ہی نہ لیا ، اس لیے بہت کم لوگ انھیں جان سکے اور ان کے نام سے واقف ہو سکے۔

لمعہ کو علامہ اقبال سے خاص عقیدت تھی۔ وہ حضرت علامہ کو اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے اور ان کا کلام ہمیشہ مقدس آسمانی کتاب کی طرح با وضو پڑھتے تھے۔ علامہ کی کوئی نہ کوئی کتاب ہر وقت ان کے سرہانے دھری رہتی تھی۔ پڑھ پڑھ کر اکثر اشعار حفظ ہو گئے تھے۔ اس بنا پر کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو بھی اقبال ہی خیال کرنے لگتے تھے[1]۔ چنانچہ خود کہتے ہیں :

شعر لکھ کر تو کبھی کہتا ہے میں اقبال ہوں
اور کبھی روتا ہے کہہ کر شامتِ اعمال ہوں

وقتاً فوقتاً اپنے اشعار بھی عقیدت کے طور پر حضرتِ علامہ کی خدمت میں روانہ کرتے تھے ، جس سے ان کے خلوص اور شیفتگی کا پتا چلتا ہے۔[2] مندرجہ ذیل اشعار سے ان کے تاثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے :

تو ہے شاہِ جہانِ بے نیازی
ہے عالمگیر تیری نے نوازی

۱۔ ماہنامہ نیرنگِ خیال ، لاہور ، بابت جون۔ جولائی ۱۹۳۵ء ، ص ۱۰۸۔
۲۔ مرقعِ سخن ، مرتبہ ڈاکٹر سیّد محی الدین زور قادری (۱۹۳۷ء) ، جلد دوم ، صفحات ۳۱۱ - ۳۱۵۔

ہیں نازاں تجھ پہ عطّار و سنائی
مریدِ پیرِ رومی مردِ غازی
(۲۰ مئی ۹۳۳ ۱ء)

مجھے اقبال سے حسنِ عقیدت ہو گئی جس دن
طبق گردوں کے میں نے بس اسی دن دیکھ ڈالے ہیں

اقبال تو سراپا اسرارِ ایزدی ہے
افسوں ترا تکلّم ، تو شعر کا دھنی ہے

اقبال نے بھی ان کی خوب حوصلہ افزائی کی - اپنے مفید مشوروں سے انھیں نوازا ، بعض اشعار میں اصلاح دی اور بعض فنی باتوں کی طرف ان کی توجہ بھی دلائی - اقبال کی آخری بیماری کے دنوں میں وہ ان کی عیادت کے لیے لاہور بھی آئے اور جب واپس چلے گئے تو اقبال نے ۲۰ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں انھیں لکھا :

"آپ کے تشریف لے جانے کے بعد ایک دو روز تک ہمارے عزلت کدے میں وہ کیفیت تھی کہ جس کو غالب نے شاید ہماری محبت کے بارے میں موزوں کیا ہوگا ـــــ اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ـــــ سے آغاز کیا اور ـــــ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے ـــــ پر اختتام کیا - حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا عجیب قسم کی فرضی کامیڈی کا ٹریجڈی پر مبنی انجام ہے - جس ڈرامے کی ایکٹنگ ہم آپ جیسے انسان انجام دے رہے ہیں ، اس کے ڈائرکٹر کی

انسان نوازی پر فخر کرنا چاہیے کہ اس نے اپنے ڈرامے کی شوٹنگ کے لیے انسان کو مختص فرمایا - دنیا میں انسان کی کامیابی یا ناکامی کوئی معنی نہیں رکھتی - یہ دونوں بے معنی لفظ ہیں اور اسی دھن میں دنیا کی اکثریت مبتلا ہے -
انسان صرف جویائے محبت اور اپنے یارِ حقیقی کی دُھن میں لگا رہے - باقی تمام عبث اور خیالی دنیا کا بیہودہ فلسفہ ہے - ہم اس کو ڈھونڈتے رہیں جو ہم کو ڈھونڈنا چاہتا ہے - اس کو ڈھونڈیں ، خوب ڈھونڈیں کہ اپنے آپ کو پا لیں - آپ کی چند ساعت صحبت میں میرے دل کو سرور حاصل ہوا - خدا آپ کو ہر طرح بامراد اور کامیاب رکھے - میری صحت خراب ہو رہی ہے - بینائی میں فرق آ گیا ہے ، اختلاج بہت بڑھ گیا ہے - تقرب نصیب ہو رہا ہے ، ہم آغوشی بھی مل جائے گی انشاءاللہ -''[1]

غرض ڈاکٹر لمعہ کے نام اقبال کی طویل خط و کتابت بہت دلچسپ ہے - ''اقبال نامہ'' مرتّبہ شیخ عطاءاللہ میں ان کے نام اقبال کے انتیس خط موجود ہیں جو ۱۵ اپریل ۱۹۲۹ع سے ۳۱ اگست ۱۹۳۷ع کے درمیانی عرصے کے ہیں - آخری ایک خط کے سوا ، جو میاں محمد شفیع (م - ش) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ، باقی سب اقبال کے اپنے قلم سے ظاہر کیے گئے ہیں - یہ ''اقبال نامہ'' جلد اول میں صفحہ ۲۶۳ سے ۲۹۸ تک پھیلے ہوئے ہیں - بعض خطوں کے جستہ جستہ اقتباسات آپ بھی

۱- اقبال نامہ ، مرتبّہ شیخ عطاء اللہ ، جلد اوّل ، صفحات ۲۹۶ - ۲۹۸ -

ملاحظہ فرمائیں :

(۱) ''۱۵ اپریل ۱۹۲۹ء — مجھے اس اطلاع سے مسرت ہوئی کہ میرے اشعار کے مطالعے سے آپ کو فائدہ پہنچا ۔ آپ نے اپنی نظموں میں مجھ ناچیز کے متعلق جن جذبات کا اظہار فرمایا ہے ، اُن کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔

(۲) ۷ مئی ۱۹۲۹ء — فی الحال اصلاحِ اشعار سے معاف فرمائیے کہ بالکل فرصت نہیں ۔ کسی فرصت کے وقت دیکھوں گا ۔

(۳) ۲۰ مئی ۱۹۳۰ء (انگریزی) — آپ کے والد بزرگوار کے انتقال کی اطلاع سے قلق ہوا ۔ جسے آپ نیچر کہتے ہیں ، اس کے سپرد ایک بہت بڑی کائنات کا اہتمام ہے اور ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے وظیفے کی نوعیت سے 'کماحقہ' آگاہ ہے ۔

(۴) یکم فروری ۱۹۳۱ء — مسٹر محمد علی مرحوم کا خاتمہ بخیر ہوا ۔ اگرچہ میں ان کی سیاست کا کبھی مداح نہ تھا ، لیکن ان کی اسلامی سادگی اور آخری سالوں میں بعض آرا کے بدل لینے میں جس امانت و دیانت کا انھوں نے ثبوت دیا ، بہت احترام کرتا ہوں ۔ اپنے متعلق ان کی پیش گوئی بھی درست ثابت ہوئی اور اس سے بھی قوم میں ان کا وقار بڑھ گیا ۔ مسجد اقصٰی میں آخری آرام گاہ کا میسر آنا ان کی

خوش نصیبی ہے جس سے ان کا مرتبہ بلند تر ہو گیا ہے - اب تو محض ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے ان کا مرتبہ نہایت ارفع ہو چکا ہے - اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے -

(۵) ۲۴ فروری ۱۹۳۲ء (انگریزی) ---- میں نہایت ممنون ہوں کہ آپ وقتاً فوقتاً اپنی نظمیں بھیجتے رہتے ہیں - اگر میں آپ کی توجہ کا ہمیشہ بروقت شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں تو اسے میری بے رخی پر محمول نہ فرمائیے اور یہ نہ سمجھیے کہ اس جذبے کی پوری پوری قدر کرنے میں کوتاہی کا مرتکب ہوں جس کے تحت میں آپ مجھے یہ تحفہ بھیجتے ہیں - میں ہمیشہ انہیں بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں کیونکہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کس حد تک اپنی نظموں کو آپ معنویت یا روحانیت کا حامل بنا سکے ہیں - آپ میں ایک معنوی میلان پایا جاتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کا برمحل استعمال کریں - میرے خیال میں اُردو کو اپنے جذبات کا ذریعہ اختیار کرنے میں آپ نے بڑی دانائی سے کام لیا ہے - اپنی زبان غیر زبان سے ہر حالت میں بہتر ہوتی ہے - امید ہے آپ کی صحت اچھی ہوگی - کیا آپ کو بروقت ایک گُر بتا دوں ؟ شعر و سخن میں کم وقت صرف کیجیے تو آپ کی صحت کو فائدہ پہنچے گا -

(۶) ۱۳ جون ۱۹۳۲ء ـــــ قرآن شریف[1] کا تحفہ جو آپ نے بہ کمال عنایت ارسال فرمایا ہے، ابھی موصول ہوا۔ اس مقدس تحفے کے لیے میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں۔ انشاء اللہ یہی نسخہ استعمال کیا کروں گا۔

(۷) ۲ فروری ۱۹۳۳ء ـــــ رجسٹر اور خط موصول ہوا۔ نظمیں ایک جگہ سب کی سب محفوظ ہیں۔ انتخاب آپ کی مرضی پر موقوف ہے۔ نظم ہو یا غزل، مختلف مضامین کی حامل ہوتی ہیں اور ناظرین یا سامعین کی طبائع مختلف، اس لیے میرے خیال میں اشعار کا انتخاب مشکل کام ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کلام مدارج کے لحاظ سے منتخب کیا جائے۔ آپ کا ایک خاص رنگ ہے اور آپ کے اکثر اشعار ایک وجدانی کیفیت رکھتے ہیں۔ اپنے مجموعۂ کلام کے لیے آپ نے جو نام تجویز فرمائے ہیں، ان کی ایک طویل فہرست ہے اور سب نام ایک سے ایک بہتر۔ نظرِ انتخاب کہیں جمتی نہیں۔ میری رائے میں آپ اپنے جملہ کلام کو ایک ہی نام سے معنون کریں اور جلد اوّل، دوم سے موسوم کردیں۔ ''تقدیرِ اُمم'' موزوں نام ہے۔

۱۔ قرآن کریم کا یہ نسخہ ڈاکٹر لمعہ کو مولانا محمد علی جوہر مرحوم سے ملا تھا، اور ایک بلند تاریخی قدر و منزلت کا حامل ہے، کیونکہ حضرت عالمگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

(۸) ۱۹ مارچ ۱۹۳۳ع ـــ آپ کے خطوط و خیالات کو پڑھ کر مجھے بے حد مسرت حاصل ہوتی ہے ۔ آپ بھی جوان اور آپ کی شاعری بھی جوان ۔ مجھے تو آپ کی نظموں میں ایک خاص جذبہ نظر آتا ہے اور زبان کی سلاست سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کہہ جاتے ہیں ، بلاقصد کہہ جاتے ہیں ۔ اسی کا نام آمد ہے ۔ یہ کیفیت منجانب اللہ ہے ۔ کوشش سے حاصل نہیں ہوتی ۔ رند کہتا ہے :

مشق کر مشق کہ تا لطفِ سخن پیدا ہو
خود بخود شعر میں بے ساختہ پن پیدا ہو

(۹) ۱۰ اپریل ۱۹۳۴ع ـــ آپ کے جواہر پارے گنج سخن میں محفوظ ہیں اور میں دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہا ہوں ۔ خدا کرے آپ کو شاعری کے لیے کافی مہلت مل جائے ۔

سنیے ! غزل اور رباعی کے لیے کافیے کی شرط تو لازمی ہے ۔ اگر ردیف بھی بڑھا دی جائے تو سخن میں اور بھی لطف بڑھ جاتا ہے ۔ البتہ نظم ردیف کی محتاج نہیں ، قافیہ تو ہونا چاہیے ۔ اب کچھ عرصے سے بلا ردیف و قافیہ نظمیں لکھی جاتی ہیں اور یہ انگریزی نظموں کی تقلید ہے ، جس کا نام انگریزی میں ''بلینک ورس'' ہے ، جس کو ''نثرِ مرجّز'' کہنا چاہیے ۔ اگرچہ پبلک مذاق کچھ ایسا ہو چلا ہے.

مگر میرے خیال میں یہ روش آیندہ مقبول نہ ہوگی۔ نظموں کے لیے اوّلاً سبجکٹ اور مضامین تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ نیچرل مضامین تو سبجکٹ ہی کے اعلیٰ انتخاب سے کچھ لطف دیتے ہیں۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ حتی الامکان آپ کی نظمیں اس خصوصیت سے مالا مال ہوتی ہیں۔ کلام کی پختگی تو اب بھی آپ کے خیالات میں موجود ہے اور مشق سے ہوتے ہوتے حاصل ہوگی۔ قدیم شاعری اور جدید شاعری بھی سرمایۂ ادب کا ایک سبجکٹ ہوگیا ہے۔

میں فقط فرسودہ مضامین کی حد تک جدید و قدیم کی بحث کو مانتا ہوں۔ شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں۔ جذباتِ انسانی اور کیفیّاتِ قلبی اللہ کی دین ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ طبع موزوں اس کے ادا کرنے کے لیے پُراثر الفاظ تلاش کرے۔ نظم کے اصناف کی تقسیم، جو قدیم سے ہے، ہمیشہ رہے گی اور انسانی جذبات ماحول کے تابع رہیں گے۔ بس یہ سمجھ لیا جائے کہ جس شاعر کے جذبات ماحول سے اثر پذیر ہیں وہ شاعر جدید رنگ کا حامل متصوّر ہو سکتا ہے، نہ کہ نفسِ شعری۔ اگر ہم نے پابندیٔ عروض کی خلاف ورزی کی تو شاعری کا قلعہ ہی منہدم ہو جائے گا اور اس نقطۂ خیال سے یہ کہنا پڑے گا، اور یہ کہنا درست ہے، کہ موجودہ شعرا کا کام

تعمیری ہونا چاہیے نہ کہ تخریبی ۔

(۱۰) ۱۲ اپریل ۱۹۳۴ء ––– آپ کے افسانے اور کلام بعد مطالعہ واپس کر رہا ہوں ۔ ماشاءاللہ خوب ہیں :

رموزِ فطرت کا اک سمندر ترے خیالوں میں گو رہا ہے
تو خود شناسی سے اپنی دنیا کو رازِ انسان بتا رہا ہے

(۱۱) یکم دسمبر ۱۹۳۴ء ––– میں نے آپ کا کلام دیکھا ہے اور تازہ نظمیں بھی ۔ مجھے شعریت سے زیادہ معنویت نظر آئی اور میں بے حد متاثر ہوا ۔ میری یہ خواہش ہے کہ اس قدرتی عطیے کو آپ بہترین طریقے سے استعمال کریں ۔ آپ کے اکثر اشعار وجدان کے حامل ہیں ۔

(۱۲) ۲۰ فروری ۱۹۳۵ء ––– میں یہ خط آپ کو بھوپال سے لکھ رہا ہوں . . . آپ کی تازہ نظم پڑھ کر بہت خوش ہوا ۔ اس میں اصلاح کی گنجائش نہیں ہے ۔ میں یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ آپ مثنوی مولانا روم سے استفادہ کر رہے ہیں ۔ دنیا کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے ، وہ آپ کی عمر کے لحاظ سے بالکل درست ہے ، مگر آپ کو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ دنیا اک بہت بڑا مقام ہے اور اس سے صحیح استفادہ کرنے کے لیے ہمیں انسانِ کامل بننے کی کوشش کرنی چاہیے ۔

مولانا رومی کو بغور پڑھیے اور اس بات کا خیال رکھیے کہ جو کچھ آپ کا ضمیر اس خصوص میں آپ کو مشورہ دے ، اس سے انکار نہ ہو ۔ میرے گلے کی حالت اب روبصحت ہے ۔ آپ کے گراں قدر مشوروں کا شکریہ :

نگہدار آنچہ در آب و گلِ تست
سرور و سوز و مستی حاصلِ تست
تہی دیدم سبوئے این و آں را
مئے باقی بہ مینائے دلِ تست

آپ نے میرا حال دریافت فرمایا ہے ۔ شکریہ ! زندہ ہوں ، دل مضمحل ، مسرّت فنا ، اللہ اللہ خیر صلاّ ۔ خدا حافظ !

(۱۳) ۲۲ مارچ ۱۹۳۵ء —— آپ کا کلام میرے حدِ مذاق تک بہت پُرلطف ہے ۔ اس کی اشاعت میں تامّل کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔ یہ آپ کے شوق کی بات ہے ۔ میں نے حتی الامکان جہاں جہاں ضرورت معلوم ہوئی ترمیم کی ہے ، لیکن آپ کے تخیّل کو مجروح ہونے سے بچایا ہے ۔ طبع کے وقت مکرّر غور بھی ممکن ہے اور انتخاب بھی ۔ یہ سب چیزیں بالمشافہ انشاءاللہ تعالیٰ ٹھیک ہو جائیں گی ۔

(۱۴) ۱۱ مئی ۱۹۳۵ء —— آپ کے افسانوں اور مثنوی سے میں نے استفادہ کیا ہے ۔ افسانے نہایت دلکش

اور موثر ہیں - زبان شستہ ہے - مثنوی کا آغاز بہت
اچھا ہے - خدا کرے اس کا اختتام بھی اچھا ہو -

(۱۵) ۲ اگست ۱۹۳۶ء ـــ آپ کی نظم آج ہی ملی -
دیکھ کر آج ہی واپس کر رہا ہوں - بار بار پڑھی ،
بڑا لطف آیا - اللہ کرے زورِ قلم اَور زیادہ -"

نیپئن بمبئی کے ایک دریا کا نام ہے ، جو لمعہ کی تفریح کا مرکز تھا - ایک نظم اسی دریا کے متعلق تھی - آپ بھی ملاحظہ فرمائیں - یہ ۲۴ جون ۱۹۳۶ء کو لکھی گئی تھی :

لمعہ ہے ، نیپئن ہے اور آرزوے وصال ہے
مشقِ خرامِ نیپئن ، موسمِ برشگال ہے

دوسرے مصرعے کو اقبال نے یوں کر دیا :

موجیں ہیں زور زور کی ، موسمِ برشگال ہے

ساحلِ نیپئن پہ آج عشق کا اَور حال ہے
لب پہ سرورِ سرمدی ، حسن سے قیل و قال ہے
موجیں ہیں نغمہ زن اِدھر ، ابر اُدھر ہے اشکبار
دونوں کی کشمکش میں آج حُسن بھی پائمال ہے

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں اقبال نے 'حُسن' کی جگہ 'ذوق' کا لفظ تجویز کیا ہے -

بربطِ دل میں لمعہ کے نغمے ہیں وہ نئے نئے
جس میں خدا ہے کارساز جس میں خودی کا حال ہے

سوزشِ عشق نے مری شمع کو بھی بجھا دیا
میری صدائے درد میں ہے تو یہی کمال ہے
علم کی جان و جسم میں میرا قیام ہے مدام
آنکھ میں شمس[1] ہے اگر، دل میں مرے جلال[2] ہے
مجھ سے گناہ گار پر اُف ری تری نوازشیں
دل بھی دیا ، دماغ بھی ، جاہ بھی ہے ، منال ہے
اِس کے سوا نہیں کوئی اَور تو آرزو مری
وصل ہو دید کا مجھے ، دید مرا وصال ہے
جان کے دل کا راز وہ مجھ سے یہ پوچھتے ہیں پھر
آپ چھپا رہے ہیں کیوں آپ کا کیا سوال ہے

اس شعر کے پہلے مصرعے کو اقبال نے یوں بدل دیا ہے : ع

جان کے بھی وہ رازِ دل، مجھ سے یہ پوچھتے ہیں پھر

دل بھی ترا ، دماغ بھی ، جاہ بھی اور منال بھی
میری اگر ہے کوئی شے ، آرزوے وصال ہے
عشقِ مجاز نے مجھے ذوقِ طلب عطا کیا
دل میں ، جگر میں ، آنکھ میں ایک ترا خیال ہے
عرشِ خیالِ شعر پر لمعہ ہے آج جلوہ گر
نوکِ قلم سے زرفشاں رازِ خودی کا حال ہے

مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

۱- حضرت شمس تبریزؒ ۔
۲- حضرت جلال الدین رومیؒ ۔

کئی جگہ اقبال نے مبالغے کی حد تک ڈاکٹر لمعہ کی تعریف کی ہے۔ اسی بنا پر بعضوں نے ان خطوں کی ثقاہت پر شک کا اظہار کیا ہے۔ بعض خطوں کا اسلوبِ نگارش واقعی اقبال کا معلوم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم کا کہنا ہے کہ:

''مجھے سب سے زیادہ تعجب اُن خطوں پر ہے جو ایک حیدرآبادی لمعہ صاحب کے نام ''خطوطِ اقبال'' کے مجموعے میں شائع ہوئے ہیں۔ مؤلف نے اصل خطوط نہیں دیکھے۔ حیدر آبادی صاحب نے خود ہی نقل کر کے بھیج دیے اور اسی طرح شائع کر دیے گئے۔ میری رائے میں یہ خط بیشتر وضعی ہیں۔ عبارت پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ مثلاً ''استفادہ حاصل کرنا''۔ یہ اقبال کا لفظ نہیں۔ مؤلف شیخ عطاء اللہ نے تفحّص سے کام نہیں لیا۔''[1]

ایک حیدرآبادی مصنّف نے تو ڈاکٹر لمعہ کو پُراسرار شخصیت قرار دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ نظر حیدرآبادی مرحوم اپنی کتاب ''اقبال اور حیدرآباد'' میں لکھتے ہیں:

''یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ کے نام سے ''اقبال نامہ'' کی اشاعت سے قبل خود اہلِ حیدر آباد بہت کم واقف تھے، لیکن اس کے مطالعے سے ان کی صلاحیتوں سے تعارف حاصل ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ اقبال

۱۔ ''اسماء الرجالِ اقبال'' از ڈاکٹر تاثیر، مندرجہ 'کریسنٹ' لاہور، یادگار نمبر، فروری۔اپریل ۱۹۵۰ء، ص ۱۳۶۔

سا شاعر جن کی صلاحیتوں کا معترف ہے وہ حیدر آباد میں
اتنے گمنام رہے - اور بعض جگہوں پر تو اقبال کے قلم سے
ایسے توصیفی جملے نکل گئے ہیں کہ شبہے کی گنجائش پیدا ہو
جاتی ہے - معلوم نہیں شیخ عطاء اللہ کو اصل خطوط بھی
ملے یا نہیں - یہ بات چونکا دینے والی ہے کہ اقبال ، جو
ہمیشہ اصلاحِ سخن سے پہلوتہی کرتے تھے ، وہ لمعہ کو نہ
صرف اپنے مشوروں سے مستفید کرتے ہیں بلکہ مسلسل
اصلاحیں بھی دیتے ہیں -

دوسری عجیب بات یہ ہے کہ لمعہ بہ یک وقت اقبال کی
طرح ٹیگور سے بھی قربت رکھتے تھے - چنانچہ ان خطوں کے
مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ انھی کی سعی و کوشش سے بہت سی
غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا اور ٹیگور لاہور کے دورانِ قیام
میں اقبال کی مزاج پُرسی کے لیے ان کے گھر گئے -''[۱]

مگر جب تک اصل خط سامنے نہ ہوں ، کوئی قطعی رائے قائم نہیں
کی جا سکتی کہ یہ خط جعلی ہیں یا اصلی - ''اقبال نامہ'' کے مرتب شیخ
عطاء اللہ مرحوم کا بیان ہے کہ شیخ سر عبدالقادر نے ''جہاں خطوط کی
فراہمی میں میری پُرجوش رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی وہاں مجھ پر
سب سے بڑا کرم یہ کیا کہ ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ (حیدر آبادی)
جاگیردار ٹونڈہ پور مشرقی خاندیس سی - پی سے میرا تعارف کرا دیا اور
اس طرح اس خدمتِ امانت کے لیے مجھے اقبال کے ایک نوجوان ، مخلص

۱- اقبال اور حیدر آباد ، صفحات ۲۳۱ - ۲۳۲ -

دوست ، مداح اور عقیدت مند میسّر آ گئے جنھوں نے نہ صرف خود مکاتیبِ اقبال کا ایک گراں قدر مجموعہ مرحمت فرمایا بلکہ اب مرتّبِ ''اقبال نامہ'' سے بھی زیادہ جوش و انہماک سے حیدر آباد میں مکاتیب کی فراہمی کا اہتمام کر رہے ہیں ۔ اقبال مرحوم کو وہ اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں ۔ اقبال مرحوم بھی انھیں ''محسن انامل'' کے لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے ۔''

شیخ عطاء اللہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر لمعہ حیدر آباد کے نوجوان سخنور ہیں ۔ اقبال اور ٹیگور سے ان کے نہایت مخلصانہ مراسم تھے ۔ اقبال اور ٹیگور میں بعض اوقات جو ناگوار موازنہ کیا جاتا تھا ، اس کے پیشِ نظر انھوں نے ٹیگور سے ایک مرتبہ ، جب وہ لاہور تشریف لے جا رہے تھے ، فرمائش کی کہ وہ لاہور میں اقبال سے ضرور ملیں ۔ ٹیگور لاہور پہنچے تو سوء اتفاق سے اقبال لاہور میں موجود نہ تھے ۔ ڈاکٹر لمعہ کی ان دونوں بزرگوں سے عقیدت کا صلہ ٹیگور کی طرف سے ایک اہم مکتوب کی صورت میں ملا ، جس سے ٹیگور کے اخلاق کی بلندی و حق پرستی اور ٹیگور کی نظر میں اقبال کی منزلت کا پتا چلتا ہے ۔ ٹیگور کا یہ خط اقبال اور ٹیگور کو حریف و رقیب ثابت کرنے والوں کے لیے ایک تازیانۂ عبرت ہے ۔

حال ہی میں ایرانی وفد کے ایک حق ناشناس رکن نے اقبال کو ، کہ ''دیدم در کمندش مہر و مہ را'' کا مصداق تھا ، ایک شاعرِ مقامی اور ٹیگور کو ایک عظیم المرتبت شخصیت کہہ کر اس ناگوار قضیے کو تازہ کیا تو مجھے (شیخ عطاء اللہ مرحوم کو) اس خط کی اشاعت کا اہتمام کرنا پڑا ۔ اس خط کی موجودگی اور اشاعت امید ہے آیندہ

کتنے ہی نادانی و رقابت کے فتنوں کا سدّباب کر دے گی ۔ ٹیگور ، ڈاکٹر لمعہ کو لکھتے ہیں :

''آپ کے نوازش نامے اور نظم نے میرے دل پر خاص اثر کیا ۔ مجھے یہ معلوم کر کے بے پایاں مسرت حاصل ہوئی کہ آپ اپنے شاعرِ اعظم سر محمد اقبال اور میری نظموں میں ایک ربطِ باطنی محسوس کرتے ہیں ۔ اُن زبانوں سے ، جن میں اقبال شعر کہتے ہیں ، ناواقفیت کی بنا پر اُن کی قوتِ تخلیق کی گہرائیوں تک نہ تو میری رسائی ممکن ہے اور نہ ہی میں ان کے کلام سے متعلق کوئی رائے پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں ۔ لیکن اقبال کی نظموں کو جو شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی ہے اس کی بنا پر مجھے یقینِ واثق ہے کہ اقبال کے ان جواہر پاروں میں ادبِ جاوداں کی عظمت و تاب ناکی موجود ہے ۔ میرے لیے یہ خیال باربا باعثِ اذیّت ہوا ہے کہ بعض نقاد میری اور سر محمد اقبال کی ادبی کاوشوں کو حریفانہ اور رقیبانہ میزان پر جانچ کر غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اُس ادب کے متعلق ، جس کا خطاب جملہ بنی نوعِ انسان سے ہو ، یہ روش حد درجہ مذموم ہے ، کیونکہ ادبِ عالمگیر کی مملکت میں بلالحاظِ زمان و مکان شعرا و اصحابِ فنون کی ایک انسانی برادری معرضِ وجود میں آ جاتی ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ سر محمد اقبال اور میں ادب میں حسن و صداقت کے دو خدمت گزار ہیں اور ہم اُس سرحد پر مل جاتے ہیں

جہاں سے انسانی دل و دماغ اپنا بہترین و جمیل ترین ہدیہ
جاوداں عالمِ انسانیت کے حضور میں پیش کرتا ہے۔"[1]

مرتّبِ "اقبال نامہ" کی اس تصریح کے بعد تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ:

"ڈاکٹر اقبال نے ایک خط میں ڈاکٹر لمعہ کو ہدیہ قرآن کریم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نسخے کی تلاوت کا وعدہ فرمایا ہے۔ یہ نسخہ ڈاکٹر لمعہ کو مولانا محمد علی مرحوم سے ملا تھا اور ایک بلند تاریخی قدر و منزلت کا حامل ہے کیونکہ یہ حضرتِ عالمگیر کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ہے۔ اقبال کی نظر میں یہ تحفہ کس قدر محبوب ہوگا؟ اس کا اندازہ اہلِ دل ہی کر سکتے ہیں۔ حضرت عالمگیر کو اقبال نے: ع

چوں براهیم اندریں بتخانہ بود

کہہ کر یاد فرمایا تھا۔"[2]

☆ ☆ ☆

۱۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے حضرتِ علامہ کی وفات پر بھی کچھ اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا تھا:
"ہمارے ادب میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کے پُر ہونے میں ایک جان لیوا زخم کے مندمل ہونے جتنا عرصہ لگے گا۔ ہندوستان جس کی آج دنیا میں کوئی وقعت نہیں، ایسے شاعر کی وفات سے اور بھی قلاش ہوگیا ہے جس کی شاعری عالمگیر اور آفاقی شہرت کی حامل تھی۔"
(سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، ۲۳ اپریل ۱۹۳۸ع)۔

۲۔ اقبال نامہ، جلد اوّل، دیباچہ، صفحہ د۔ ذ۔ ر۔ ز۔ س۔

۴۷

مولوی عبدالسلام سلیم

(۱۹۰؟؟ء)

ابوالمکارم محمد عبدالسلام متخلص بہ سلیم نے اپنے چند فارسی عربی قصائد مرتب کر کے ''نسیم سلیم'' کے نام سے چھپوائے ۔ ان قصائد میں بائیس اشعار کا ایک قصیدہ ''نامہ بسوئے اقبال'' کے عنوان سے اور اقبال کا ایک خط ''جوابِ اقبال'' کے عنوان سے شامل ہیں ۔ اقبال کا خط ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :

''مخدوم و مکرم جنابِ مولانا سلیم !

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ' ۔ آپ نے مجھ ہیچ مدان کے متعلق جن اچھے خیالات کا اظہار فرمایا ہے ، میں ان کے لیے آپ کا بے حد ممنون ہوں ۔ اللہ تعالی آپ کو

۱- انوارِ اقبال ، مرتبہ بشیر احمد ڈار ، ص ۱۵ -

جزائے خیر دے ۔ آپ کے عربی قصائد بہت دلکش ہیں ۔
اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ ۔

مخلص

محمد اقبال بیرسٹر ، لاہور"

☆ ☆ ☆

۴۸

عبدالرؤف شوق

(۱۹؟؟ ع)

میر عبدالرؤف شوق ، خلفِ مولوی عبدالکریم جعفری موضع اسلام آباد کے حصہ دار اور معتمدی تعمیراتِ عامہ سرکار آصفیہ میں صیغہ دار تھے ۔ آپ کے دادا اورنگ آباد کے منصف و مفتی ہونے کے علاوہ نواب قائم جنگ کے استاد بھی تھے۔ ان کے بزرگ مضافاتِ شیراز سے نقلِ مکانی کر کے ہندوستان آئے اور کوئی ڈیڑھ سو برس سے ان کا خاندان دکن میں آباد ہے ۔ سیّد شاہ عبدالحق اور نواب مقدم جنگ ان کے اسلاف میں بہت نامور ہوئے ہیں ۔

میر عبدالرؤف شوق کہنہ مشق شاعر تھے ۔ ابتدا میں مولوی ، سرفراز علی موصفی سے اصلاح لیتے تھے ، بعد میں حضرت حبیب کنتوری ، سے فیضِ سخن حاصل کیا ۔ نمونۂ کلام یہ ہے :

جہاں میں آ کے خاصانِ خدا سہتے ہیں ایذائیں
یہ دارِ امتحاں باعث ہے عیشِ جاودانی کا

شہادت ہوگئی وجہ فروغ عاشقِ مضطر
کٹا ہے سر کہ گل کترا ہے شمعِ زندگی کا
چھپے ہیں پردۂ دل میں وہ آنکھوں سے نہاں ہو کر
کھلا ہے مجھ پہ عقدہ بعدِ مدت لن ترانی کا

یہ لعلِ بے بہا جن کا سرِ شوریدہ ہے معدن
جگر کاوی سے آئے ہیں زباں تک دل کے ٹکڑے ہیں

اے فلک تجھ سے بر آئی اک جہاں کی آرزو
ہم جہاں سے لے چلے اس جانِ جاں کی آرزو
واسطے دو دن کے بنواتے ہو کیوں قصرِ بلند
غافلو! بے سود ہے نام و نشاں کی آرزو
ذکر ان بانوں کا کیا جب دل ہی پہلو میں نہ ہو
شوق کیسا، کس کی حسرت، اور کہاں کی آرزو

وہ چال چل کہ دل نہ کسی کا ہو پائمال
اتنا خیال عالمِ رفعت میں چاہیے[1]

انھوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپائے مبارک پر ایک نظم ''مرقع رحمت'' لکھی جو ۱۹۱۶ء میں ذخیرہ پریس حیدرآباد میں طبع ہوئی۔ کتاب کے آخر میں تقاریظ وغیرہ ہیں۔

۱۔ خم خانۂ جاوید، جلد پنجم، صفحات ۱۰۷-۱۰۸۔

ان میں علامہ اقبال کی ایک تقریظ بھی ہے جو درج ذیل ہے :

''شوق صاحب کی نظم میں نے دیکھی ہے ۔ اس کے ہر شعر میں خلوص و محبت اور عقیدت کی جھلک ہے ۔ خوشا وہ دل جو عشقِ نبوی کا نشیمن ہو ۔

سیّد عبدالرؤف صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حبیبِ پاکؐ کی محبت عطا فرمائی ۔ میری نگہ میں ان کا ہر شعر قابلِ احترام ہے ۔''[۲]

☆ ☆ ☆

۲۔ انوارِ اقبال ، مرتبہ بشیر احمد ڈار ، ص ۱۴ ۔

۲۹

شاکر صدیقی

(۱۹؟؟ع)

شاکر صدیقی صاحب کے متعلق اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ایک زمانے میں چک جھمرہ ضلع لائل پور میں مقیم تھے اور ۱۹۱۵ع میں گوجرانوالہ میونسپل کمیٹی میں اوورسیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے تھے - انھیں لکھنے پڑھنے بلکہ شعر کہنے کا بہت شوق تھا - ''مخزن'' کے دورِ ثانی کے معاون مدیر سردار کسیرا سنگھ کے ایما پر ۱۹۱۲ع میں انھوں نے اقبال سے اپنے کلام پر اصلاح لینے کے لیے خط و کتابت شروع کی - اقبال نے حسبِ عادت اصلاح دینے سے تو انکار کیا لیکن شاکر صاحب کے استقلال کے باعث کبھی کبھی مفید مشورہ ضرور دیا - ذیل کے خطوط سے شاکر صاحب کے بارے میں اقبال کی رائے بخوبی معلوم ہو سکے گی :

(۱)

''مکرمی !

اردو زبان میں آپ سے زیادہ نہیں جانتا کہ آپ کے کلام

میں اصلاح دوں - باقی رہے شاعرانہ خیالات اور سوز و گداز ، تو یہ سیکھنے سکھلانے کی شے نہیں ، قدرتی بات ہے - ان سب باتوں کے علاوہ مجھ کو اپنے مشاغلِ ضروری سے فرصت کہاں کہ کوئی ذمہ داری کا کام اپنے سر لوں - میں نے آپ کے اشعار پڑھے ہیں - میری رائے میں آپ اس جھگڑے میں نہ پڑیں تو اچھا ہے -[1]

آپ کا خادم
محمد اقبال''

(۲)

''لاہور
۲۰۲ جون ۱۹۱۵ع
مخدومی !
آپ کا عنایت نامہ مل گیا ہے - آپ نے جس حسنِ ظن کا اظہار کیا ہے اس کے لیے میں آپ کا سپاس گزار ہوں - افسوس ہے کہ دیوان ابھی تک شائع نہیں ہو سکا - اس کی وجہ کچھ میری عدیم الفرصتی اور کچھ یہ کہ فارسی مثنوی موسوم بہ ''اسرارِ خودی'' مکمل ہو کر پریس کے لیے لکھی جا چکی ہے - چند دنوں میں شائع ہو جائے گی - اس کی اشاعت کے بعد دیوان کی طرف توجہ کروں گا - یہ

۱- لفافے پر ڈاک خانے کی مُہر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ۷ ستمبر ۱۹۱۲ع کا ہے -

مثنوی ایک نہایت مشکل کام تھا ۔ الحمد للہ کہ باوجود مشاغلِ دیگر کے میں اس کام کو انجام تک پہنچا سکا ۔ ماسٹر نذر محمد[1] صاحب کی خدمت میں آداب عرض کر دیں ۔

والسلام

آپ کا خادم

محمد اقبال ، لاہور''

(۳)

''مکرم بندہ !

مثنوی کا دیباچہ کسی قدر پیامات کے سمجھنے میں ممد ہوگا ۔ وہاں لفظ ''خودی'' کی بھی تشریح ہے ۔ آپ کی نظم اچھی ہے مگر اس میں بہت سے نقائص ہیں ۔ میں نے ان پر نشان کر دیے ہیں ۔ اصلاح کی فرصت نہیں رکھتا ۔ ماسٹر نذر محمد صاحب کو دکھائیے ، وہ درست کر دیں گے ۔ الفاظ حشو سے پرہیز کرنا چاہیے ۔ آپ کی نظم میں بہت سے الفاظ حشو ہیں ۔ محاورے کی درستی کا بھی خیال ضروری ہے ۔ ''سودا'' سر میں ہوتا ہے ، نہ کہ دل میں ۔ علٰی ھذاالقیاس عہد کو یا وعدے کو بالائے طاق رکھتے ہیں ، نہ بالائے بام وغیرہ ۔ اسی طرح مرکب کی

۱۔ ماسٹر نذر محمد صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس ، جو ملازمت سے سبکدوش ہو کر گوجرانوالہ میں قیام پذیر تھے ۔ شاکو صاحب ان دنوں گوجرانوالہ کی میونسپل کمیٹی میں اوورسیر تھے ۔

عنان ہوتی ہے ، نہ زمام ۔ بہت سے الفاظ مثلاً ''چونکہ''، ''تعاقب'' وغیرہ اشعار کے لیے موزوں نہیں ہیں ۔ ان سے احتراز اولٰی ہے ۔

''ہے خوشی تجھ کو کہاں . . . الخ'' کے دوسرے مصرعے میں ''ہر'' کی ''ہ'' تقطیع میں گرتی ہے ۔ سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ یہ نظم طویل ہے ۔

محمد اقبال ، لاہور
۶ جولائی ۱۵ع''

(۴)

''لاہور
۱۴ - اگست ۱۵ع
مخدومی ! السلام علیکم

آپ کے اشعار پڑھ کر میری آنکھوں سے آنسو نکل گئے ۔ یہ آنسو خوشی کے نہ تھے بلکہ تاسف کے تھے ۔ اللہ تعالٰی آپ کے ظن کو ، جو میری نسبت ہے ، صحیح ثابت کرے اور مجھ کو ان باتوں کی توفیق عنایت کرے جن کا آپ ذکر کرتے ہیں ۔ اور اس حسن ِ ظن کے عوض میں ، جو آپ ایک مسلمان کی نسبت رکھتے ہیں ، اللہ تعالٰی آپ کو بھی اجر ِ جزیل عطا کرے اور حبیب ِ کریم ؐ کے عشق و محبت کی نعمت سے مالامال کرے ۔ آمین

''یعنی مدہوشوں کو تو آمادۂ پیکار کر''

اس مصرعے میں 'پیکار' کا لفظ ٹھیک نہیں ہے - یوں کہہ سکتے ہیں :

یعنی اپنی محفلِ بے ہوش (یا مدہوش) کو ہشیار کر

اَور بھی خامیاں اس نظم میں ہیں ، جو یقیناً دو چار بار پڑھنے سے معلوم ہو جائیں گی - مگر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس نظم کو شائع نہ کریں - میرے لیے پرائیویٹ شرمندگی کافی ہے - اس کے علاوہ یہ آپ کے پرائیویٹ تاثرات ہیں ، پبلک کا آگاہ ہونا کچھ ضروری نہیں ہے -

گزشتہ خط میں جو آپ نے نظم لکھی تھی ، اس میں ایک لفظ ''زمام'' تھا ، جس پر میں نے اعتراض کیا تھا - غالباً میں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ 'زمام' کا لفظ ناقہ یا شتر کے لیے خاص ہے ، 'مرکب' کے لیے 'عنان' چاہیے - اس کے بعد میرے دل میں خود بخود شبہ سا پیدا ہو گیا - میں نے فارسی کی لغات میں جستجو کی - معلوم ہوا کہ 'زمام' کا لفظ مرکب کے لیے بھی آ سکتا ہے ، گو ناقہ کے لیے یہ لفظ خصوصیت سے مستعمل ہوتا ہے - صاحب 'بہار عجم' نے کوئی سند ایسے استعمال کی نہیں لکھی مگر چونکہ انھوں نے فارسی الفاظ و محاورات کی تحقیق و تدقیق میں بڑی محنت و جانفشانی کی ہے اس واسطے ان کے بیانِ بلا سند کو بھی قابلِ اعتبار سمجھنا چاہیے - یہ اس واسطے لکھتا ہوں کہ آپ اس غلطی میں مبتلا

نہ رہیں جو میری لاعلمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ۔ والسلام ۔
آپ کا خادم
محمد اقبال"

(۵)

"مکرمی !
الفاظ کے اعتبار سے اس نظم میں کوئی غلطی نہیں ہے ۔ معانی کے اعتبار سے البتہ بعض شعر قابلِ اعتراض ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو فارسی ترکیبیں آپ استعمال کرتے ہیں ، ان کا مطلب اچھی طرح سے نہیں سمجھتے ۔ والسلام

آپ کو بھی عید مبارک ہو ۔[1]

محمد اقبال"

(۶)

"یہ نظم ویسی ہے جیسی پہلے تھی ۔
مضمون یعنی موضوع انتخاب کرنے میں بڑی احتیاط لازم ہے ۔ بعض اشعار ایسے ہیں کہ ان کے پڑھنے سے ہنسی آتی ہے اور مصنف کی نسبت اچھا خیال دل میں نہیں بیٹھتا ۔ والسلام

۱۔ شاکر صدیقی نے اپنی ایک نظم "ہلالِ عید" بغرضِ اصلاح بھیجی تھی ۔ خط میں تو کوئی تاریخ درج نہیں ، لیکن لفافے پر ڈاک خانے کی مُہر ۱۳۔ اگست کی ہے ۔ شاکر صاحب کا خط یکم شوال ۱۳۳۳ھ کا ہے ۔

مجھے فرصت کم ہوتی ہے ، اس واسطے پے در پے خطوط کا
جواب دینے سے قاصر ہوں ۔[1]

محمد اقبال"۔

(۷)

"میں نے آپ کے شعروں کی خامیوں پر نشان لگا دیے ہیں ۔ ان پر مفصّل لکھنے کی فرصت نہیں ۔ تراکیب و الفاظ کی ساخت و انتخاب محض ذوق پر منحصر ہے اور ایک حد تک زبانِ فارسی کے علم پر ۔ آپ فارسی زبان کی کتابیں خصوصاً اشعار پڑھا کریں ۔ مثلاً دیوانِ بیدل ، نظیری نیشا پوری صائب ، جلال اسیر ، عرفی ، غزالی مشہدی ، طالب آملی وغیرہ ۔ ان کی مزاولت سے مذاقِ صحیح خود بخود پیدا ہوگا اور زبان کے محاورات سے بھی واقفیت پیدا ہوگی ۔ عروض کی طرف خیال لازم ہے ۔ اس نظم کا پہلا مصرع ہی بہ اعتبارِ عروض غلط ہے ۔ زنجیر ، فقیر ، وزیر ۔ عسکری ، روکشی ، تفسیر ، خوانِ مسلم کا خوشہ چین وغیرہ (دو لفظ پڑھے نہیں گئے) پست اور خلافِ محاورہ ہیں ۔ خوان کا خوشہ چیں نہیں کہتے ، خرمن کا خوشہ چیں ہوتا ہے ۔ خوان کا زلہ ربا کہتے ہیں ۔ "ہے" کی "ی" کو طول

۱۔ یہ خط اقبال نے شاکر صدیقی کے خط کی پشت پر لکھا تھا ۔ لفافے پر ۲۲ اگست (۱۹۱۵ع) انارکلی کے ڈاک خانے کی مُہر ہے ۔

دینا برا معلوم ہوتا ہے موسیقیت (؟) کے اعتبار سے۔
علٰی ہذاالقیاس۔
''آہ'' میں ''ہ'' کی آواز کو چھوٹا کرنا یوں بھی برا ہے۔
ایک ہی مصرعِ اردو میں چار اضافتیں بری معلوم ہوتی ہیں۔
اس سے فارسی والے بھی محترز ہیں۔[1]

محمد اقبال''

(۸)

''مکرم بندہ!
اضافت کی حالت میں اعلانِ نون غلط ہے۔ کبھی نہ کرنا چاہیے۔ طول ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ میں نے پہلے بھی آپ کو لکھا تھا۔
اتنے شعروں میں صرف دو شعر، جن پر نشان کر دیا ہے، اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ تلمّذ سے مجھے معاف فرمائیے۔
محمد اقبال، لاہور''

شاکر صدیقی صاحب نے ایک غزل بغرضِ اصلاح بھیجی تھی۔ اس کے جواب میں یہ خط لکھا گیا۔ لفافے پر مُہر انارکلی پوسٹ آفس کی ۲۴ مارچ ۱۹۱۶ع کی ہے۔ جن دو اشعار کے متعلق اقبال نے پسندیدگی کا اظہار کیا وہ یہ ہیں:

۱- شاکر صاحب نے اپنے ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۵ع کے خط کے ساتھ ایک نظم ''ہرن مینارہ'' بغرضِ اصلاح بھیجی تھی۔ یہ خط اسی کے جواب میں ہے۔

کسی کامل سے رسم و راہ میری جان پیدا کر
علاجِ خاطرِ ناکام کا سامان پیدا کر
رقابت اے دلِ مضطر نہیں اچھی زلیخا سے
ہزاروں جس میں ہوں یوسف تو وہ کنعان پیدا کر

تلمّذ سے معاف فرمانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شاکر صاحب نے اس غزل کے مقطع میں لکھا تھا :

رموزِ شعر کی خاطر 'قمِ اقبال سے جلدی
تنِ بےجانِ نظمِ خود میں شاکر جان پیدا کر

(۹)

''مکرم بندہ ! السلام علیکم

آپ کے حسنِ ظن کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔ افسوس ہے آپ کا ترجمہ میری ناقص رائے میں اشاعت کے قابل نہیں ۔ آپ کو اس کی اشاعت سے روکنا نہیں چاہتا ۔ اگر آپ چاہیں تو مجھے اس کی اشاعت میں کوئی اعتراض نہیں ۔[1]
والسلام ۔

مخلص
محمد اقبال
۲۴ جون ۱۹۲۴ع''

۱۔ شاکر صاحب نے اقبال کی فارسی نظم ''تنہائی'' کا اُردو ترجمہ کیا تھا ، جسے شائع کرنے کی اِجازت طلب کی تھی ۔

(۱۰)

"جنابِ من !

میری رائے میں یہ استعارہ درست نہیں ۔[1]

محمد اقبال

۲۹ اکتوبر ۹۲ء"

(۱۱)

"لاہور

۲ جون ۳۱ء

جنابِ من !

السلام علیکم ۔ "انجم" واحد دیکھنے میں نہیں آیا ۔ اصلاح سے معاف فرمائیے کہ نہ فرصت ہے ، نہ اہلیت[2] ۔ والسلام

محمد اقبال"

☆ ☆ ☆

۱۔ اس خط میں دریافت کیا گیا تھا کہ "اشکِ ندامت" کو "کوہِ نور" سے تشبیہ دینا درست ہے یا نہیں ؟ اقبال نے اسی خط کی پشت پر یہ فقرہ لکھ کر واپس بھیج دیا ۔

۲۔ شاکر صدیقی کے نام اقبال کے تمام خط "انوارِ اقبال" مرتبہ بشیر احمد ڈار سے لیے گئے ہیں ۔ دیکھیے صفحات ۱۰۹ - ۱۱۷ ۔

۵۰

جوش ملیح آبادی

(بقیدِ حیات)

جناب شبیر حسن خاں صاحب جوش ملیح آبادی ہمارے دور کے ممتاز شاعر ہیں - وہ بشیر احمد خاں کے بیٹے اور مشہور شاعر فقیر محمد خاں گویا کے پربوتے ہیں ، جنھوں نے سب سے پہلے ''انوار سہیلی'' کا اردو میں ترجمہ کیا - جوش صاحب ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ع میں پیدا ہوئے - فنِ شعر میں عزیز لکھنوی سے اصلاح لی - انھوں نے ۱۹۲۴ع سے ۱۹۳۴ع تک دس سال حیدر آباد کے دارالترجمہ میں ناظرِ ادبی کی حیثیت سے کام کیا - تقسیمِ ہند سے پہلے دہلی سے رسالہ ''کلیم'' جاری کیا - اس کے بعد رسالہ ''آج کل'' کے مدیرِ اعلیٰ مقرر ہوئے - مگر بھارت میں اپنے بچوں کا مستقبل تاریک دیکھ کر ۱۹۵۵ع میں کراچی چلے آئے اور پاکستانی شہریت اختیار کر لی - کچھ عرصہ کراچی کے ترقی اردو بورڈ سے بھی منسلک رہے -

کبھی ''شاعرِ انقلاب'' کہلاتے تھے ، اب اپنے آپ کو ''مرحوم'' کہتے ہیں - 'روحِ ادب' ، 'اوراقِ سحر' ، 'مقالاتِ زریں' ،

'جذباتِ فطرت' اور 'آوازۂ حق' ان کی ابتدائی کتابیں ہیں۔ بعد کی تخلیقات یہ ہیں:

جنون و حکمت، سنبل و سلاسل، عرش و فرش، فکر و نشاط، حسین[4] اور انقلاب، شاعر کی راتیں، آیات و نغمات، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، حرف و حکایت، حرفِ آخر، سیف و سبو، پیغمبرِ اسلام، اشارات، الہام و افکار اور نجوم و جواہر وغیرہ۔ ''یادوں کی برات'' ان کی آپ بیتی ہے جو نثر میں ہے۔

۱۹۲۴ع کے آغاز میں انھیں حیدر آباد دکن میں جا کر قسمت آزمانے کا خیال پیدا ہوا۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ انھوں نے نعت کہی اور سو گئے:

رعشۂ خوف بن گیا رقصِ بتانِ آذری
اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزمِ کافری

خواب میں بشارت ہوئی کہ حیدر آباد جاؤ، وہاں تمھاری پذیرائی ہوگی۔ چنانچہ عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر وحید الدین سلیم پانی پتی سے خط وکتابت کر کے اور مہاراجہ کشن پرشاد مدارالمہام کے نام حضرت اکبر الہ بادی، علامہ اقبال، سیّد سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی سے سفارشی خطوط حاصل کر کے وہاں پہنچے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔[1] ۱۴ جنوری ۱۹۲۴ع کو اقبال نے ان کا تعارف کراتے ہوئے مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھا:

''یہ خط شبیر حسن صاحب جوش ملیح آبادی لکھنوی کی

۱- یادوں کی برات، ص ۲۰۸-

معترف کے لیے لکھتا ہوں ۔ یہ نوجوان نہایت قابل اور ہونہار شاعر ہیں ۔ میں نے ان کی تصانیف کو ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا ہے ۔ اس خدا داد قابلیت کے علاوہ لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے ہیں جو اثر و رسوخ کے ساتھ لٹریری شہرت بھی رکھتا ہے ۔ مجھے امید ہے سرکار ان کے حال پر نظرِ عنایت فرمائیں گے اور اگر ان کو کسی امر میں سرکارِ عالی کے مشورے کی ضرورت ہوئی تو اس سے دریغ نہ فرمائیں گے ۔ سرکارِ والا کی شرفا پروری کے اعتماد پر اس درخواست کی جرأت کی گئی ہے ۔"

☆ ☆ ☆

۵۱

پروفیسر محمد اکبر منیر

(بقیدِ حیات)

پروفیسر محمد اکبر منیر بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل تھے - اور فارسی جیسی شیریں زبان کی تحصیل کا شوقِ فراواں رکھتے تھے - دیوانِ حافظ کے مطالعے کے بعد تو ان کے دل میں یہ آرزو چٹکیاں لینے لگی کہ موقع ملے تو وہ کبھی شیراز جائیں ، اس کی لطیف ہوا میں سانس لیں ، اس کے شیریں چشموں کا پانی پئیں اور بلبلِ شیرازؔ کے پاکیزہ سبک میں سخن سرائی کریں - چنانچہ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ پنجاب یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۱۹ع میں انھیں بحرین میں ملازمت مل گئی اور وہ ایک سال اس چھوٹے سے جزیرے میں گزار کر عازمِ ایران ہوئے - پھر دو سال شیراز میں مقیم رہ کر ایک سال اصفہان اور طہران میں پھرتے پھراتے اور وہاں کے اہلِ زبان سے ملتے ملاتے رہے - ۱۹۲۳ع میں وہ بغداد پہنچے اور ایک سال وہاں رہ کر ۱۹۲۴ع میں وطن واپس آئے -

یہ سفر ان کے لیے وسیلۂ ظفر ثابت ہوا - اس سے ایک تو ان

کی یہ آرزو بر آئی کہ فارسی ان کے لیے اجنبی زبان نہ رہی ۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ جو اشعار فارسی زبان میں انھوں نے وقتاً فوقتاً کہے ، وہ وہاں کے مجلّوں اور روزناموں میں شائع ہوگئے اور اس خطّے کے دانش پژوہوں نے ان کی تعریف کی ، خصوصاً ملک الشعراء بہار اور رشید یاسمی نے بہت پسند فرمائے اور حوصلہ افزائی کی ۔ ان کے کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ ''ماہ ِنو'' کے نام سے ۱۹۲۸ء میں مطبع معارف اعظم گڑھ نے اپنی روایتی شان کے ساتھ شائع کیا ۔

علامہ اقبال نے اکبر منیر کی طالب علمی کے زمانے سے لے کر ان کے معلّم بن جانے کے بعد تک ہر ہر قدم پر رہنمائی کی ۔ ایران اور بغداد کے قیام کے دنوں میں بھی ان کو خط لکھتے اور مفید مشورے دیتے رہے ۔ ان میں سے کچھ خط تو سفر میں اِدھر اُدھر ضائع ہوگئے اور جو بچ رہے وہ ''اقبال نامہ'' مرتّبہ شیخ عطاء اللہ میں محفوظ ہیں ۔ نو خطوں میں سے پہلا ۱۲ جنوری ۱۹۱۸ء کا ہے اور آخری مارچ ۱۹۳۳ء کا ۔ مراسلت کی ابتدا کے وقت مکتوب الیہ اسلامیہ کالج لاہور میں بی ۔ اے کے متعلّم تھے مگر اقبال نے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات دیکھ کر اسی وقت اندازہ کر لیا تھا کہ ان میں ترقی پسندی کے جوہر موجود ہیں جو محنت سے جِلا پا سکتے ہیں ۔ پہلا خط انگریزی میں تھا جس کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے :

(۱)

''لاہور

۱۲ جنوری ۱۹۱۸ء

ڈیر مسٹر محمد اکبر!

عنایت نامے کا شکریہ! آپ کی نظم، جو ملفوف تھی، میں نے نہایت دلچسپی سے پڑھی - آپ نے اپنے عنایت نامے اور نظم میں جس قدر میری تعریف و توصیف فرمائی ہے، اس کے لیے میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ اس تحسین و ستائش کا سزاوار نہیں - آپ کی نظم سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آپ نے مشق جاری رکھی اور غور و فکر کی عادت ڈالی تو ایک روز آپ کو اس میدان میں بہت بڑی کامیابی نصیب ہوگی - شعر کا منبع و ماخذ شاعر کا دماغ نہیں، اس کی روح ہے، اگرچہ تخیّل کی بے پایاں وسعتوں سے شاعر کو محفوظ رکھنے کے لیے دماغ کی اشد ضرورت ہوتی ہے -[1]

مخلص

محمد اقبال''

دوسرا خط بحرین کے پتے پر لکھا گیا، جہاں اکبر منیر ۱۹۲۰ء میں ملازمت اختیار کر چکے تھے:

۱- اقبال نامہ، مرتّبہ شیخ عطاء اللہ، جلد دوم، صفحات ۱۵۴-۱۵۵ -

(۲)

"لاہور

۲۱ اپریل ۱۹۲۰ء

مکرم بندہ ! السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے ، جسے پڑھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ۔ یہ ایک نادر موقع مل گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ اس سے بڑا فائدہ اٹھائیں گے ۔ واپسیِ ہندوستان پر بھی یہ تجربہ آپ کے لیے ازبس مفید ہوگا ۔ عربی زبان سیکھنے کے لیے میری رائے ناقص میں مصر بیروت سے بہتر ہے ۔ فلسفے کی مندرجہ ذیل کتب فی الحال پڑھیے ، پھر اور لکھ دوں گا ۔

(اس کے بعد چار انگریزی کتابوں کے نام درج ہیں[1])

یہ سب کتابیں غالباً لاہور سے مل جائیں گی ۔ راما کرشنا کو لکھنا چاہیے ۔ نہ ملیں تو وہ انگستان سے منگوا دے گا ۔

فوٹو کی نسبت یہ عرض ہے کہ اس وقت میرا کوئی فوٹو میرے پاس موجود نہیں ، ہاں بنواؤں گا تو آپ کی خدمت میں ایک کاپی ضرور مرسل ہوگی ۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے ۔ شیرازی صاحب سے بھی میرا سلام

۱۔ 'اقبال نامہ' کے مرتّب نے کتابوں کے نام حذف کر کے کوئی علمی خدمت انجام نہیں دی ۔

کہیے - امید کہ مقتضیاتِ زمانہ سے ادھر کے لوگ باخبر ہوتے جائیں گے ، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ بہتر ایّام لائے -۱

مخلص

محمد اقبال لاہور''

تیسرا خط بھی بحرین کے پتے پر ہی لکھا گیا - اس میں بعض کتابوں کے متعلق دلچسپ معلومات دی گئی ہیں اور ''اسرارِ خودی'' کے انگریزی ترجمے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے افغانستان کی طرف ہجرت کر جانے کا ذکر بھی ہے :

(۳)

''لاہور

۴ اگست ۲۰ع

مکرم بندہ ! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے - مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ ایران جانے والے ہیں - شیراز فارسیوں کے کلچر کا مرکز ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہاں کا قیام آپ کے لیے بہت مفید ہوگا - حال کی ایرانی شاعری میں کچھ نہیں - البتہ اس قوم کی بیداری کے شواہد کے طور پر اسے ضرور پڑھنا چاہیے - علاوہ اس کے زبان کی تحصیل کے لیے بھی مفید ہے - ایرانی شاعری کا تو قاآنی پر خاتمہ

۱- اقبال نامہ ، جلد دوم ، صفحات ۱۵۵-۱۵۶ -

ہو گیا ۔ خالص فلسفے میں اگر کتابیں آپ کو مل جائیں تو انھیں جمع کرتے جائیے ، قلمی ہوں یا مطبوعہ ۔ تصوّف کی کتب کا جمع کرنا بھی مفید ہوگا ۔ حال کے ایرانی حکما میں ہادی سبزواری مشہور ہیں ۔ ان کی کتاب ''اسرار الحکم'' میری نظر سے گزری ہے ۔ محض افلاطونیت کا چربہ ہے اور بس ۔ حال کے دیگر حکما میں سے کسی کی تصنیفات آپ کے ہاتھ آ جائیں تو غنیمت ہے ۔ فلسفے اور تصوّف کی کتابوں پر اگر خرچ ہو تو پروا نہ کیجیے ۔ اس میں مجھے بھی شریک سمجھیے ۔ البتہ کتاب خریدنے میں احتیاط لازم ہے کیونکہ نوے فی صد کتابوں میں کچھ بھی نہیں ہوتا ۔ لوگ نام کی وجہ سے خرید لیتے ہیں ۔

ایک کتاب غالباً ''لطائفِ غیبی'' نام ایران میں شائع ہوئی تھی ۔ پروفیسر براؤن نے لٹریری ہسٹری میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ یہ کتاب ان اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی ہے جو شیعہ حضرات نے وقتاً فوقتاً خواجہ حافظؒ پر کیے ہیں ۔ اگر کہیں سے دستیاب ہو جائے تو میرے لیے خرید کر بھیج دیجیے ۔

یونانیوں کے فلسفے پر حال ہی میں ایک نہایت عمدہ چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی ہے :

A Critical History of Greek Philosophy, by W. T. Stace

اسے ضرور پڑھیے ۔ میکملن سے ملے گی ۔ اس سے زیادہ صاف

اور واضح کتاب آج تک میری نظر سے نہیں گزری ۔ بعد کا
یورپین فلسفہ سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی ۔
"اسرارِ خودی" کا انگریزی ترجمہ ہو گیا ہے ۔ اس وقت
پریس میں ہے ۔ غالباً سردیوں میں شائع ہوگا ۔ پروفیسر
نکلسن کا خط آیا تھا ۔ انھوں نے وہاں کی لٹریری سوسائٹیوں
میں اس کتاب کے مضمون پر متعدد لکچر دیے ہیں جن کی
وجہ سے اس نئے فلسفے کا وہاں بڑا چرچا ہے ۔
اب میں گوئٹے کے دیوان کے جواب میں ایک دیوان
فارسی میں لکھ رہا ہوں ، جس کا ایک تہائی حصہ لکھ چکا
ہوں ۔ "اسرارِ خودی" کا ترجمہ یورپ کی اَور زبانوں میں
بھی ہو جائے تو تعجب نہیں ۔ میں نے سنا ہے فرانس میں
بھی اس کا چرچا ہے ۔ یہ غالباً پروفیسر نکلسن کے لکچروں
کی وجہ سے ہوا ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ دیوان کا ترجمہ
بھی ضرور ہوگا ۔ کیونکہ یورپ کی دماغی زندگی کے ہر
پہلو پر اس میں نظر ڈالی گئی ہے اور مغرب کے سرد خیالات
و افکار میں کسی قدر حرارت ڈالنے کی کوشش کی
گئی ہے ۔
زیادہ کیا عرض کروں ۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔
ہندوستان اور بالخصوص پنجاب کے بے شمار لوگ (مسلمان)
افغانستان کی طرف ہجرت کر رہے ہیں ۔ اس وقت تک پندرہ
بیس ہزار (اور ممکن ہے کہ زیادہ) جا چکا ہوگا ۔

محمد اقبال"

ذیل کے خط میں اقبال نے اکبر منیر کی شاعری کے مستقبل کے بارے میں خوش‌گوار توقعات کا اظہار کیا ہے۔ ایران کے مجلہ ''عصرِ آزادی'' میں اکبر منیر کی دو نظمیں شائع ہوئی تھیں جن کو دیکھ کر اقبال نے یہ رائے قائم کی۔ اس کے ساتھ ہی ایران سے فارسی نظم و نثر کی چند کتابیں تلاش کر کے بھیجنے کی فرمائش کی جو یہاں کے انٹرنس کے طلبا کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔

(۴)

''لاہور

۳۰ جنوری ۲۲ء

مخدومی! السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ اس سے پہلے بھی آپ کا ایک نہایت دلچسپ خط ملا تھا مگر میری صحت کچھ عرصے سے خراب ہے۔ جواب لکھنے سے قاصر رہا۔ ''عصرِ آزادی'' میں آپ کی دونوں نظمیں دلآویز ہیں۔ انشاءاللہ آپ کی زبان شستہ ہو جائے گی اور ایران کا قیام آپ کی شاعری کے لیے بہت مفید ہوگا۔ ملّا صدرالدین شیرازی کی تفسیر قرآن کے لیے ممنون ہوں۔ یہ چیز عجیب و غریب ہوگی۔ امید کہ چند روز تک یہاں پہنچ جائے گی۔ میں حال میں ان کی کتاب ''ملّا صدرا'' کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اگر وقت نے مساعدت کی تو ان کے خیالات پر کچھ لکھوں گا۔

عرصے سے میرا ارادہ ایک انٹرنس کورس فارسی ترتیب دینے کا ہے ۔ جدید فارسی نظم و نثر کے کچھ عمدہ اور آسان نمونے مل جائیں تو یہاں کے طلبا کے لیے نہایت مفید ہوگا ۔ اگر آپ کو چند ایسی کتبِ نظم و نثر مل جائیں تو میرے لیے خرید لیجیے۔ نظمیں مشہور اساتذۂ حال کی ہوں اور سلیس اور آسان طرزِ جدید میں لکھی گئی ہوں تو زیادہ مناسب ہے ۔ پولیٹیکل نظموں کی ضرورت نہیں ۔ ایک کتاب ''سفینۂ طالبی'' سنا ہے بہت اچھی ہے مگر ہندوستان میں دستیاب نہیں ہوتی ۔ یہ کتاب یا کوئی اور کتاب اسی قسم کی مل جائے تو خوب ہے ۔ غرض کہ آپ یہاں کے انٹرنس کے طلبا کی ضروریات کو بخوبی سمجھتے ہیں ۔ میرا مقصود یہ ہے کہ فارسی کے ذریعے سے بھی جدید خیالات اور احساسات طلبائے ہند تک پہنچیں ۔ انگریزی کورسوں میں مضامین کا تنوع نہایت دلچسپ ہوتا ہے ۔ انتخاب میں وہ بھی زیرِ نظر رہے ۔[1]

۱۔ یہ انتخاب اقبال نے ''آئینۂ عجم'' کے نام سے میٹریکولیشن (فارسی) کے طلبا کے لیے مرتب کیا اور میسرز عطرچند کپور اینڈ سنز انارکلی لاہور نے ۱۹۲۷ع میں شائع کیا ۔ حصۂ نثر تمام تر جدید فارسی پر مبنی ہے اور حصۂ نظم میں سعدی ، نظامی ، انوری ، عبید زاکانی ، ناصرخسرو ، ابن یمین وغیرہ کے کلام سے انتخاب کیا گیا ہے ۔ خود اقبال کی تین نظمیں ''فصلِ بہار'' ، ''نغمۂ ساربان'' اور ''کرمکِ شب تاب'' اس میں شامل ہیں ۔ (انوارِ اقبال ، ص ۲۵)

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے - یہاں کے حالات بدستور ہیں - عدمِ تعاون روز افزوں ہے اور گورنمنٹ تشدّد پر آمادہ ہے - زمانۂ حال کی طبیعت میں ہیجان و اضطراب ہے - معلوم نہیں باطنِ فطرت میں کیا کیا اسرار ہیں جو ظہور پذیر ہوں گے -

فلسفے کی کتابوں کے نام دوسرے صفحے پر لکھتا ہوں - ''لاجک'' کی فی الحال آپ کو ضرورت نہیں ہے (اس کے بعد انگریزی میں فلسفے کی تین کتابوں کے نام دیے گئے تھے جو ''اقبال نامہ'' کے مرتّب نے حذف کر دیے ہیں) -

مخلص

محمد اقبال ، لاہور''

اکبر منیر کی ایک نظم ایران کے اخبار ''استخر'' میں شائع ہوئی تھی - اقبال نے ملاحظہ فرمانے کے بعد زبان کی صفائی کی تو تعریف کی لیکن خیالات کے لیے طبیعت پر زور دینے اور حکیم سنائی اور مولانا روم کو زیرِ نظر رکھنے کا مشورہ دیا :

(۵)

''ڈیر مسٹر منیر ! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا جس کے لیے سراپا سپاس ہوں -

اخبار ''استخر'' ، جس میں آپ کی نظم شائع ہوئی ، ملاحظے سے گزرا - آپ کی زبان صفائی میں بہت ترقی کر رہی ہے - اللّٰھمّ زِد فزد - خیالات کے لیے طبیعت پر زور دینا

چاہیے - مطالبِ جلیلہ کی مشرقی نظم کو بہت ضرورت ہے - حکیم سنائی اور مولانا روم کو زیرِ نظر رکھنا چاہیے - اس قسم کے لوگ اقوام و ملل کی زندگی کا اصل راز ہیں - اگر یہی لوگ غلط راستے پر پڑ جائیں تو اقوام کی ممات بھی انہی کے ہاتھوں سے ہوتی ہے - مولانا روم کے تو اسرار و حقائق زندۂ جاوید ہیں - حکیم سنائی سے طرزِ ادا سیکھنا چاہیے ، کیونکہ مطالبِ عالیہ کے ادا کرنے میں ان سے بڑھ کر کسی نے قدم نہیں رکھا -

ایرانی اخبارات میں اس قسم کی نظمیں شائع کیا کیجیے ؛ مغربی اور وسطی ایشیا کی مسلمان قومیں اگر متحد ہو گئیں تو بچ جائیں گی اور اگر ان کے اختلافات کا تصفیہ نہ ہو سکا تو اللہ حافظ ہے - مضامینِ اتحاد کی سخت ضرورت ہے - میرا مذہبی عقیدہ یہی ہے کہ اتحاد ہوگا اور دنیا پھر ایک دفعہ جلالِ اسلامی کا نظارہ دیکھے گی - ہندوستان میں بظاہر مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد امن و سکون ہے مگر قلوب کا ہیجان حیرت انگیز ہے - اتنے عرصے میں اتنا انقلاب تاریخِ امم میں بے نظیر ہے - ہم لوگ جو انقلاب سے خود متاثر ہونے والے ہیں ، اس کی عظمت اور اہمیت کو اس قدر محسوس نہیں کرتے - ایشیا کی مسلمان اقوام کی حرکت بھی کم حیرت انگیز نہیں - کیا عجب کہ اس نئی بیداری کو ایک نظر دیکھنے کے لیے میں بھی جولائی یا اگست کے مہینے میں ایران جا نکلوں - میرے ایک دوست سردار

جوگندر سنگھ ایڈیٹر ''ایسٹ اینڈ ویسٹ'' اصرار کر رہے ہیں کہ ان کے ساتھ کوئٹے کے راستے ایران چلوں ۔ اگر ممکن ہو سکا تو ضرور ان کا ساتھ دوں گا ۔ اس دفعہ مجھے دردِ نقرس (گوٹ) کی وجہ سے سخت تکلیف رہی ۔ کامل دو ماہ چارپائی سے اتر نہیں سکا ۔ چونکہ میری فطرت کو ایران سے ایک مناسبتِ خاص ہے ، ممکن ہے وہاں کی آب و ہوا کا اچھا اثر مجھ پر ہو ۔

''سفینۂ طالبی'' میں نے یہاں تلاش کی ۔ افسوس نہ مل سکی ۔ آپ کو نثر کی جو عمدہ کتب مل سکیں بھیج دیجیے ۔ نظم نہ ملے تو نہ سہی ۔ نثر کی زیادہ ضرورت ہے ۔ اگر حکایات کی کوئی عمدہ کتاب ہو تو وہ بھی ارسال کیجیے ۔ یعنی ایسی کتاب جس میں چھوٹی چھوٹی حکایات لطیف اور معنی خیز ہوں ۔

مُلاّ صدرا کی تفسیر بھی پہنچ گئی ۔ بعض مقامات تو خوب ہیں مگر بحیثیتِ مجموعی اس کا پایہ تفاسیر میں بہت کم ہے ۔

اُردو نظم ''خضرِ راہ'' جو میں نے حال ہی میں لکھی ہے ، ارسالِ خدمت کروں گا ۔ گوئٹے کے دیوان کے جواب میں ''پیامِ مشرق'' میں نے لکھی ہے جو قریب الاختتام ہے ۔ امید ہے اس سال کے اختتام سے پہلے شائع ہو جائے گا ۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے ۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا ۔ فارسی کتب جہاں تک ممکن ہو جلد

ارسال کیجیے۔

مخلص

محمد اقبال"

یہ مکتوب بغداد کے پتے پر لکھا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر منیر نے اپنی چند نظمیں ملاحظے کے لیے ارسال کی تھیں جو اقبال کی رائے میں دلچسپ تھیں۔ بالخصوص "مسلمانے نمی بینم" پڑھ کر تو اقبال اتنے متاثر ہوئے کہ رو پڑے۔ خط سے پہلے اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

جہانِ من پُر از سامان و سامانے نمی بینم
چہ درماں ھا ز بہرِ درد و درمانے نمی بینم
دلِ وحشی چو آھو دشت پیمائی ھوس دارد
و لیکن بہرِ جولانش بیابانے نمی بینم
مرا شوق غزلخوانی کشد در دامنِ صحرا
کہ در خوردِ نوائے خود گلستانے نمی بینم
سکوتِ مرگ بگرفتہ است آوازِ شتربانان
بسی گشتم بصحرا ، یک حُدی خوانے نمی بینم
خدا بینم بہ شہر و کوہ و دشت و باغ و بحر و بر
بہ لب برسید جانِ من کہ انسانے نمی بینم
ھمہ بے بال و پر گشتند چوں مورانِ دانہ چیں
چہ شد آخر کہ یک مرغِ سلیمانے نمی بینم
ھنوز از نعرۂ تکبیر اندام زمیں لرزد
و لیکن در ھمہ عالم مسلمانے نمی بینم

هنوز از قطرۂ خونِ شہیداں لالہ می‌روید
ولے در عاشقاں آں روحِ ایمانے نمی بینم
منیر از کہ بخواہم دادِ شعرِ خود؟ کہ در بغداد
سخن فہمے نمی دانم، سخن دانے نمی بینم[1]

(بغداد : دسمبر ۱۹۲۳ء)

(٦)

"لاہور

۲ فروری ۲۴ء

مخدومی ۔ السلام علیکم

خط آپ کا ابھی ملا ہے، جسے پڑھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ۔ آپ کو اسلامی ممالک کے سفر سے بہت فائدہ ہوا ہے اور ہوگا ۔ اشعار جو آپ نے بھیجے ہیں، نہایت دلچسپ ہیں اور بالخصوص "مسلمانے نمی بینم" نے تو مجھے رلا دیا ۔ اللّٰہم زد فزد ۔ میں نے ایک عرصہ ہوا آپ کو بغداد کے پتے پر خط لکھا تھا یا شیراز کے پتے پر ۔ امید نہیں کہ وہ خط آپ تک پہنچا ہو، کیونکہ اِس خط میں اُس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ۔ اس عرصے میں میں نے ایک کتاب "پیامِ مشرق" نام لکھ کر شائع کی ہے ۔ چونکہ آپ کا مستقل پتہ معلوم

۱- ماہِ نو (مجموعۂ کلام پروفیسر اکبر منیر، مطبوعہ مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۲۸ء)، صفحات ۱۰۵ - ۱۰۶ -

نہ تھا اور آپ نے خط اُس وقت لکھا جب آپ طہران سے رخصت ہونے والے تھے ، اس واسطے میں نے احتیاطاً اسے نہ بھیجا ، اس خیال سے کہ ضائع نہ ہو جائے ۔ اب اس کی پہلی ایڈیشن ختم ہو چکی ہے ۔ دوسری ایڈیشن ، جس میں بہت سا اضافہ ہے ، چند روز تک شائع ہو جائے گی ۔ جہاں آپ کا مستقل قیام کچھ عرصے کے لیے ہو ، مطلع فرمائیے تاکہ میں وہ کتاب آپ کی خدمت میں ارسال کر سکوں ۔ یہ کتاب گوئٹے کے مغربی دیوان کے جواب میں لکھی گئی ہے ۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے ۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔ دنیا کے دل میں انقلاب ہے ، اس واسطے قلوبِ انسانی اس سے متاثر ہو رہے ہیں ۔ اسلام کی عظمت کا زمانہ انشاءاللہ قریب آ رہا ہے ۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال ، لاہور

۲ فروری ۲۴ء"

یہ خط اور اس کے بعد کے دو خط ملتان کے پتے پر لکھے گئے ، جہاں اکبر منیر پروفیسری کے منصب پر فائز ہوگئے تھے اور انھوں نے اپنا مجموعۂ کلام ''ماہِ نو'' شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب نے تائید کی اور امید ظاہر کی کہ ''ماہِ نو'' جلد بدرِ کامل میں مبتدل ہو جائے گا :

(۷)

''لاہور

۱۷ مارچ ۲۵ء

ڈیر مسٹر اکبر منیر ! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے ۔ زندگی کا راز یہی ہے جہاں رہو ، جس حالت میں رہو ، خوش اور مطمئن رہو ۔ دنیا میں بہت کم آدمی ہیں جو اپنی زندگی کے مختلف احوال و مقاصد سے آگاہ ہوتے ہیں ۔ عام طور پر ہم سب لوگ اپنی زندگی کا محض ایک خارجی مشاہدہ کر سکتے ہیں ۔ اندرونی علل و اسباب و نتائج ہماری نظر سے مخفی رہتے ہیں ۔ ہاں ! لاہور میں بہار کا آغاز ہے مگر :

دلم بہ ہیچ تسلّی نمی شود حاذق !
بہار دیدم و گل دیدم و خزاں دیدم

''ماہِ نو'' ضرور مرتّب کیجیے ۔ اس سے بہت فائدہ ہوگا ۔ ''زبورِ عجم'' کے لیے ایک مدت درکار ہوگی ۔ بہت سے اور مشاغل ہیں جن کی طرف توجہ ضروری ہے ۔ اگر اسی کام میں سراپا محو ہو سکتا تو اب تک ختم ہوگیا ہوتا ۔ والسلام

محمد اقبال''

(۸)

(انگریزی)

''لاہور

۹ نومبر ۱۹۲۸ء

مائی ڈیر مسٹر منیر!

آپ نے اپنے بھائی کی وساطت سے نظموں کا جو مجموعہ ارسال فرمایا ہے، اس کے لیے شکریہ قبول فرمائیے۔ میں نے اس مجموعے کو نہایت دلچسپی سے پڑھا ہے۔ آپ کا قیامِ ایران یقیناً آپ کے لیے نہایت سود مند ثابت ہوا ہے۔ اس کی بدولت آپ کے کلام میں ایک سادگی، قوت اور جِلا آ گئی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ''ماہِ نو'' جلد بدرِ کامل میں مبتدل ہو جائے گا۔

آپ کا

محمد اقبال''

(۹)

''لاہور

مارچ ۳۳ء

ڈیر اکبر منیر!

آپ کا خط ابھی ملا جس کے لیے شکرگزار ہوں۔

میں ۱۱ مارچ کی شام کو یہاں سے دہلی جاؤں گا۔ غالباً

۱۴ مارچ کی صبح کو واپس آؤں گا۔ ۱۱ مارچ کے دن
کسی وقت آپ مجھ سے مل سکتے ہیں ۔
امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

محمد اقبال''

پروفیسر اکبر منیر میعادِ ملازمت ختم کرکے اپنے منصب سے مبکدوش ہو چکے ہیں اور آج کل ڈسکہ (ضلع سیالکوٹ) میں زندگی کے بقیہ ایّام گزار رہے ہیں ۔

☆ ☆ ☆

اشاریہ

از محمد عبداللہ قریشی

اشخاص

ب

پ

ت

ٹ

ث

ج

چ

ح

خ

د

ڈ

ذ

ر

ز

س

ش

ص

غ

ک

گ

ل

م

☆ ☆ ☆

مقامات

الف

ب

پ

گ

ل

☆ ☆ ☆

کتب و رسائل

آ

الف

ب

پ

ت

ج

چ

ح

خ

ض

ط

ع

غ

ف

ق

ک

ن

☆ ☆ ☆